جميع الحقوق محفوظة بحقّ المؤلّف

سیرتِ امیرِ معاویة رضی الله عنه اسم الكتاب :



تأليف : ..... فضيلة الشيخ رضاء الله الباجوري

الطبع .....  الاول سنه 1447ھ بمطابق 2025

تنضید: ابو منقاد رضاء الله بن الحاج خان بادشاه حفظه الله عنه

النّاشر : ..... مدرسة ترتيل القرآن شريف آباد باجوڑ پاكستان

مقدمہ

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا ، وَمِنْ سَیِّئٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ ، وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ہَادِیَ لَہٗ ۔ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ۔ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران:۱۰۲] ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا﴾ [النساء:۱] ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝ یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا﴾ [الاحزاب: ۷۰، ۷۱]

"تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، ہم اسی کی حمد کرتے ہیں، اسی سے مدد چاہتے ہیں، اسی سے بخشش کے طلب گار ہیں، اور اپنے نفسوں کے شر سے اور اپنے برے اعمال سے اسی کی پناہ میں آتے ہیں۔ وہ جسے راہِ حق سمجھا دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی راہ پر نہیں لا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔" "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔" "اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتوں سے بھی، بے شک اللہ ہمیشہ تم پر پورا نگہبان ہے۔" "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور بالکل سیدھی بات کہو۔ وہ تمھارے لیے تمھارے اعمال درست کر دے گا اور تمھارے لیے تمھارے گناہ بخش دے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے تو یقیناً اس نے کامیابی حاصل کر لی، بہت بڑی کامیابی۔"

میرے رب! آپ کی ہی ساری تعریف ہے جسے آپ کی ذات کے جلال اور عظیم بادشاہت کے شایانِ شان ہے، آپ کی ہی سب تعریف ہے حتی کہ آپ راضی ہو جائیں، جب آپ راضی ہوں تب بھی آپ ہی کی سب تعریف ہے، رضامندی کے بعد بھی آپ ہی سب تعریف ہے، وبعد!

یہ کتاب عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے مطالعہ کے بارے میں میری سابقہ کتب کے توسیعی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس سلسلے میں اس سے قبل سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہم پر کتب شائع ہو چکی ہیں۔ میں اپنی اس کتاب کا نام "سیّدنا معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما شخصیت اور کارنامے" رکھا ہے۔ اس کتاب میں درج ذیل مباحث ہیں:

☆ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام و نسب، کنیت، خاندان، والد ابو سفیان رضی اللہ عنہ کا قبلِ اسلام، ان کی والدہ بنت عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ، بھائی اور بہنیں، ازواجِ مطہرات، قبلِ اسلام اور ان کے بعض فضائل۔

سیرتِ امیر معاویۃ رضی اللہ عنہ

☆معاویہ رضی اللہ عنہ اور روایت حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وذم کے بارے میں باطل روایات۔

☆عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد خلافت راشدہ میں بنی اُمیہ کا کردار، معاویہ رضی اللہ عنہ کی قسمت کا ستارہ کب طلوع ہوا؟

☆امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں دمشق، بعلبک اور بلقان پر گورنری اور سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ سے تعلق۔ اس کتاب میں درج ذیل عنوانات کی بھی وضاحت کی گئی ہے:

☆شام کے محاذ پر آپ کی کاوشیں، عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں موسم گرما اور سرما کے لشکروں کا نظام رائج کرنا، بحری بیڑے کی ایجاد، عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں آپ کے کارنامے اور فتوحات، عثمان رضی اللہ عنہ سے بحری جنگ کی اجازت طلبی میں ان کا اصرار، اہل قبرص کا ہتھیار ڈال دینا اور صلح کا مطالبہ، پھر نقض صلح، فتح قبرص۔

☆آپ کے سیّدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے اختلاف کی حقیقت اور اس سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا موقف۔

☆اُن شبہات کی تردید جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پیدا کئے گئے ہیں مثلاً بیت المال سے اقربا پروری کی تہمت، مسلمانوں کے کوٹے سے اپنے رشتے داروں کا حکومتی عہدوں پر تقرر کرنا۔

☆حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فتنہ شہادت کے اسباب جیسے نرمی اور اس کے معاشرے پر اثرات، ان کے زمانے میں معاشرتی انحراف کی روش اور ایک نئی نسل کا ظہور، پھیلی ہوئی باتوں کو قبول کرنے کی معاشرتی استعداد، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ بننا، کبار صحابہ کا مدینہ سے خروج، جاہلی عصبیت، طبعی یا بشری رکاوٹوں کی وجہ سے فتوحات کا رُکنا، زہد وورع کا غلط مفہوم، لالچی نسل نو کا ظہور، کینہ رکھنے والے ایسے گروہ کا معرضِ وجود میں آنا جو اپنے مقتول کا بدلہ نہ لے سکا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پھندے پھیلانے کے لیے مضبوط منصوبہ بندی، لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے لیے اسباب وذرائع کا استعمال، فتنہ پھیلانے میں عبد اللہ بن سبا کا کردار، فتنے کے بارے میں حضرت معاویہ بن ابو سفیان کا موقف، گورنروں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مشورہ اور اس بارے میں سیّدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور اس بارے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدوں میں صحابہ کا موقف۔ ☆حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینے کے طریقے پر صحابہ کا اختلاف، معرکہ صفین، پے در پے واقعات۔

☆ام المؤمنین ام حبیبہ بنت ابو سفیان کا نعمان بن بشیر کو حضرت عثمان کی قمیص دے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے پاس بھیجنا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے کے محرکات، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ قبول نہ کرنا، اہل شام سے جنگ کرنے کے لیے امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی تیاری، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جنگ جمل کے بعد جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجنا تاکہ انہیں بیعت کرنے کی دعوت دی جائے، امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شام کی طرف پیش قدمی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا صفین کی طرف نکلنا، طرفین میں حملوں کا آغاز، فریقین میں صلح کی کوششیں، گھمسان کی جنگ اور پھر تحکیم کی دعوت۔

سیرتِ امیر معاویۃ رضی اللہ عنہ

☆ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت اور اس کے مسلمانوں پر اثرات، دورانِ جنگ میں مشفقانہ رویہ اور حسن سلوک، امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا قیدیوں سے سلوک، مقتولین کی تعداد، امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا مقتولوں کو تلاش کرنا اور ان پر ترس کھانا، ان واقعات و حادثات کے دوران میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا شاہِ روم کے بارے میں موقف، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں صفین کا جھوٹا واقعہ، معرکہ کے جاری رہنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کا اصرار، امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا لوگوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرنے اور اہل شام کو لعن طعن کرنے سے منع کرنا، تحکیم، تحکیم کے معاہدے کا متن، تحکیم کے بارے میں مشہور واقعے کا باطل ہونا، معاہدۂ تحکیم کی حقیقت، اجتماع کے انعقاد کی جگہ۔

☆ اسلامی ممالک میں پیدا ہونے والے تنازعات کے سلسلے میں واقعہ تحکیم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ان جنگوں کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے موقف کی بھی میں نے وضاحت کی ہے۔ معرکہ صفین کے بعد صلح جُو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معیارات میں تبدیلی، امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان صلح، امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع موصول ہونے کے بارے میں بھی میں نے بحث کی ہے۔ اس کے بعد میں نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے دور کے صلح کے بہت بڑے اصلاحی منصوبے کے بارے میں بات کی ہے، یہ منصوبہ وحدت اُمت کا سبب بنا، یہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا عمل ہے۔ میں نے صلح کے مراحل، شرائط، اسباب، اس کی رکاوٹوں اور نتائج کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اسی طرح میں نے مقاصد شریعت کی فقہ کبیر اور فقہ مصالح و مفاسد کی وضاحت کی ہے، اسی طرح اختلاف سے متعلق فقاہت کی وضاحت کی ہے، سیّدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ اس فقہ میں ممتاز تھے۔ انہوں نے اپنے عظیم اصلاحی منصوبے کی بنیاد رکھی تھی، اسی کی بنیاد پر اُمت مسلمہ ان جدید مراحل میں داخل ہوئی، جن میں موجود تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اور ابنائے اُمت کی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت مکمل ہوئی۔ م

یں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صفات کی وضاحت کی ہے، جن میں سے اہم یہ ہیں: علم، فقاہت، حلم و بردباری، عفو و درگزر، ہوشیاری، حیلہ و تدبیر، منفرد عقلیت، باریک بینی کی صلاحیت، عاجزی و انکساری، تقویٰ و پرہیزگاری اور خشیت الٰہی سے رونا۔ میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں علماء کے تعریفی کلمات بھی نقل کیے ہیں، اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سلطنت بنو اُمیہ خیر القرون میں داخل ہے، جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

((خَيْرُكُمْ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ۔)) (بخاری: ٢٦٩٥)

''تمہارے بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر جو اُن کے بعد کے زمانے کے ہیں اور پھر جو اُن کے بعد آئیں گے۔''

میں نے بنو اُمیہ کے دار الحکومت (شام) کے بارے میں بحث کی ہے اور اہل شام کے بارے میں احادیث رسول پیش کی ہیں، نیز عہد معاویہ رضی اللہ عنہ کے اہل حل و عقد اور شوریٰ کا تذکرہ کیا ہے، اس کے علاوہ اظہارِ رائے کی آزادی اور ان کی داخلی سیاست جیسے شیوخ صحابہ کی کبار شخصیات اور ان

کے بیٹوں سے حسن سلوک کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما، عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے اچھا تعلق بیان کیا ہے۔

اس بات کی بھی وضاحت سے تردید کی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سلطنت بنو اُمیہ کے منبروں پر امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کو عام کر دیا تھا، بعض مؤرخین کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے زہر دلوایا تھا، میں نے علمی دلائل اور روشن براہین سے اسے باطل ثابت کیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین کے بارے میں امیر المؤمنین بننے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف بھی پیش کیا ہے، نیز حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کا واقعہ اور اس بارے میں ام المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف بیان کیا ہے۔ میں نے ان اُمور کی وضاحت بھی کی ہے:

☆ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تمام اُمور کی خود نگرانی کرنے اور اپنی خلافت میں امن قائم کرنے کی حرص، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یومیہ مجلس اور اس کے ذیلی مرکزی محکمے، جیسے محکمہ خط و کتابت، محکمہ مہر، محکمہ ڈاک، سینگی لگانے کا نظام، چوکیداری اور پولیس کا محکمہ، آدمیوں اور معاونین کا عمدہ انتخاب، معاونین اور تالیف قلبی، اس میں پختگی کے لیے مال خرچ کرنا، سختی اور نرمی کی سیاست اختیار کرنا، بنی اُمیہ اور ان کی رعیت کے درمیان منفعت کے تبادلے کی سیاست، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنے آپ کو مضبوط کرنے اور اپنی خلافت کو استحکام دینے کے لیے اطلاعات کی سیاست اپنانا اور انہیں بنی اُمیہ کی طرف مائل کرنا، خبر رسانی کے نظام کا اہتمام کرنا، اسلامی لشکر کی تشکیل و ترقی، قبائل، برادریوں اور معاشرے کے بڑے افراد میں موازنہ کی سیاست کے بارے میں ان کی دانائی، اُموی خاندان کے بارے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست۔

☆ میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی معاشرتی زندگی نیز علم، تاریخ، شعر، لغت اور تجرباتی علوم کے بارے میں ان کے اہتمامات کو بیان کیا ہے۔

☆ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خوارج کے بارے میں معاملے اور ان کے عمل دخل کی کمی بیشی کے سلسلے میں آپ کے وسائل پر میں نے ایک الگ مبحث لکھی ہے۔

☆ مالی نظام، سلطنت کے ذرائع آمدن جیسے زکوٰۃ، جزیہ، خراج، عشر، زرعی پیداوار، غنائم عمومی اخراجات جیسے عسکری، انتظامی اور معاشرتی اخراجات۔

☆ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا زراعت، داخلی و خارجی تجارت اور حرف و صنعت کا اہتمام کرنا، عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں مصافِ اموال کے بارے میں شبہات کا معاملہ اور اکا علم و انصاف پر مبنی تجزیہ، مثلاً عطیات دینے میں فرق روا رکھنا، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بطورِ رشوت دینے کا جھوٹ، تالیف قلبی اور معاونین بنانے کے لیے بہت زیادہ خرچ کرنا، امویوں کی پر تعیش زندگی کے مظاہر۔

☆سلطنت بنی اُمیہ کے عدالتی نظام کی مستقل بحث، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خلافت راشدہ سے تعلق، خلفا کا عدالتی معاملات سے الگ ہونا اور ان پر اثر انداز نہ ہونا، قاضیوں کے مراتب، فیصلوں کو لکھنا اور ان پر گواہ مقرر کرنا، ججوں کے معاونین جیسے منادی، دربان، ترجمان یا مترجم، نگرانی اور پیروی کرنے والے وغیرہ۔

☆عہد اُموی میں عدالتی فیصلوں کے مصادر، قاضیوں کا تخصص، مشہور ترین قاضیوں کے نام، قضاء کے عمومی امتیازات، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو قضاء کے بارے میں خط، محکمہ پولیس اور اس کی ذمہ داریاں جیسے خلیفہ اور صوبہ جات کے گورنروں کی ان کے داخلی دشمنوں سے حفاظت کرنا، جرائم پیشہ افراد اور قانون شکنی کرنے والوں کو سزا دینا، شرعی سزاؤں کا نفاذ، دیگر طاقتیں اور دوسرے محکمے اور ان کا پولیس سے تعلق جیسے چوکیدار، چودھری، جلاد، نظام احتساب، نگہبانی کا نظام، مجرموں کو پکڑنے والا محکمہ، محکمہ ولاۃ و انتظامیہ، سلطنت کے تحت آنے والے اہم صوبے، ان کے مشہور گورنروں کے نام اور ان کے ان صوبوں میں اہم ترین کارنامے، مدینہ نبویہ کی بحث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حالتِ زندگی، ان کی وفات مدینے میں ۵۸ھ یا ۵۹ھ کو ہوئی تھی، عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں انھوں نے تقریباً اٹھارہ سال گزارے، اس جلیل القدر صحابی پر دشمنانِ صحابہ کی طرف سے زمانہ قدیم اور عصر حاضر میں ظالمانہ حملے کیے گئے، ان باطل تہمتوں کو مستشرقین کے ایک گروہ نے بھی اختیار کر لیا ہے، لہٰذا میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس عظیم صحابی کا دفاع کروں کیونکہ وہ سنت نبوی کے بڑے بڑے راویوں میں شمار ہوتے ہیں، ان کا تعارف اور کچھ حالتِ زندگی پیش کیے ہیں جیسے ان کی عبادات، پاکدامنی، صبر و تحمل اور ان کا عفو و درگزر۔ ان شبہات کی تردید بھی کر دی گئی ہے جو ان کے بارے میں جھوٹے پھیلائے گئے ہیں، جن کا مقصد ہم تک پہنچنے والی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شک و شبہ پیدا کرنا ہے، اس ہدف کو منافقین اس جلیل القدر صحابی پر طعنہ زنی کر کے پورا کرنا چاہتے ہیں، ان کذابوں کا مقابلہ کرنے کے لیے زبانِ حال سے شاعر کا یہ قول منطبق ہوتا ہے:

وإذا اضطررت على الجدال و لم تجد

لک مهربًا و تلاقت الصّفان

فاجعل كتاب اللّٰه درعًا سابغًا

والشرع سيفک وابد في الميدان

والسنة البيضاء دونک جُنَّة

واركب جواد العزم في الجولان

واثبت بصبرک تحت ألوية الهدى

فالصبر أوثق عدۃ الإنسان

واطعن برمح الحق کل معاند

للّٰہ درُّ الفارس الطعان

واحمل بسیف الصّدق حملۃ

مخلص مستجردًا للّٰہ غیر جبان

''جب تو جنگ کرنے کے لیے مجبور ہو جائے اور تجھے بھاگنے کے لیے کوئی چارہ نہ ہو اور دونوں گروہوں کا ٹکراؤ ہو تو کتاب اللہ کو اپنی پوری زرہ بنالے، شریعت کو اپنی تلوار بنا کر میدان میں نکل آ، چمکدار سنت کو اپنی ڈھال بنا، عزم وہمت کے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو جا، ہدایت کے جھنڈوں تلے اپنے صبر کے ساتھ جمے رہو، اس لیے صبر انسان کی مضبوط ترین تیاری ہے۔

ہر دشمن پر حق کے نیزے برسا، نیزہ باز گھڑ سوار کا اللہ کے ہاں بڑا مقام ہے، حملہ کرنے کے لیے سچائی کی تلوار اُٹھا، بزدلی کا مظاہرہ نہ کرنا، مخلص بن جا اور بس اللہ کا ہو کر رہ۔'' اس کے علاوہ میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کی تحریک فتوحات کی صوتِ حال بیان کی ہے، تحریک فتوحات کے تذکرے سے پہلے ان شبہات کا محاکمہ کیا ہے جو جھوٹ اور بہتان کی بنا پر اس تحریک فتوحات کے بارے میں پیدا کیے گئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تحریک فتح کے اس پہلے ادھورے سلسلے کو ہی بچایا اور مضبوط کیا جس کی قیادت اور تشکیل خلفائے راشدین نے کی تھی۔ تحریک فتوحات کا دوسرا سلسلہ وہ ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہوا اور بعد میں بھی جاری رہا، یہ سلسلہ ولید بن عبد الملک کے دورِ حکومت میں بہت دُور تک پھیل چکا تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بازنطینی حکومت کے خلاف برپا کردہ تحریک جہاد کا بھی میں نے تذکرہ کیا ہے، انہوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بھی بنایا، اس پر غلبہ پانے کے لیے انہوں نے اپنی حکمت عملی کا نقشہ ترتیب دیا، اس کے لیے مصر اور شام میں کشتی سازی کے مراکز بنائے، مصر اور شام کی بحری سرحدوں کو مضبوط کیا، بحر متوسط کے شمال مشرقی جانب واقع جزیروں پر غلبہ حاصل کیا، شام کی شمالی اطراف کو محفوظ کر دیا، آپ رضی اللہ عنہ نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا، حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ قسطنطنیہ کے محاصرے کے دوران میں ہی فوت ہوئے تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو انہیں دشمن کے علاقے کے قریب بہت آگے لے جا کر دفن کیا جائے، یہ شاندار منظر ہے جو اُن کے جہاد کے ساتھ تعلق کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کی لاش لوگوں کے کندھوں پر ہو گی، اور وہ ان کی صفوں میں موجود ہوں گے، ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ زندہ و مردہ ہر دو حالتوں میں دشمن کی زمین میں دُور تک جائیں، گویا کہ زندگی میں انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ ان کے لیے کافی نہیں تھا تو انہوں نے اپنی وفات کے بعد اس پر مزید اضافے کی تمنا کی، صحیح اور دقیق معنی کے اعتبار سے یہ ایسی چیز ہے کہ حقیقی مجاہد کے نزدیک اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسلسل بری و بحری حملوں کے ذریعے بازنطینی حکومت کا ناطقہ بند کر دیا، انہوں نے بازنطینوں کو ڈرا دیا، طرح طرح کی تنگیوں اور خوف سے دوچار کر دیا، انہیں پریشان کن نقصانات میں مبتلا کر دیا،

اس سارا کچھ کے باوجود وہ قسطنطنیہ کو عبور نہیں کر سکے، اس کے بہت سے عوامل تھے جیسا کہ قارئین کتاب میں ان شاء اللہ دیکھیں گے۔ بازنطینی حکومت کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے صلح کے تعلقات قائم کر لیے، اموی اور بازنطینی دونوں حکومتوں کے درمیان مراسلات، تجربات اور سفراء کا بھرپور تبادلہ ہوتا رہا، جبکہ شمال افریقہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا، حضرت معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ کا حملہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہی ہوا تھا۔ ان فتوحات میں عقبہ بن نافع کا نام بہت نمایاں ہوا، جنہوں نے قیروان شہر آباد کیا تھا جسے آج تونس کہا جاتا ہے، یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں ہی ہوا تھا، قیروان مغرب میں اسلامی تہذیب وثقافت کے فروغ کا مرکز اور اس علمی دارالحکومت بن گیا۔

قارئین کرام دیکھیں گے کہ شمال افریقہ کی فتوحات کا سلسلہ حضرت عقبہ رحمہ اللہ کی شہادت تک جاری رہتا ہے۔ کتاب میں یہ عنوانات بھی زیر بحث آئے ہیں: اموی سلطنت کے مشرقی بازو خراسان، سجستان اور ماوراء النہر میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فتوحات، سندھ کی فتوحات، ان فتوحات کے اہم دروس، عبرتیں اور فوائد جن میں سے اہم یہ ہیں:

آیات اور احادیث نبوی کے مجاہدین کے دلوں پر اثرات، فتوحات میں اللہ کے طریقے جیسے اتحاد و اتفاق میں اللہ کا طریقہ، وسائل و اسباب کو اختیار کرنے کا طریقہ، ایک دوسرے کو روکنے اور دفاع کا طریقہ، ظلم اور ظالموں کے بارے میں اللہ کا طریقہ، تعیش پسندوں کے بارے میں اللہ کا طریقہ، سرکشی اور سرکشوں کے بارے میں اللہ کا طریقہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک فتوحات کی حکمت عملی کا نقشہ، روم، شمالی افریقی محاذ اور سجستان، خراسان اور ماوراء النہر کے محاذ پر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست، تحریک جہاد کے بارے میں ان کا محکمہ شوریٰ، معاویہ رضی اللہ عنہ کی انتظامیہ میں مرکزی قیادت اور امداد، سرکاری اور قبائلی جھنڈوں کا نظام، جاسوسی، ڈاک اور سلطنت کی بری حدود کا اہتمام، بحری بیڑے، بحری حدود، محکمہ فوج اور محکمہ مال کا اہتمام، آپ کے دور میں علمی، معاشی اور معاشرتی اثرات۔

میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد کے مجاہدین کی بعض کرامات بھی بیان کی ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، عبدالملک اور ان کے دونوں بیٹوں ولید اور سلمان کے زمانے میں سلطنت اُمویہ کے فضائل میں وہ وسیع فتوحات بھی ہیں جو انہی کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچیں۔ جس کے نتیجے میں دار السلام میں بہت وسعت آگئی۔ مشرق میں چین اور مغرب میں بلادِ اندلس اور فرانس کے جنوب مغرب کے درمیان تک اسلامی سلطنت کا دائرہ پھیل گیا۔ خلفاء اپنے بیٹوں کو جہاد کے لیے بھیجتے اور خود بھی قتال میں شریک ہوتے، صحابہ رضی اللہ عنہم اور کبار تابعین رحمہم اللہ بھی ان عساکر میں موجود ہوتے تھے، تحریک فتوحات سے سلطنت کا مقام بلند ہوا ان کے ساتھ اسلامی معاشرے میں ہر قسم کے لوگ معرضِ وجود میں آئے جیسے علماء، فقہاء، تجار، زہاد اور عبادت گزار لوگ۔

یہ لشکر مشارق و مغارب میں متحرک ہو گئے، ان دور دراز کے اطراف میں واقع قبائل کے فاتحین نے انہیں عدل و احسان دیا، ان کی روحانی اور جسمانی ضروریات کو پورا کیا، ان تک دین اسلام پہنچایا جس نے اس زمین پر انسانیت کا صحیح مفہوم دیا، اس لیے اسلام بہت جلد ان کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا،

یہ بڑی نرمی اور چپکے سے افکار میں داخل ہو جاتا ہے، عقل و فہم پر اس کی تاثیر بہت قوی ہے، فاتحین ان قبائل میں وہ حقائق لے کر آئے جن سے اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سعادت مند ہوئے تھے، اور انہوں نے انہی کے ساتھ انہیں بہرہ ور کر دیا۔ شاعر کہتا ہے:

اللہ أکبر إن دین محمد

وکتابہ أقوی و أقوم قیلا

طلعت بہ شمس الھدایۃ للوری

وأبی لھا وصف الکمال أفولا

والحق أبلج فی شریعتہ التی

جمعت فروعًا للھدی وأصولا

لا تذکروا الکتب السوالف عندہ

طلع الصباح فأطفؤا القندیلا

''اللہ سب سے بڑا ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین اور اس کی کتاب بہت قوی اور بہت مضبوط کلام ہے۔ اس کے ساتھ مخلوق کے لیے آفتاب ہدایت طلوع ہوا ہے، کمزور رائے والوں نے اس کے وصف کمال کو تسلیم نہیں کیا، اس کی شریعت میں حق واضح ہو چکا ہے جو ہدایت کے اُصول و فروع کا مجموعہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے سابقہ کتب کا ذکر نہ کرو، صبح نمودار ہو گئی لہٰذا قندیل بجھا دو۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُموی حکومت کے دور کی بڑی بڑی فتوحات اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ اُمت قوی اور متحد تھی، اللہ کے دین پر عمل پیرا تھی اور اقوام و قبائل کی ہدایت کی حریص تھی۔ اس کے علاوہ میں نے درج ذیل معاملات پر بات کی ہے: ولی عہدی کی سوچ اور یزید کی بیعت کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اقدامات، مشورے، اطلاعاتی دباؤ، اہل شام کا بیعت یزید کو تسلیم کر لینا، وفود کی طرف سے بیعت، اہل مدینہ سے بیعت کا مطالبہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر، عبد الرحمن بن ابو بکر، عبد اللہ بن زبیر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم کا اس بیعت پر اعتراض، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنے بیٹے یزید کو ولی عہدی کے لیے تیار کرنے کے اسباب جیسے اتحاد اُمت کی حفاظت، قبائلی عصبیت کی قوت، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیٹے سے محبت اور اس پر قناعت کرنا، بیعت یزید کے سلسلے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر کی جانے والی تنقید، عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں ولی عہدی کے تصور کے ماخذ، آپ کی زندگی کے آخری ایام، موت کی سختیوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی دُعا:

((اَللّٰھُمَّ اَقِلِّ الْعَثْرَۃَ، وَاْعفُ عَنِ الزَّلَّۃِ، وَتَجَاوَزْ بِحِلْمِکَ عَنْ جَھْلِ مَالَمْ یُرُجَ غَیْرُکَ فَاِنَّکَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَۃِ، لَیْسَ لِذِیْ خَطِیْئَۃٍ مَھْرَبٌ اِلَّا اِلَیْکَ ۔))

"اللہ! میری پھسلن کو مٹا دیجیے، لغزش کو معاف کر دیجیے، اپنے حلم سے اس لاعلمی سے درگزر کیجیے جس کی آپ کے سوا کسی سے اُمید نہیں رکھی جاسکتی، (اے اللہ!) آپ وسیع مغفرت والے ہیں، غلطی کرنے والے کے لیے آپ کی طرف بھاگنے کے علاوہ کوئی جگہ نہیں۔" اس (دُعا) کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔ اوّل و آخر اللہ کا ہی فضل ہے، میں اللہ تعالیٰ سے اس کے اسمائے حسنیٰ اور بلند صفات کے طفیل اس سے سوال کرتا ہوں کہ وہ میرے اس کام کو اپنی رضا کے لیے خالص اور اپنے بندوں کے لیے نفع بخش بنا دے، میرے لکھے ہوئے ہر ہر حرف پر مجھے اجر و ثواب عطا کرے، اور اسے میری نیکیوں کے پلڑے میں ڈال دے، اور میرے ان بھائیوں کو بھی جزا دے جنہوں نے اس عاجزانہ کوشش کی تکمیل میں حصہ ڈالا ہے۔ ہم اس کتاب کے پڑھنے والے ہر اس مسلمان سے یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ اس بندہ ناچیز کو اپنی دُعاؤں میں نہ بھولیں جو اپنے رب کی معافی، مغفرت، رحمت اور خوش نودی کا محتاج ہے:

﴿رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (النمل: ۱۹)

"میرے رب! مجھے توفیق دیجیے کہ میں آپ کی نعمت کا شکر کروں، جو آپ نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہے اور یہ کہ میں نیک عمل کروں، جسے آپ پسند کریں اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل کر لیجیے۔" ا

ور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِکَ لَهَا وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ (فاطر: ۲)

"جو کچھ اللہ لوگوں کے لیے رحمت میں سے کھول دے تو اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔"

وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ ۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ ۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ الفقیر الی عفو ربہ و مغفرتہ

ابو عطاء المنعم بن الحاج خان بادشاہ حفظہ اللہ ورعاہ وجعل الجنۃ مثواہ۔ 26 ربیع الثانی۔ 1447ھ۔ 2025-10-18۔ یوم السبت

پہلی فصل

معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما

پیدائش سے خلافت راشدہ کے اختتام تک اور خاندان

پہلی بحث:

نام و نسب، کنیت اور خاندان

۱۔ نام و نسب کنیت اور پیدائش:

ابو عبد الرحمن معاویہ بن ابوسفیان بن صخر بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن مناف بن قصیّ بن کلاب، قریشی، اموی مکی۔[1]

امیر المومنین، شاہ اسلام معاویہ رضی اللہ عنہ مختلف اقوال کی رو سے بعثت نبوی سے پانچ سال، سات سال یا تیرہ سال قبل پیدا ہوئے۔ ان میں سے پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔[2] معاویہ رضی اللہ عنہ دراز قد، خوبرو اور بڑی بارعب شخصیت کے حامل تھے، ان کے والد نے ان کے عہد طفولت ہی سے ان میں سنہرے مستقبل کے آثار بھانپ لیے تھے۔ تو وہ ان کی ماں سے کہنے لگے: میرا یہ بیٹا سردار ہو گا، یہ اپنی قوم کی زمام قیادت سنبھالنے کی بدرجہ اتم اہلیت رکھتا ہے، یہ سن کر اس کی ماں کہنے لگی: صرف اپنی قوم کی قیادت؟ میں اسے گم پاؤں اگر یہ تمام عربوں کی قیادت نہ کرے تو۔[3] ابان بن سفیان کا بیان ہے: ایک دن معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی ماں ہند رضی اللہ عنہا کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ اس پر ان کی ماں کہنے لگی: کھڑا ہو جا اللہ تجھے نہ اٹھائے، یہ منظر دیکھ کر ایک اعرابی کہنے لگا: تو نے ایسا کیوں کہا؟ واللہ! مجھے لگتا ہے کہ یہ بچہ اپنی قوم کی قیادت کرے گا۔ اس پر وہ کہنے لگی: اگر یہ صرف اپنی قوم کی قیادت کرے گا تو پھر اللہ اسے نہ اٹھائے۔[4]

۲۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام:

معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا شمار ان سرکش لوگوں میں ہوتا تھا جو قبل از اسلام اسلام کے خلاف برسرپیکار تھے، سیرت نبوی پر مشتمل کتابیں اسلام اور صاحب اسلام کے خلاف ان کے اعمال و کردار کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں مگر جب اللہ نے انہیں رشد و ہدایت سے نوازنا چاہا تو وہ فتح مکہ سے تھوڑا عرصہ قبل مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خصوصی اعزاز سے نوازتے ہوئے فرمایا: "جو شخص ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہو گا اسے امن حاصل ہو گا۔"[5] ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کا یہ ارشاد گرامی اپنے اندر ایک اہم تربیتی پہلو بھی رکھتا ہے۔ امان کے لیے ان کے گھر کی تخصیص ہی ایک ایسی قابل قدر چیز تھی جس سے سردار ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو ذہنی تسکین حاصل ہوئی۔ اسی چیز نے انہیں اسلام پر ثابت قدمی عطا کی اور انہیں ایمان کی تقویت بخشی۔[6]

یہ ترکیب نبوی کا کریمانہ انداز اس قدر موثر ثابت ہوا کہ اس سے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے دل و دماغ سے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں نفرت وکینہ کے جراثیم کا خاتمہ ہو گیا اور ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اگر وہ مخلص رہے تو اسی سے انہیں اسلام میں جو مقام و مرتبہ حاصل ہو گا وہ قریش مکہ کے ہاں انہیں حاصل شدہ اعزاز و اکرام سے کسی بھی طرح کم نہیں ہو گا۔[1] یہی وہ کریمانہ منہج نبوی ہے جسے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت علماء کرام اور دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دینے والے حضرات کو پورے طور پر اپنانا اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔[2]

مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا اسلام بہت خوب رہا اور انہوں نے اسلام کے لیے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ غزوہ حنین کے موقع پر اور طائف کا محاصرہ کرتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک عمل رہے۔ ان کی ایک آنکھ اسی دوران ضائع ہوئی جبکہ دوسری آنکھ سے جنگ یرموک کے موقع پر محروم ہو گئے تھے۔[3] بنو ثقیف پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ لات نامی بت کو توڑنے کے لیے بھیجا۔ یہ بت اگرچہ بنو ثقیف کا تھا مگر قریش مکہ بھی اس کی بڑی تعظیم کیا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے دل میں ایمان گھر کر چکا تھا اور ان کے رگ وریشہ میں بس چکا تھا۔ قبل ازیں ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام میں جو چیز حائل تھی وہ ریاست و حکومت کے ساتھ ان کی دلی محبت تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان نفسیاتی عوامل کو ملحوظ خاطر رکھا جن کا نہ صرف یہ کہ ابوسفیان پر گہرا اثر ہوا بلکہ فتح مکہ کے بعد قریش کے سرکردہ لوگوں پر بھی اس کے بڑے اثرات مرتب ہوئے۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ فتح مکہ کے دن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر کو دارالامان قرار دیا بلکہ غزوۂ حنین کے موقع پر حاصل ہونے والے مال غنیمت سے بھی دوسرے مولفۃ القلوب کی طرح انہیں حصہ دیا گیا۔[4]

زمانہ جاہلیت میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو کارروائیاں کیں وہ انہیں بھولے نہیں تھے، لہٰذا انہیں شوق دامنگیر ہوا کہ وہ اس سے کہیں بڑھ کر اسلام کی خدمت کریں گے۔ اسی حوالہ سے مفسر ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں ان کا شمار سادات قریش میں ہوتا تھا جبکہ غزوۂ بدر کے بعد انہوں نے تن تنہا اس منصب کی ذمہ داریاں سنبھال لیں، پھر جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو ان کا اسلام بھی خوب رہا اور انہوں نے جنگ یرموک نیز اس سے ماقبل و مابعد بھی مختلف مواقع پر دفاع اسلام کے لیے قابل تعریف کردار ادا کیا۔[5] سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جنگ یرموک کے موقع پر مجھے ایک ایسے شخص کی آواز سنائی دے رہی تھی جو کہہ رہا تھا: نصرت الٰہی قریب ہے۔ اس وقت مسلمان اور رومی ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے، میں نے جب ادھر ادھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے یزید کے جھنڈے کے نیچے داد شجاعت دے رہے تھے۔[1] یہ بھی مروی ہے کہ جنگ یرموک کے موقع پر وہ گھوڑوں کے مجمع میں کھڑے لوگوں سے کہہ رہے تھے: ''اللہ اللہ تم عرب کے محافظ اور اسلام کے مددگار ہو۔'' جبکہ وہ روم کے محافظ اور شرک کے مددگار ہیں، یا اللہ! یہ دن بھی تیرے دنوں میں سے ایک دن ہے۔ یا اللہ! اپنے بندوں کی نصرت فرما۔ بااختلاف روایات ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اکتیس، بتیس، تینتیس یا چونتیس ہجری میں

وفات پائی،[2] اور ان کے بیٹے معاویہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ بھی مروی ہے کہ ان کی نماز جنازہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی، اس وقت ان کی عمر اسی برس اور ایک دوسرے قول کی رو سے نوے برس سے کچھ زائد تھی۔[3]

۳۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہا:

معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے خاوند ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کے بعد فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا اور وہ دونوں اپنے نکاح پر قائم رہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مردوں سے بیعت لینے کے بعد عورتوں سے بیعت لینے لگے تو ان عورتوں میں ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا بھی موجود تھی۔ اس نے اس خوف کے پیش نظر بھیس بدل رکھا تھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے پہچان نہ لیں۔ اس نے غزوۂ احد کے موقع پر آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا تھا اس کا منظر اس کے سامنے تھا۔ آپ نے عورتوں سے یہ بیعت لی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا نہیں کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، کسی پر بہتان نہیں لگائیں گی اور اچھے کاموں کی مخالفت نہیں کریں گی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "چوری نہیں کریں گی۔" تو ہند رضی اللہ عنہ کہنے لگیں: اے اللہ کے رسول! ابوسفیان رضی اللہ عنہ بخیل آدمی ہے، وہ مجھے اتنا مال نہیں دیتا جو میرے اور میرے بچوں کے لیے کافی ہو، اگر میں اس کے علم میں لائے بغیر اس کے مال سے کچھ لے لوں تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو اس کے مال سے اس قدر لے سکتی ہے جو تجھے اور تیرے بچوں کو کفایت کر سکے۔" جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ: "تم زنا نہیں کرو گی" تو ہند رضی اللہ عنہ کہنے لگی: کیا آزاد اور شریف عورت بھی ایسا کر سکتی ہے؟ جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہچان لیا تو دریافت فرمایا: "کیا تو ہند رضی اللہ عنہ بنت عتبہ ہے؟" تو اس نے اس کا اثبات میں جواب دیا۔ پھر گویا ہوئی: گزشتہ ایام میں جو کچھ ہوا اس سے درگزر فرمائیں۔ اللہ آپ سے درگزر فرمائے گا۔ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے مصافحہ نہیں کیا کرتے تھے، لہٰذا ان عورتوں نے مصافحہ کیے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی۔ آپ صرف اس عورت کے ہاتھ کو مس کیا کرتے تھے جو آپ کی محرم ہوتی یا اللہ نے اسے آپ کے لیے حلال کیا ہوتا۔

بخاری و مسلم میں سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کی قسم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ نے کبھی بھی کسی غیر عورت کے ہاتھ کو مس نہیں کیا۔[1] عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ہند رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو کہنے لگی: اے اللہ کے رسول! سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے پسندیدہ دین کو غلبہ عطا فرمایا۔ میرے ساتھ آپ کی قرابت داری کا مجھے فائدہ ہونا چاہیے۔ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والی خاتون ہوں۔ پھر وہ اپنے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے گویا ہوئی: میں ہند رضی اللہ عنہ بنت عتبہ ہوں۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ کہنے لگی: اے اللہ کے رسول! ابوسفیان رضی اللہ عنہ بخیل آدمی ہے، اگر میں اس کے مال سے اپنے بچوں کو کچھ کھلا لوں تو کیا اس میں کوئی مضائقہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "معروف کے ساتھ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"[2]

ہند رضی اللہ عنہا اسلام قبول کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے کے بعد گھر گئیں اور پھر اپنے ہاتھوں سے اپنے بت کو توڑنے لگیں۔ یہاں تک کہ اسے ریزہ ریزہ کر دیا، وہ کہہ رہی تھیں: میں تیرے بارے میں دھوکے میں رہی۔[3] پھر جب انہوں نے فرزند ان توحید کو کعبہ مشرفہ میں مصروف عبادت دیکھا تو پکار اٹھیں: واللہ! میں نے آج تک کسی کو اس طرح اللہ کی عبادت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ لوگ رات بھر مصروف عبادت رہے۔[4] زمانہ جاہلیت میں ہند رضی اللہ عنہا نے سیدہ زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑا اچھا برتاؤ کیا۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اپنے شوہر ابو العاص بن ربیع کے ساتھ مکہ میں رہائش پذیر تھیں۔ غزوۂ بدر کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کو ابو العاص کے ایک معاہدہ کے تحت انہیں مدینہ منورہ لانے کے لیے ایک آدمی کو مکہ مکرمہ بھیجا۔ جنگ بدر میں مارے جانے والے قریش مکہ کے خون ابھی خشک نہیں ہوئے تھے، اس جنگ میں ہند رضی اللہ عنہ کو اس کے باپ، بھائی اور چچا کی ہلاکت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ وہ قریش کی محافل و مجالس میں جاتی اور مسلمانوں سے انتقام کی آگ بھڑکاتی۔ اسے یہ خبر مل چکی تھی کہ دختر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے والد گرامی کے پاس مدینہ جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ جب ایک دفعہ اس کی ملاقات زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوئی تو ان سے کہنے لگی: بنت محمد! مجھے معلوم ہوا کہ تم اپنے باپ کے پاس مدینہ جانے کی تیاری کر رہی ہو، اگر تمہیں سفری ضروریات کی تکمیل کے لیے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں تمہاری تمام ضروریات کی تکمیل کے لیے حاضر ہوں، لہٰذا تمہیں مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مردوں کے معاملات الگ ہیں اور تم عورتوں کے الگ۔ سیدہ زینب، ہند رضی اللہ عنہا کی اس فراخ دلانہ پیش کش سے بڑی خوش ہوئیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہند رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے کے لیے ہی یہ باتیں کی تھیں۔ پھر جب دختر رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئیں تو قریش کے کچھ لوگوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اس وقت حمل کی حالت میں تھیں۔ مشرکین کے تشدد کی وجہ سے وہ اونٹنی سے گر گئیں اور ان کا حمل ساقط ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ہند رضی اللہ عنہا دوڑتی ہوئی آئی اور ان لوگوں کو غیرت دلاتے ہوئے چلا کر کہنے لگیں: ایک غیر مسلح خاتون کے ساتھ معرکہ آرائی؟ تمہاری یہ شجاعت بدر کے دن کہاں گئی تھی؟ پھر اس نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو اپنی آغوش میں لے کر ان کے جسم سے گرد و غبار وغیرہ کو صاف کیا اور ان کی حالت کو درست کیا، پھر بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے والد گرامی کے پاس جانے کے لیے نئے سرے سے تیاری شروع کر دی۔[1]

ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا بڑی دانا، بلند پایہ شاعرہ اور خود دار خاتون تھیں۔ مروی ہے کہ وہ ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے پہلے فاکہ بن مغیرہ کے نکاح میں تھیں۔ یہ قریشی نوجوان شراب کا بڑا رسیا تھا، جب اس کے گھر شراب کی محفل سجتی تو اس کے ہم پیالہ اجازت لیے بغیر ہی گھر میں گھس آتے۔ ایک دن جب وہ اس کے پاس گھر آئی تو گھر میں کوئی نہیں تھا، لہٰذا وہ سو گئی۔ اس دوران اس کے خاوند کا کوئی شرابی ساتھی گھر میں داخل ہوا اور یہ دیکھ کر کہ ہند رضی اللہ عنہا سو رہی ہے، وہ واپس چلا گیا اور راستے میں اس کی فاکہ سے ملاقات ہو گئی۔ جب اس نے گھر میں ہند رضی اللہ عنہ کو سوتے ہوئے پایا تو اس نے ہند رضی اللہ عنہا پر اس آدمی کے ساتھ بدکاری کی تہمت لگا دی۔ پھر بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک جا پہنچی کہ انہوں نے بالاتفاق یہ معاملہ کسی کاہن کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر سے روانگی کے وقت اس کا باپ عتبہ بھی ساتھ تھا جبکہ اس کا شوہر بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ جب یہ لوگ کاہن کے قریب پہنچے تو ہند رضی اللہ عنہ کے باپ نے دیکھا کہ اس کا رنگ زرد ہو رہا ہے۔ وہ تنہائی میں جا کر اس سے کہنے لگا: بیٹی! میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرا جسم تبدیل ہو رہا ہے اور رنگ بھی پیلا پڑ رہا ہے، اگر تجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو خاموشی سے مجھے بتا دے تاکہ معاملہ یہیں رفع دفع ہو جائے اور ہم لوگوں کے سامنے رسوائی سے بچ جائیں۔ اس پر ہند رضی اللہ عنہا گویا ہوئی: ابا جان! میں بالکل بے گناہ ہوں مگر ہم ایک انسان کے پاس جا رہے ہیں،

اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور وہ صحیح بات بھی بتا سکتا ہے، مجھے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ اگر اس نے میرے بارے میں کوئی غلط فیصلہ کر دیا تو ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رسوا ہو کر رہ جائیں گے۔ اس پر عتبہ کہنے لگا: میں اسے ابھی جانچ لیتا ہوں۔ جب اس نے ایسا کہا تو کاہن اس میں کامیاب رہا۔ پھر انہوں نے ہند رضی اللہ عنہ کو دوسری عورتوں میں بٹھا کر کاہن سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ ہند رضی اللہ عنہا کے دونوں کندھوں کے درمیان مارا اور پھر کہنے لگا: خاتون! تو پاک دامن ہے، تو نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا، تو ایک ایسے بادشاہ کو جنم دے گی جس کا نام معاویہ ہو گا۔ یہ سن کر فاکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اچھل کر کہنے لگا: میری بیوی۔ اس پر ہند رضی اللہ عنہا نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا: واللہ! میں چاہوں گی کہ وہ تیرے علاوہ کسی اور مرد سے ہو۔ پھر اس نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا جس سے معاویہ رضی اللہ عنہما نے جنم لیا۔[2] ہند رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں وفات پائی۔[3]

۴۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھائی اور بہنیں:

۱۔ یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما

انہیں یزید الخیر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی نرینہ اولاد میں سے سب سے افضل تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا۔ غزوہ حنین میں شریک ہوا۔ اس غزوہ سے ہاتھ آنے والے مال غنیمت میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک سو اونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی دی۔[1] حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے اس اولین لشکر کا کمانڈر مقرر فرمایا جسے شام بھیجا گیا تھا۔ اس منصب پر ان کی تقرری کا مقصد دمشق فتح کرنا اور پھر بوقت ضرورت علاقہ میں موجود دوسرے اسلامی لشکروں کی مدد کرنا تھا۔ آغاز کار میں یزید کا یہ لشکر تین ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ لشکر کو روانہ کرنے سے پہلے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بڑی موثر اور عالی شان وصیت کی جو صلح و جنگ میں اسلام کے واضح اور سنہرے احکامات پر مشتمل تھی۔ خلیفہ اسلام رضی اللہ عنہ نے پیدل چل کر اس لشکر کو الوداع کہا۔ آپ نے اس لشکر کو یہ وصیت فرمائی: میں نے تجھے آزمانے اور پختہ کار بنانے کے لیے اس لشکر کی سربراہی دی ہے، اگر تو نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تو تو نہ صرف یہ کہ اس منصب پر فائز رہے گا بلکہ تجھے مزید ترقی دی جائے گی اور اگر تیری کارکردگی غیر تسلی بخش رہی تو پھر تجھے معزول کر دیا جائے گا۔ اللہ سے تقویٰ اختیار کرنا، اس لیے کہ وہ تیرے اندرون کو بھی اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح تیرے بیرون کو دیکھتا ہے۔ زمانہ جاہلیت کے تعصب سے احتراز برتنا اس لیے کہ اللہ اس سے بھی نفرت کرتا ہے اور ایسا تعصب رکھنے والوں سے بھی۔ جب تو اپنے لشکر میں جائے تو ان کے ساتھ اچھی رفاقت رکھنا۔ ان سے خیر پر مبنی برتاؤ کرنا اور اس کا ان سے وعدہ کرنا۔ انہیں مختصر انداز میں نصیحت کرنا اس لیے کہ زیادہ باتیں ایک دوسری کو بھلا دیتی ہیں۔ اپنی اصلاح کرتے رہنا، اگر تم ایسا کرو گے تو وہ اپنی اصلاح خود کر لیں گے۔ تمام نمازیں مکمل رکوع و سجود کے ساتھ بروقت ادا کرنا اور انہیں خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنا۔ جب تمہارے پاس دشمن کے قاصد آئیں تو ان کی مناسب عزت کرنا اور انہیں اپنے پاس بہت کم عرصہ کے لیے ٹھہرانا تاکہ واپس جانے سے پہلے تمہارے لشکر سے آگاہ نہ ہو سکیں اور انہیں اپنے خفیہ امور سے مطلع نہ کرنا تاکہ وہ تمہارے نقائص و عیوب سے باخبر نہ ہو سکیں۔ انہیں اپنے لشکر کے پاس ٹھہرانا تاکہ وہ تمہاری حربی قوت کا براہ راست مشاہدہ کر سکیں۔ ان کے ساتھ دوسروں کو گفتگو کرنے کا موقع نہ دینا اور یہ فریضہ خود سرانجام دینا۔ اپنے باطن کو اپنے ظاہر کی طرح نہ رکھنا، جب باہم مشورہ کرنا

تو سچائی کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑنا اس طرح مشورہ صائب اور نتیجہ خیز رہے گا اور تمام مشکلات پر قابو پایا جاسکے گا۔ بکثرت پہرے دار رکھنا اور انہیں سارے لشکر میں پھیلا دیا کرنا۔ رات کو اپنے رفقاء کے ضروری معاملات کے بارے بات چیت کیا کرنا اس طرح حالات و واقعات سے آگاہی حاصل ہو گی اور اندر کی کئی باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ پہرے داروں کو اچانک چیک کیا کرنا، کسی کو حفاظتی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب پاؤ تو اسے اچھے انداز سے سمجھانا اور مناسب سزا بھی دینا۔ لشکریوں کو رات کی ذمہ داریاں باری باری تفویض کرنا اور آغاز شب کی ذمہ داری کا دورانیہ آخر شب کی ذمہ داری سے کم رکھنا، ان سے کبھی غافل نہ ہونا اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اگر ایسا نہیں کرو گے تو ان میں بیگاڑ پیدا کر دو گے۔ ان کی جاسوسی مت کرنا اگر ایسا کرو گے تو انہیں رسوا کر دو گے۔ ان کے اندرونی معاملات سے ہٹ کر صرف ان کے ظاہر پر ہی اکتفا کرنا۔ فضول لوگوں کی مجالس سے اجتناب کرنا سچے اور باوفا لوگوں کے ساتھ ہی میل جول رکھنا اور انھیں مخلصانہ بنانا۔ بزدلی نہ دکھانا اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے ماتحت لوگ یقیناً بزدلی کا مظاہرہ کریں گے۔ بددیانتی سے اجتناب کرنا یہ چیز فقر و فاقہ کو قریب کرتی اور نصرت الٰہی کا راستہ روک دیتی ہے۔ تمہیں ایسے لوگ بھی ملیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھر جا گھروں میں بند کر رکھا ہو گا ان سے کوئی تعرض نہ کرنا۔ ابن الاثیر فرماتے ہیں: ''یہ بااختیار لوگوں کے لیے بڑی عمدہ اور انتہائی نفع بخش وصیت ہے۔''[1]

اس وصیت کے بعض فوائد:

☆ مناصب اور عہدوں پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی کا استحقاق ہے بلکہ یہ صلاحیتوں، مخلصانہ کاوشوں اور ان میں کامیابیوں کے مرہون منت ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز اور بااختیار لوگوں کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر ان کے ماتحت لوگ سستی و کاہلی اور بدعملی کا مظاہرہ کریں تو وہ انہیں معزول کر دیں۔ اگر جواب دہی کا یہ تصور اجاگر ہو جائے تو وہ لوگ مقاصد کے حصول کے لیے اپنی کاوشوں کو کئی گنا بڑھا دیں گے۔ لیکن اگر انہیں بہر صورت ان کے عہدوں کے تحفظ کی ضمانت دے دی جائے گی تو وہ فرائض کی ادائیگی میں سستی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں اور ذاتی مفادات کے حصول میں مصروف ہو سکتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں خلل ڈالے گا اور اپنے ماتحتوں کے بگاڑ، تنازعات اور بدامنی جیسے رویوں کو جنم دے گا۔

☆ خوف الٰہی کامیابیوں کے حصول کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ظاہر اور باطنی جملہ امور سے بخوبی آگاہ ہے۔ جب لوگ دل سے تقوی اختیار کریں گے تو وہ اپنے ظاہری معاملات میں بطریق اولی ایسا کریں گے۔ اسی طرح بااختیار اور ذمہ دار عہدے دار بگاڑ اور بگاڑ پیدا کرنے والے تمام مظاہر سے اجتناب کریں گے۔

☆ آباء واجداد اور قوم و قبیلہ کے لیے متعصب ہونا انسان کو صراط مستقیم سے انحراف کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ نیز اس سے اس واحد اسلامی رابطہ سے نسبت کمزور پڑ سکتی ہے جو اسلامی اخوت و مودت سے عبارت ہے۔

☆ پند و نصیحت میں اختصار سے کام لینا اس لیے کہ طویل گفتگو ذہن میں محفوظ نہیں رہتی جس کے نتیجہ میں وہ غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ طویل گفتگو سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اگر متکلم فصیح اللسان ہو تو سامعین اس کی خوش کلامی کے سحر میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں اور اگر وہ اس وصف سے عاری ہے تو پھر سامعین اکتا جائیں گے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اسے ذہنوں میں محفوظ نہیں رکھ سکیں گے۔

☆ جب ذمہ دار آفیسر اپنے آپ کی اصلاح کرتے ہوئے اپنے نقائص و عیوب کو دور کر لے اور اپنی ذات کو نمونہ بنا لے تو اس کا ایسا طرز عمل اس کے ماتحت لوگوں کی اصلاح کا موثر ترین ذریعہ ثابت ہو گا۔

☆ ظاہری و باطنی ہر دو اعتبار سے اقامت صلاۃ کا اہتمام کرنا، یعنی اپنے اقوال و افعال میں کمال پیدا کرنا، نماز میں خشوع و خضوع اختیار کرنا اور دلی طور سے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا، رب کائنات کی بندگی کا وہ بہترین انداز ہے جس کے ذریعے سے اللہ کی زمین پر اللہ کے ذکر کو عام کیا جا سکتا اور انسانی رویوں میں نکھار پیدا کیا جا سکتا ہے اور دلوں کو تقویت دی جا سکتی ہے، اس قسم کی مخلصانہ عبادت سے بندوں کے نفوس میں مسرتیں پیدا ہوتی ہیں اور غم و فکر کے وقت بندہ مسلم کو جائے پناہ میسر آتی ہے۔

☆ دشمن کے سفراء اور قاصدین کا احترام دعوت الی اللہ کے احترام کے زمرے میں آتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ مسلمانوں کے ان اخلاق عالیہ سے آگاہ ہوں گے جن سے وہ آراستہ ہیں۔ مگر یہ احترام و اکرام اس حد تک نہیں بڑھنا چاہیے جس سے وہ سپاہ اسلام اور عام مسلمانوں کے اندرونی معاملات تک رسائی حاصل کر سکتے ہوں۔ اس دوران انہیں اسلامی لشکر کی شان و شوکت اور عسکری قوت کا مشاہدہ کروانا چاہیے تاکہ وہ اس سے اپنی قوم و حکومت کو آگاہ کر سکیں۔[1]

☆ قومی رازوں جیسی مقدس امانت کی حفاظت کرنا اور اس حوالے سے کسی سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ دانا شخص مخفی امور سے آگاہ ہونے کی بھرپور صلاحیت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ قومی راز متعلقہ لوگوں کے ضمیر میں محبوس رہنے چاہئیں۔ ان کے افشاء کی صورت میں معاملات ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور قوم سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔

☆ ٹھوس مشورہ اس کے نتائج سے زیادہ اہم ہوا کرتا ہے، اس لیے کہ جس شخص سے مشورہ کیا جائے اگرچہ وہ بڑا بیدار مغز اور صائب الرائے ہی کیوں نہ ہو وہ مشورہ لینے والے کو اس وقت تک کوئی فائدہ پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں ہو گا جب تک زیر نظر مسئلہ اس پر پوری طرح عیاں نہ کیا جائے۔ جب اس کے قضیہ کی بعض تفصیلات کو مخفی رکھا جائے گا تو ایسا کرنے والا اپنے خلاف جرم کا خود ارتکاب کرے گا اس لیے کہ اس قسم کی صورت حال میں دیا گیا مشورہ ضرر رساں بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

☆ ہر عسکری کمانڈر اور سول قائد کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے ماتحت مختلف طبقات کے لوگوں کے ساتھ روابط میں رہے تاکہ وہ ان کے مسائل و معاملات سے گہری واقفیت حاصل کر سکے اس طرح اسے ان کی مشکلات کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے میں بڑی مدد ملے گی، جس با اختیار اور ذمہ دار شخص کو چند

مخصوص لوگوں سے میل جول رکھنے اور دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کی عادت ہوتی ہے اس تک ان چند گنے چنے لوگوں کی فراہم کردہ معلومات ہی پہنچ پائیں گی اور اس طرح وہ معاملات کی پوری تفصیل سے محروم رہے گا جس کا نتیجہ ان کے غیر مناسب حل کی صورت میں سامنے آئے گا۔

☆ مسلمانوں کی حفاظت کا پورا پورا اہتمام کرنا خصوصاً جب انہیں خطرات کا سامنا ہو۔ اس حفاظتی نظام کو بہتر اور مربوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذمہ دار لوگوں کی وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کی جائے، ان کی سخت نگرانی کی جائے اور ان پر مکمل اعتماد نہ کیا جائے تاکہ وہ کسی ایسی کوتاہی کا ارتکاب نہ کریں جس کی وجہ سے مسلمانوں کو کوئی نقصان اٹھانا پڑے۔

☆ ذمہ دار حضرات کے لیے ضروری ہے کہ وہ جرائم کے مرتکبین کو سزا دیتے وقت حد سے تجاوز نہ کریں اور اس کے لیے اعتدال کی راہ اپنائیں۔ اگر سزا کے مستحقین کو سزا دینے میں سستی کا مظاہرہ کیا جائے گا تو حکام کا یہ رویہ انہیں قانون شکنی پر دلیر بنا دے گا اور ان کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے لوگ بھی ارتکاب جرائم کے لیے کمربستہ ہو جائیں گے جس کے نتیجہ میں بدامنی کا دور دورہ ہو گا اور معاملات ہاتھ سے نکل جائیں گے۔

☆ دوسری طرف کسی کو اس کے گناہ کی سزا دیتے وقت ناروا سختی سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ روش اختیار کرنے سے رعیت متنفر ہو گی اور لوگ ناراض ہو کر جتھہ بندی پر اتر آئیں گے۔ سزا ہمیشہ حکمت کے ساتھ اور اعتدال کے دائرہ میں رہ کر دی جائے اور وہ بھی معاملے کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کے بعد، تاکہ سزا کا تربیتی مقصد بھی پورا ہو جائے اور تنقید و تنقیص اور ناراضی سے بھی بچا جا سکے۔[1]

☆ مسؤل اور ذمہ دار شخص کو اپنے دائرہ عمل میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات کے بارے میں مکمل طور سے آگاہ رہنا چاہیے اور ان سے نمٹنے کے لیے چوکنا اور خبردار بھی، تاکہ افراد رعیت کو یہ احساس ہو کہ ان کے مسائل کو اہمیت دی جاتی ہے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اچھے لوگوں کی اچھائی میں مزید اضافہ ہو گا اور غلط کار لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو گی۔ مگر اس کی بنیاد ان کی جاسوسی پر نہیں رکھنا چاہیے اس لیے کہ لوگ اسے اپنی توہین پر محمول کریں گے نیز اس سے تعلقات کی وہ ڈوری بھی منقطع ہو سکتی ہے جو راعی کو اسی کی رعیت کے ساتھ مربوط رکھتی ہے۔ جب تک یہ ڈوری قائم رہے گی لوگوں کو مخالفانہ روش اختیار کرنے سے باز رکھے گی اور یہ وہ روش ہے جس سے معاشرتی زندگی اجیرن ہوتی اور امن عامہ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اگر یہ ڈوری ٹوٹ جائے اور لوگوں میں تقویٰ بھی کارفرما نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اہم ترین رکاوٹیں بھی ختم ہو گئیں جو لوگوں کو شہوات کے پیچھے بے باکانہ انداز میں دوڑانے کی راہ میں حائل رہا کرتی ہیں اور جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے تو حالات کو صحیح ڈگر پر لانا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے کہ ایسے حالات میں بے رحم قوت کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے جس کے نتائج ہمیشہ تباہ کن ہوا کرتے ہیں۔ ذمہ دار شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اہل صدق و وفا اور دانا و بینا لوگوں کے ساتھ میل جول رکھا کرے اور ان سے تنقید و توجیہ پر مبنی ایسی باتیں بھی سنا کرے جنہیں عام طور سے پسند نہیں کیا جاتا۔ اس سے اس کا بھی فائدہ ہو گا اور اس کے ماتحت لوگوں کا بھی۔ دوسری طرف اسے لہو و لعب کے رسیا اور دنیوی اہداف و مقاصد رکھنے والوں کی ہم نشینی سے احتراز کرنا چاہیے۔ ان کی خوش گفتاری اور مدح سرائی میں دل آویزی کا سامان تو ہو سکتا ہے مگر وہ سنجیدہ اور اہم امور کے بارے میں سوچ و بچار کے راستے میں حائل ہو جائیں گے۔ پھر جب اس کی آنکھیں کھلیں گی تو کئی آفتیں اس کے اور اس کے ماتحت لوگوں کے سر کچل رہی ہوں گی اور بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہو گا۔

دشمن سے ٹکراؤ کی صورت میں قائد لشکر کو شجاعت و دلیری کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور بزدلی و پست ہستی جیسی کسی چیز کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے، اس لیے کہ قائد کی بزدلی لشکر میں بھی سرایت کر جائے گی جس کی وجہ سے سبھی کو ناکامی اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ قائد و مسؤل کو میدان جنگ کے علاوہ بھی ہر موقع پر حالات و واقعات کا بہادری کے ساتھ سامنا کرنا چاہیے اس لیے کہ اس کی کمزوری کے اثرات اس کے ادارہ میں کام کرنے والے لوگوں پر پڑیں گے، اس سے ان کی کارکردگی متاثر ہو گی اور پیداوار میں کمی واقع ہو جائے گی۔ کمانڈر کو غلول سے اجتناب کرنا چاہیے۔ غلول سے مراد ہے: مال غنیمت کو تقسیم کرنے سے قبل اس میں سے کچھ مال پر قبضہ جمالینا، اس کا تعلق میدان جنگ کے ساتھ ہے۔ جبکہ اسے صلح کے میدانوں میں بھی دنیوی مفادات کے حصول سے اجتناب کرنا چاہیے۔ جن کے بارے میں اسے معلوم ہو کہ یہ شرعاً اس کے لیے جائز نہیں ہیں۔ مثلاً ایسے تحائف وصول کرنا جن سے مقصود ناجائز مفادات کا حصول ہو۔ اس لیے کہ یہ چیزیں بھی غلول کے ضمن میں آتی ہیں اور جیسا کہ اس حدیث میں وارد ہوا ہے غلول فقر و فاقہ کے قریب کرتا ہے اور نصرت باری تعالیٰ کا راستہ روک دیتا ہے۔ مذکورہ بالا نکات سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وصیت کی عظمت کی عکاسی کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے کمانڈر کو اسے محاذ جنگ پر بھیجتے ہوئے فرمائی تھی۔ اس گرانقدر وصیت سے یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے مسائل اور ان کی مشکلات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس تھا اور وہ ان امور سے بخوبی آگاہ تھے جن سے ان کے کمانڈروں کو واسطہ پڑ سکتا تھا، لہٰذا ان کی پوری کوشش ہوتی کہ انہیں ہر وہ مدد فراہم کی جائے جن سے وہ ان مشکلات کے وقوع پذیر ہونے سے محفوظ رہیں اور ان کے وقوع پذیر ہونے کی صورت میں ان کے ازالہ کے قابل ہو سکیں۔ سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ اور اس جیسی دیگر وصیتیں ان کی طرف سے متعدد مواقع پر اختیار کردہ مواقف میں خوبصورت اور جدید اضافہ ہیں۔[1] بیان کردہ روایت میں واضح ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یزید (بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ) کو جنگ کے حوالے سے وصیت کرتے وقت بھی انسانی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں فرمایا۔ آپ نے انہیں دس نکات پر مشتمل جنگی قوانین اپنانے کی وصیت فرمائی جو کہ اسلامی تہذیب کے انسانی پہلو اور رحمت و شفقت سے معمور اس کی روح کے عکاس ہیں۔ یہ وصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے:

"لوگو! میں تمہیں دس چیزوں کی وصیت کرتا ہوں انہیں اچھی طرح یاد کر لو۔ خیانت نہ کرنا، غلول نہ کرنا، فساد نہ مچانا، لاشوں کا مثلہ نہ کرنا، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، پھل دار درخت نہ کاٹنا، بکریوں اور اونٹوں کو ذبح نہ کرنا، الا یہ کہ انہیں کھانا مقصود ہو، گرجا گھروں میں بند لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا، اللہ کے کام پر روانہ ہو جاؤ۔[1]

یزید بن ابو سفیان نے اس وصیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں شام فتح ہوا تو انہوں نے یزید کو فلسطین اور اس کے گرد و نواح کا والی مقرر کیا۔ ان کی موت ۱۸ھ میں طاعون عمواس کے دوران واقع ہوئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ۱۹ھ میں فتح قیساریہ کے بعد فوت ہوئے۔ یہ بھی مروی ہے کہ وہ فتح قیساریہ سے قبل ہی رحلت فرما گئے تھے اور اسے معاویہ رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا۔[2]

ابو اسماعیل محمد بن عبد اللہ بصری فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یزید بن ابو سفیان کی موت پر بڑا صدمہ ہوا اور انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کی ولایت سنبھالنے کے لیے خط لکھا۔[3]

۲۔ عتبہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما

ابو الولید عتبہ بن ابوسفیان کی پیدائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں طائف کا والی مقرر فرمایا تھا۔ عمرو بن العاص کی وفات پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں مصر کا والی مقرر کیا۔ بیان کیا جاتا تھا کہ مکہ کی امارت کے ایام میں ایک بادیہ نشین خلیفہ کہہ کر ان سے مخاطب ہوا تو انہوں نے کہا: میں تو اس کا اہل نہیں ہوں۔ پھر وہ ان سے بھائی کہہ کر مخاطب ہوا، تو انہوں نے کہا: تو نے اپنی بات سنا لی، کچھ اور کہنا چاہے گا؟ اس نے کہا: بنو عامر کا شیخ تمہارا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے تمہارے ساتھ چچاؤں اور خالووں والے مراسم ہیں۔ وہ تمہارے سامنے کثرت عیال، قلت مال، زمانے کی سختی، فقر و فاقہ کی شدت اور نقصانات کی شکایت کرتا ہے، اس لیے کہ تمہارے پاس وہ کچھ موجود ہے جو اس کی ضروریات پوری کر سکتا ہے اور اس کی مشکلات کا ازالہ کر سکتا ہے۔[4] عتبہ نے جواب دیا: ہم نے تجھے بے نیاز کرنے کا حکم دے دیا ہے کاش! ہم اپنی اس تاخیر کا ازالہ کر سکیں۔[5] عتبہ بڑے قادر الکلام اور فصیح البیان خطیب تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بنو امیہ میں ان سے بڑھ کر کوئی خطیب نہیں ہوا۔[6] عتبہ ایک سال تک مصر کے والی رہے، پھر مصر میں ہی ان کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ یہ ۴۳ھ یا ۴۴ھ کی بات ہے۔

۳۔ عنبسہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما

ان کی کنیت ابو عثمان تھی۔ ابو امامہ سے مروی ہے کہ جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو وہ گھبرا گئے اور انہیں شدید قسم کی پریشانی لاحق ہو گئی۔ جب لوگ ان کی بیمار پرسی کے لیے آئے تو وہ رونے لگ گئے۔ انہوں نے پوچھا:

آپ روتے کیوں ہیں؟ تمہیں کس چیز نے غمناک کیا ہے؟ آپ اسلام میں عمدہ عادات و اطوار اور اچھی سیرت و کردار کی حالت میں رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ مزید غمناک ہو گئے اور پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ رونے لگے، اور پھر گویا ہوئے: میں کیوں نہ روؤں اور میرے غم میں شدت کیوں نہ آئے، مجھے نہیں معلوم کہ کل مجھے کس قسم کے حالات کا سامنا ہو گا۔ میں نے اپنے آگے کوئی ایسا عمل بھی نہیں بھیجا جس پر میں اعتماد کر سکوں۔[1]

۴۔ ام حبیبہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہما

ام حبیبہ رملہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہیں، آپ نام سے زیادہ کنیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ ان کی والدہ کا نام صفیہ بنت ابو العاص بن امیہ ہے۔ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی ولادت سترہ سال قبل از نبوت ہوئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ان کی شادی عبید اللہ بن جحش سے ہوئی تھی۔ قریش کے مظالم سے تنگ آ کر یہ دونوں حبشہ کو ہجرت کر گئے وہیں ان کے ہاں حبیبہ کی پیدائش ہوئی اور اسی بیٹی کے نام پر ان کی کنیت ام حبیبہ قرار پائی۔ قیام حبشہ کے دوران ان کا خاوند مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہیں فوت ہو گیا۔ سیّدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اس حالت میں بھی اسلام پر سختی کے ساتھ قائم رہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں عبید اللہ کے بدلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

جیسا شوہر عطا فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نکاح حبشہ کے حکمران نجاشی نے پڑھایا۔ ام حبیبہ نسب کے اعتبار سے دیگر تمام ازواج مطہرات کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مہر بھی انہوں نے پایا۔[2]

امام ذہبی سیّدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں رقمطراز ہیں: ان کا شمار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچاؤں کی بیٹیوں میں ہوتا ہے۔ ازواج مطہرات میں سے نسبی اعتبار سے کوئی بھی دوسری خاتون آپ کے قریب نہیں تھی اور نہ کسی دوسری زوجہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے زیادہ مہر ادا کیا گیا۔ نکاح کے وقت وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت دور سرزمین حبشہ میں تھیں۔ شاہ حبشہ نجاشی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے انہیں چار صد دینار مہر کے طور پر ادا کیے اور انہیں بہ طور ہدیہ اپنی طرف سے کئی اشیاء دیں۔[3] کتب حدیث اور کتب سیر میں ان کے بعض مناقب بھی وارد ہوئے ہیں جو ان کی عظمت، شان اور بلند تر مقام و مرتبہ پر دلالت کرتے ہیں، ان میں سے چند حسب ذیل ہیں: ا: انہوں نے فی سبیل اللہ دو دفعہ ہجرت کی، پہلی دفعہ مشرکین مکہ سے اپنا دین بچانے کے لیے حبشہ کی طرف اور پھر مدینہ منورہ کی طرف۔ امام حاکم اپنی سند سے ان کا یہ بیان نقل کرتے ہیں: میں نے خواب میں اپنے خاوند عبید اللہ بن جحش کو بڑی بری حالت میں دیکھا جس سے میں بہت زیادہ پریشان ہوئی اور کہنے لگی: واللہ! اس کی تو حالت ہی بدل گئی ہے۔ پھر جب صبح ہوئی تو وہ کہنے لگا: ام حبیبہ! میں نے تمام ادیان دیکھ لیے، مجھے تو نصرانیت سے بہتر کوئی دین نظر نہیں آیا۔ میں پہلے اسی دین کا پیروکار تھا، پھر میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اختیار کر لیا، اب میں دوبارہ نصرانیت اختیار کر رہا ہوں۔ میں نے کہا: واللہ! یہ تیرے لیے بہتر نہیں ہے اور پھر میں نے اسے اپنے خواب کے بارے میں آگاہ کیا۔ مگر اس نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ بکثرت شراب نوشی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے موت نے آلیا۔ پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے کوئی ام المومنین کہہ کر پکار رہا ہے، میں یہ سن کر پریشان سی ہو گئی اور اس خواب کی یہ تعبیر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے شادی کریں گے۔ ابھی میں عدت کے ایام گزار کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ نجاشی کی لونڈی میرے پاس آ کر کہنے لگی: آپ کے نام بادشاہ کا پیغام ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خط لکھا ہے کہ میں تمہارا نکاح ان کے ساتھ کرا دوں، آپ کو مبارک ہو۔ بادشاہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ آپ کسی آدمی کو اپنا وکیل مقرر کر دیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہارا نکاح کرا دے۔ میں نے خالد بن سعید بن العاص کو پیغام بھیج کر انہیں اپنا وکیل مقرر کر دیا۔[1]

اس روایت سے سیّدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی بڑی فضیلت و منقبت ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ آپ ہجرت حبشہ سے مشرف ہوئیں اور نامساعد حالات میں بھی اسلام اور ہجرت پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔[2]

ب: ان کے فضائل و مناقب میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان کے باپ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ آنے پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنا چاہا تو انہوں نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور یہ اس لیے کہ اس وقت وہ مسلمان نہ ہوئے تھے۔ انہوں نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔[3] محمد بن مسلم زہری سے مروی ہے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ان دنوں آپ غزوہ مکہ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح حدیبیہ کی مدت میں اضافہ کرنے کی درخواست کی مگر آپ نے اسے مسترد فرما دیا، پھر وہ یہاں سے اٹھا اور اپنی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچا۔ جب اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنا چاہا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر لپیٹ دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہنے لگا:

بیٹی! تونے یہ قدم میرے احترام میں اٹھایا یا بستر کے احترام میں؟ انہوں نے جواب دیا: یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے اور تم مشرک وپلید ہو۔ یہ سن کر ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہنے لگا: بیٹی! میرے بغیر تجھے برائی نے آلیا ہے۔[4]

ج: ابن سعد اور حاکم، عوف بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا وہ فرمارہی تھیں: نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے موت کے وقت مجھے اپنے پاس بلایا اور پھر کہنے لگیں: ہو سکتا ہے کہ ہمارے درمیان سوتنوں جیسی کوئی بات ہو گئی ہو، اگر ایسا کچھ ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے بھی معاف فرمائے اور آپ کو بھی۔ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ تمہاری اس قسم کی تمام باتیں معاف فرمائے۔ اس پر وہ کہنے لگیں: تم نے مجھے خوش کیا اللہ تمہیں خوش فرمائے۔ پھر انہوں نے ام سلمٰی رضی اللہ عنہا کی طرف پیغام بھیج کر انہیں بلایا اور پھر ان سے بھی یہی درخواست کی۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ۴۴ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام میں وفات پائی۔[1]

۵۔ ام الحکم بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی یہ بیٹی ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ (الممتحنة: ۱۵) "اور کافر عورتوں کی عصمتیں روک کر نہ رکھو۔" کے نزول کے وقت عیاض بن غنم فہری کے نکاح میں تھیں، اس نے اسی وقت اس سے علیحدگی اختیار کرلی اور پھر عبداللہ بن عثمان ثقفی سے نکاح کرلیا۔[2]

۶۔ عزہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا

ابن شہاب نے رضاعت کے بارے میں ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ان سے مروی صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ کو میری بہن میں کوئی دلچسپی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: میں اسے کیا کروں گا؟ انہوں نے کہا: آپ اس سے نکاح کرلیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم یہ پسند کرتی ہو؟ انہوں نے جواب دیا: میں آپ کے گھر میں اکیلی تو نہیں ہوں، میں چاہتی ہوں کہ اس خیر میں میری بہن بھی شراکت دار بنے۔[3]

یہ سن کر آپ نے صراحتاً فرمایا کہ وہ میرے لیے حلال نہیں ہے،[4] اس لیے کہ اسلام میں بیک وقت دو بہنوں کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔[5]

نبی کریم نے جب ۶ھ میں ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اس وقت ان کی عمر تینتیس برس تھی۔ امام ذہبی فرماتے ہیں جب خالد بن سعید رضی اللہ عنہ انہیں حبشہ سے مدینہ منورہ لے کر آئے اس وقت ان کی عمر تیس سال سے کچھ زائد تھی،[6]

اور ان کی وفات ۴۴ھ میں ہوئی۔[7]

۷۔ امیمہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہما

ابن قتیبہ نے مختصراً ذکر کیا ہے کہ اس نے ابوسفیان بن حویطب بن عبد العزی اور جویریہ کو جنم دیا۔[8]

۵۔ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کی بیویاں اور اولاد

۱۔ میسون بنت بحدل الکلبی:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس بیوی نے ان کے بیٹے یزید کو جنم دیا۔ اس نے ان کی ایک بیٹی کو بھی جنم دیا جس کا نام امۃ رب المشارق تھا اور جس کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔[1]

معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی اس بیوی کا بڑا احترام کرتے تھے مگر وہ اس دیہی چراگاہ کے لیے ہمیشہ بے چین رہتی جہاں اس نے بچپن گزارا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں اور ان کی سادہ زندگی کو یاد کرتی، اسے محلات کی زندگی اور ان میں موجود غلاموں اور لونڈیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک دن جب اسے اپنے گاؤں، اس کی مٹی اور وہاں کے لوگوں کی شدت کے ساتھ یاد آئی تو وہ ٹھنڈی آہیں بھر کر رونے لگی۔ جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو وہ یہ اشعار پڑھنے لگی:

لبيت تخفق الأرواح فيه

أحبّ إليّ من قصر منيف

وبكر يتبع الأظعان سبقاً

أحبّ إليّ من بَغْلٍ زفوف

وكلب ينبح الطّراق عني

أحبّ إليّ من قطٍ أليف

ولبسُ عباءةٍ وتقرّ عيني

أحبّ إليّ من لبس الشفوف

وأكل كسيرة في كِسُر بيتي

أحبّ إليّ من أكل الرّغيف

وأصواف الرّياح بكل فج

أحبّ إليّ من نقر الدفوف

وخِرق من بني عمي نحيف

أحبّ إليّ من عِلج كليف

خشونة عيشي في البدو أشهى

إلى نفسي من العيش الطّريف

فما أبغي سوى وطني بديلاً

فحسبي ذاك من وطن شريف

جب معاویہ اس کے پاس آئے تو ان کی ایک لونڈی نے انہیں اس سے آگاہ کیا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے اسے یہ اشعار پڑھتے ہوئے خود سنا تو فرمانے لگے: بحدل کی بیٹی نے تو مجھے چارہ کھانے والا جنگلی گورخر بنا دیا ہے۔ اسے میری طرف سے طلاق ہے۔ اسے بتاؤ کہ محل میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب اسی کی ملکیت ہے۔ پھر آپ نے اسے گاؤں میں اس کے گھر والوں کے پاس بھیج دیا۔ وہ اپنے بیٹے یزید کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ چونکہ وہ بادیہ میں پروان چڑھا تھا لہٰذا وہ بڑا فصیح اللسان تھا۔[1]

بغدادی رحمہ اللہ نے خزانۃ الادب میں ذکر کیا ہے کہ" جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے طلاق دی تو کہنے لگے: تو ہمارا ساتھ چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اس نے جواب دیا: جب ہم ایک ساتھ تھے تو خوش نہیں تھے اور اب جب ہم جدا ہو رہے ہیں تو اس جدائی کا کوئی غم نہیں ہے۔"[2]

۲۔ فاختہ بنت قرظہ

ان کی دوسری بیوی کا نام فاختہ بنت قرظہ بن عبد عمرو بن نوفل بن مناف ہے۔ اس نے ان کے لیے عبد الرحمن اور عبد اللہ کو جنم دیا۔ عبد اللہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے کمزور تھا اور اس کی کنیت ابو الخیر تھی۔ جبکہ عبد الرحمن کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔[3]

۳۔ کنود بنت قرظہ

ان کی بیویوں میں کنود بنت قرظہ کا نام بھی آتا ہے۔ یہ فاختہ بنت قرظہ کی بہن تھی جس سے انہوں نے اسے طلاق دینے کے بعد شادی کی تھی۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے قبرص فتح کیا اس وقت یہ خاتون ان کے ساتھ تھی۔[4]

۴۔ نائلہ بنت عمارۃ کلبیہ

معاویہ رضی اللہ عنہ نے نائلہ بنت عمارۃ کلبیہ کے ساتھ بھی شادی کی مگر اسے جلد ہی طلاق دے دی تھی۔[5]

معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیٹیاں:

۱۔ رملہ، اس سے عمرو بن عثمان بن عثمان رضی اللہ عنہ نے شادی کی۔[6]

۲۔ ہند، اس سے عبد اللہ بن عامر نے شادی کی۔[7]

۳، ۴، ۵۔ عائشہ، عاتکہ اور صفیہ۔[8]

۶۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام اور ان کے فضائل

معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اپنے باپ اور بھائی یزید کے ساتھ مسلمان ہوئے۔[1] مشہور روایت تو یہی ہے مگر ان سے ان کا یہ قول بھی مروی ہے کہ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر ۷ھ میں مسلمان ہوا مگر میں نے اسے اپنے باپ سے مخفی رکھا، جب انہیں کچھ دیر بعد اس کا علم ہوا تو وہ مجھ سے کہنے لگے: تمہارا بھائی یزید تم سے بہتر ہے جو اپنی قوم کے دین پر کاربند ہے۔ اس پر میں نے ان سے کہا: مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے موقع پر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اس وقت میں آپ کی تصدیق کر چکا تھا۔ پھر جب آپ فتح مکہ کے موقع پر شہر میں داخل ہوئے تو میں نے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کر دیا پھر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے خوش آمدید کہا اور میں آپ کی خدمت میں رہ کر کتابت کرنے لگا۔[2]

سیرتِ امیر معاویۃ رضی اللہ عنہ

معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ حنین میں شریک ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مال غنیمت کے ایک سو اونٹ اور چالیس اوقیہ سونا دیا۔[3]

علماء نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعدد فضائل کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قرآن مجید کے حوالہ سے:

معاویہ رضی اللہ عنہ نے غزوہ حنین میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (التوبۃ: ۲۶)

"پھر اللہ نے اپنی تسکین اپنے نبی اور مومنوں پر اتاری اور اپنے وہ لشکر بھیجے جو تم دیکھ نہیں رہے تھے، اور کافروں کو پوری پوری سزا دی، ان کفار کا یہی بدلہ تھا۔" چونکہ آپ اس غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے، لہٰذا آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے سکینت نازل کی۔[4] اسی طرح ان کا شمار ان لوگوں میں بھی ہوتا ہے جن کے ساتھ اس نے حسنیٰ کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد باری ہے:

﴿..لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝﴾ (الحدید: ۱۰)

"تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ دوسروں کے برابر نہیں بلکہ ان سے بہت بڑے درجے کے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے اور اللہ نے سب سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے۔" ان سے الحسنیٰ کا وعدہ اس لیے ہے کہ انہوں نے غزوہ حنین وطائف میں شرکت کی اور باقاعدہ طور سے دشمنان اسلام سے جنگ لڑی۔[1]

۲۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے:

۱: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے یہ دعا کی:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا وَاهْدِ بِهٖ))[2]

"یا اللہ! انہیں ہدایت دہندہ اور ہدایت یافتہ بنا اور انہیں ذریعہ ہدایت بنا دے۔"

ان کے حق میں آپ کی ایک دوسری دعا کے الفاظ ہیں:

((اَللّٰھُمَّ عَلِّمْ مُعَاوِیَۃَ الْکِتَابَ وَ الْحِسَابَ وَقِہِ الْعَذَابَ)) [3]

"اے اللہ! معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو حساب و کتاب سکھا اور انہیں عذاب سے بچا۔"

ب: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک دفعہ میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے میں آپ کو دیکھ کر پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: "جاؤ اور معاویہ کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔" میں نے انہیں واپس آکر بتایا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا اَشْبَعَ اللّٰہُ بَطْنَہٗ)) [4]

"اللہ اسے سیر شکم نہ کرے۔" اس حدیث کے تحت امام نووی رقمطراز ہیں: امام مسلم کا اس حدیث کو اس باب[5] کے تحت ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بد دعا کو متضمن نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے۔[6] ابن عساکر مذکورہ بالا حدیث کے تحت لکھتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں وارد احادیث میں سے یہ صحیح ترین حدیث نبوی ہے۔ اس کے بعد مقام صحت ((اَللّٰھُمَّ عَلِّمْ مُعَاوِیَۃَ الْکِتَابَ))اور پھر((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ ہَادِیًا مَھْدِیًّا)) [7] کا ہے۔ اسی حدیث کے تحت امام ذہبی فرماتے ہیں: کہا جاسکتا ہے کہ یہ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب پر مشتمل ہے، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "میرے اللہ! میں جس پر لعنت کروں یا اسے برا کہوں تو اسے اس کے حق میں پاکیزگی اور رحمت بنا دینا۔"[1] شیخ ناصر الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ایک فرقہ اس حدیث کو معاویہ رضی اللہ عنہ کو مطعون کرنے کے لیے ناجائز طور پر استعمال کرتا ہے، حالانکہ اس سے ان کے مذموم عزائم کو کوئی مدد نہیں ملتی۔ پھر آخر انہیں مطعون کرنے کا جواز بھی کیا ہے۔ وہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے۔"[2] یہ بھی کہا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "اللہ اسے سیر شکم نہ کرے۔" ایسا کلمہ ہے جسے عرب اس کے لغوی معنی میں استعمال نہیں کرتے۔ جیسا کہ یہ کلمات: قاتلہ اللّٰہ و ما اکرمہ، ویل امہ و ابیہ ما اجودہ، و غیرہما... [3]

ج: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ محترمہ ام حرام بنت ملحان کہتی ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سو گئے۔ جب آپ نیند سے بیدار ہوئے تو مسکرا رہے تھے۔ میں نے مسکرانے کی وجہ پوچھی، تو آپ نے فرمایا: میری امت کے کچھ لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا گیا وہ سمندر میں شامی تختوں پر بیٹھے بادشاہوں کی طرح سفر کریں گے۔ میں نے کہا: دعا فرمائیں اللہ مجھے بھی ان لوگوں میں شامل فرمادے۔ آپ نے اس کے لیے دعا فرمائی اور پھر دوبارہ سو گئے۔ آپ پھر دوبارہ مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے تو ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا نے وہی پہلے والا سوال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وہی جواب دیا، انہوں نے دوبارہ پہلے والی دعا کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا: تم پہلے والوں میں سے ہو۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ ام حرام بنت ملحان اپنے شوہر عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے ساتھ سمندر کے جہادی سفر پر روانہ ہوئیں، معاویہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں جہاد کرنے

کے لیے سمندری سفر پر روانہ ہونے والا یہ پہلا لشکر تھا۔[4] جب یہ لشکر واپس آنے کے لیے روانہ ہوا تو انہیں سواری پر سوار کیا گیا، سواری نے انہیں گرا دیا جس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔[5]

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خواب کے ضمن میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے کچھ لوگوں کو سمندری جہادی سفر پر روانگی کے منظر کو دیکھ کر مسکرانا انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے مترادف اور ان کے مقام و مرتبہ پر خوشی کا اظہار تھا۔[6]

د: ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:" میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے آپ کے یہ الفاظ سماعت کیے: "میری امت کا پہلا لشکر جو سمندری جہاد کے سفر پر روانہ ہو گا اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔" یہ سن کر میں نے دریافت کیا: کیا میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں گی؟ آپ نے فرمایا: "ان لوگوں میں تم بھی شامل ہو۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: "میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر میں جہاد کرے گا اس کی مغفرت فرما دی گئی ہے۔"[1] میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ان میں میرا بھی شمار ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: "نہیں"[2] مہلب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت بیان فرمائی گئی ہے، اس لیے کہ سب سے پہلے انہوں نے ہی سمندر میں جہادی سفر کیا تھا۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ نہ صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے[4] بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مختلف قبائل کے زعماء کو خطوط بھی لکھا کرتے تھے۔[5] کاتب وحی ہونے کے ناطے انہیں آنحضرت کا خصوصی قرب حاصل تھا۔ ان کے لیے کتابت وحی کے اعزاز کا یہ عرصہ فتح مکہ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کو محیط ہے جس کا ضروری نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست استفادہ کا سنہری موقع ملا۔[6]

۷۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنا

معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست روایت کرنے کا شرف عظیم بھی حاصل ہے جس کی وجہ فتح مکہ کے بعد ان کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلسل ہم نشینی ہے۔ یاد رہے کہ فتح مکہ کے موقع پر ان کی عمر تقریباً اٹھارہ برس تھی۔[7] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی سسرالی رشتہ داری نیز ان کے کاتب وحی ہونے کے اعزاز نے انہیں جو سنہری موقع فراہم کیا اس نے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست فیض یاب ہونے کا بھرپور موقع فراہم کیا اور انہوں نے آپ سے ایک سو تہتر روایات اخذ و نقل کیں۔[8] ان میں سے چار بخاری و مسلم، چار بخاری اور پانچ مسلم نے روایت کی ہیں۔[9] ان میں سے چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں: ا۔ وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور ابن عامر کے پاس آئے، ان کے آنے پر ابن عامر تو کھڑے ہو گئے مگر ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے ایسا نہ کیا۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: "جو شخص اس بات کو پسند کرے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوا کریں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔"[10]

۲۔ آپ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین میں سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔"[1]

۳۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ مسجد میں قائم ایک حلقہ میں آئے اور ان سے پوچھا: تمہیں کس چیز نے بٹھا رکھا ہے؟ انہوں نے کہا: ہم اللہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا: کیا تمہیں واقعی اس چیز نے بٹھار کھا ہے؟ انہوں نے اس کا جواب اثبات میں دیا تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے تم سے قسم، تم پر تہمت لگانے کے لیے نہیں لی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر میں قریب تھا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ مگر میں نے اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم روایات نقل کی ہیں، ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حلقہ میں تشریف لائے اور ان سے دریافت فرمایا: تمہیں کس چیز نے بٹھار کھا ہے؟ انہوں نے بتایا: ہم ادھر بیٹھے اللہ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس بات پر اس کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ اس نے ہمیں اسلام کا راستہ دکھایا اور آپ کی صورت میں ہم پر احسان فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم، کیا واقعی تمہیں اس چیز نے بٹھایا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم ہمیں اسی چیز نے بٹھایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے تم پر تہمت لگانے کے لیے تم سے قسم نہیں لی ہے۔ میرے پاس جبریل آئے اور انہوں نے مجھے خبر دی کہ اللہ تمہاری وجہ سے فرشتوں پر فخر کر رہا ہے۔[2]

۴۔ معبد جہنی کہتے ہیں: اگرچہ معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم احادیث روایت کیا کرتے تھے مگر وہ حدیث ہر جگہ بیان کیا کرتے تھے: ''اللہ جس شخص کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ یقیناً یہ مال شیریں اور تر و تازہ ہے جو شخص اسے اس کے حق کے ساتھ لے گا اس کے لیے اس میں برکت پیدا کر دی جائے گی، ایک دوسرے کی مدح سرائی سے بچو یہ ذبح کرنے کے مترادف ہے۔''[3]

۵۔ ان سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن مؤذنوں کی گردنیں سب لوگوں سے لمبی ہوں گی۔''[4]

۶۔ آپ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شراب نوشی کرنے والے کو کوڑے مارو، دوبارہ ایسا کرنے پر پھر کوڑے مارو، تیسری بار شراب نوشی کرے تو پھر کوڑے مارو اور چوتھی دفعہ یہی کام کرے تو اسے قتل کر دو۔''

۷۔ مجاہد اور عطاء ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ معاویہ نے انہیں خبر دی کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے قینچی سے اپنے بال کاٹے۔ ہم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: یہ حدیث ہمیں صرف معاویہ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ سے پہنچی ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا: معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت نہیں لگائی۔[5]

۸۔ آپ نے مدینہ منورہ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ''یہ عاشورہ کا دن ہے، اس کا روزہ رکھنا ہم پر فرض نہیں ہے، اگر کوئی روزہ رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے، اور میں روزے سے ہوں۔'' اس پر لوگوں نے بھی روزہ رکھ لیا۔[1]

۹۔ حکم بن نیساء سے مروی ہے کہ انہیں یزید بن جاریہ انصاری نے خبر دی کہ وہ انصار کی ایک جماعت میں بیٹھے تھے کہ ان کے پاس معاویہ رضی اللہ عنہ آئے اور ان سے ان کی گفتگو کے بارے دریافت کیا، انہوں نے کہا: ہم انصارِ مدینہ کے بارے گفتگو کر رہے تھے۔ یہ سن کر انہوں نے فرمایا: کیا

میں تم لوگوں کو وہ حدیث نہ سناؤں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت کی ہے؟ انہوں نے کہا: امیر المومنین! ضرور سنائیں۔ وہ گویا ہوئے: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرمارہے تھے: "جو شخص انصار سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو انصار سے بغض رکھے گا اللہ اس سے بغض رکھے گا۔"[2]

۱۰۔ ابو صالح معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص امام کے بغیر مرا وہ جاہلیت کی موت مرا۔"[3]

۱۱۔ محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں: میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے سنا وہ کہہ رہے تھے: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نماز سے سلام پھیرنے کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ۔))[4]

"یا اللہ! جو کچھ تو عنایت فرمائے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جو کچھ تو روک دے وہ کوئی دے نہیں سکتا، اور دولت والے کو تیرے بالمقابل دولت کوئی کام نہیں دے سکتی۔"

۱۲۔ معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس بندہ مومن کو اس کے جسم میں کوئی تکلیف پہنچے گی اللہ اس کے بدلے اس کے گناہ معاف فرمادے گا۔"[5]

۱۳۔ معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر غالب رہے گی، اس کے مخالفین اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے گا اور وہ لوگوں پر حاوی ہوں گے۔"[6]

۱۴۔ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص اپنی نماز میں کچھ بھول جائے وہ بیٹھنے کی حالت میں دو سجدے کرے۔"[1]

۱۵۔ انہی سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔"[2]

۱۶۔ انہی سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت سے ایک جماعت اللہ کے حکم سے ہمیشہ حق پر قائم رہے گی۔ انہیں بے یار و مددگار چھوڑنے والا یا ان کی مخالفت کرنے والا ان کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے گا اور وہ اس وقت لوگوں پر حاوی ہوں گے۔" یہ سن کر مالک بن یمار سکسکی کھڑا ہو کر کہنے لگا: امیر المومنین! میں نے معاذ بن جبل سے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ ان سے مراد اہل شام ہیں۔ یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے کہا: مالک کا خیال ہے کہ اس نے معاذ بن جبل سے سنا کہ اس سے مراد اہل شام ہیں۔[3]

۱۷۔ ایک دفعہ معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرا رہے تھے کہ اس دوران آپ نے فرمایا: معاویہ! اگر تمہیں حکومت ملے تو اللہ سے ڈرنا اور عدل و انصاف سے کام لینا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: اس کے بعد میں ہمیشہ یہ خدشہ محسوس کرتا رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے مجھے آزمائش میں ڈالا جائے گا، یہاں تک کہ ایسا ہو کر ہی رہا۔[4]

۱۸۔ ابو عامر عبداللہ بن لحی سے مروی ہے کہ ہم نے معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما کے ساتھ حج کیا۔ جب ہم مکہ مکرمہ پہنچے تو وہ ظہر کی نماز کے بعد کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہود و نصاریٰ بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے تھے جبکہ میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، یہ تمام فرقے جہنمی ہوں گے بجز ایک کے، اور وہ جماعت ہے، میری امت میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن میں نفسانی خواہشات اس طرح سرایت کر جائیں گی جس طرح سگ گزیدہ آدمی میں سرایت کر جاتا ہے، وہ اس کی ایک ایک رگ اور ایک ایک جوڑ کو متاثر کر جاتا ہے، اللہ کی قسم! اے گروہِ عرب! اگر تم اپنے نبی کی تعلیمات و ہدایات کو نہیں اپناؤ گے تو دوسرے بطریق اولیٰ انہیں اپنالیں گے۔[5]

۸۔ معاویہ رضی اللہ عنہ سے متعلق غیر صحیح اور باطل روایات

ا۔ غیر صحیح احادیث:

ابن عساکر نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ضمن میں ضعیف اور باطل روایات کی طویل فہرست پیش کی ہے ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں: [1]

ا: ملاحظہ ہو سے مرفوعاً مروی ہے کہ معاویہ اپنے حلم و حوصلہ اور میرے رب کے کلام کے امین ہونے کی وجہ سے نبی بنا کر اٹھائے جانے کے قابل ہیں۔[2]

ب: ابو موسیٰ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوا۔ جب یہ سلسلہ رک گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ کو طلب کیا، جب انہوں نے آیۃ الکرسی کی کتابت کر لی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاویہ اللہ تیری مغفرت فرمائے تو قیامت کے روز کس قدر میرے قریب ہو گا۔[3]

ت: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جبریل امین سونے کی قلم لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! اللہ فرماتا ہے: میں یہ قلم عرش کے اوپر سے معاویہ کو تحفہ کے طور پر دے رہا ہوں، انھیں حکم دیں کہ وہ اس کے ساتھ آیۃ الکرسی لکھیں۔ اس پر زبر زیر ڈالیں اور نکتے لگائیں۔[4]

ث: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب آیۃ الکرسی اتری تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ کو طلب کیا مگر انہیں کتابت کے لیے قلم نہ ملا، اس پر اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو حکم دیا کہ وہ اپنی دوات سے قلم پکڑے، اس پر جبریل قلم لانے کے لیے اٹھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: ''قلم اپنے کان سے پکڑو'' قلم کو دیکھا تو اس پر لکھا تھا: ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' یہ رب کائنات کی طرف سے معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے تحفہ ہے۔[5]

ج: حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ روز قیامت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ انھوں نے نور ایمان کی چادر اوڑھ رکھی ہو گی۔''[6]

ح: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ''میں قیامت کے روز معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو گم نہیں کر پاؤں گا، میں انہیں ستر سال تک دیکھ نہیں سکوں گا، اس کے بعد وہ کستوری کی اونٹنی پر بیٹھ کر آئیں گے۔ میں پوچھوں گا:

تم کہاں کھو گئے تھے؟ وہ جواب دیں گے: میں عرش کے نیچے ایک باغ میں تھا۔'' خ: ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے: ''معاویہ رضی اللہ عنہ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں، مجھ سے تمھاری ملاقات جنت کے دروازے پر ہو گی۔[1]

امام ذہبی مندرجہ بالا اور ان جیسی دیگر احادیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ان احادیث کا موضوع اور من گھڑت ہونا بالکل واضح ہے۔[2] واللہ اعلم امام شوکانی نے ان میں سے زیادہ تر احادیث کو اپنی کتاب ''**الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة**'' میں ذکر کیا ہے۔[3] ان میں سے ایک حدیث کو ذکر کرنے کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں: اس کے بعد ابن عساکر نے بہت ساری موضوع احادیث کو ذکر کیا ہے۔[4] مگر تعجب ہے کہ انہوں نے اپنے حفظ و اطلاع کے باوجود ان کی نکارت اور ضعف کے بارے میں آگاہ نہیں کیا۔[5]

۲۔ باطل احادیث:

ابن جوزی فرماتے ہیں کہ'' حامل سنت کے دعوے دار بعض لوگوں نے تعصب سے کام لیتے ہوئے معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں کئی احادیث وضع کر ڈالیں جس سے مقصود رافضیوں کو غضب ناک کرنا تھا، اس لیے کہ انہوں نے متعصبانہ انداز میں ان کی مذمت میں وضع احادیث کا ارتکاب کیا تھا۔ ہمارے نزدیک ان دونوں گروہوں نے قابل نفرت غلط کاری کا مظاہرہ کیا۔''[6]

ان کی مذمت میں وضع کردہ چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں: ا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب جس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو میری سنت کے علاوہ کسی اور چیز پر مرے گا۔ اس کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ ادھر آ گئے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ بھی سماعت نہ کیا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قائد اور اس کے زیر قیادت شخص پر لعنت کرے، یعنی اس دن جب بدکردار لوگ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوں گے۔[7]

یہ حدیث باتفاق محدثین موضوع اور من گھڑت ہے۔ حدیث کی کسی بھی معتبر کتاب میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے اور نہ اس کی سند ہی معروف ہے۔[8]

ہم معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت کے اس پہلو سے بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ بڑے ہمت و حوصلہ کے مالک تھے، جو لوگ ہمیشہ ان کے درپے آزار رہے وہ انہیں کھلے دل سے برداشت کرتے رہے، اپنی سیرت کے اس روشن ترین پہلو کے پیش نظر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت کریں جبکہ وہ ان کے دینی اور دنیوی مقام و منصب سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کے ہر معاملہ میں محتاج بھی۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننا گوارا نہیں کرتے جبکہ وہ حکمران ہونے کے باوجود ان لوگوں کی باتیں بھی کھلے دل سے سنا کرتے تھے جو ان کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں سب وشتم کیا کرتے تھے۔ پھر اگر وہ ایسے ہی تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کاتب وحی کیوں مقرر فرمایا؟

۳۔ عہد رسول اللہ میں بنو امیہ کا کردار:

دعوت اسلامیہ کے آغاز ہی سے بنو امیہ کے بہت سارے لوگ مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ انہوں نے راہ اسلام میں گرانقدر قربانیاں پیش کیں اور ان میں سے بعض حضرات نے ہجرت حبشہ کی سعادت بھی حاصل کی۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر جب بنو امیہ کے تمام لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خوش آمدید کہا اور ان کے قبول اسلام پر دلی خوشی کا اظہار کیا۔ بڑے بڑے اہم معاملات میں ان پر اعتماد کیا اور انہیں ان کے مناسب حال مقام و مرتبہ پر فائز فرمایا تاکہ ان کی مساعی اور اہلیت سے استفادہ کیا جاسکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو جس اعزاز سے نوازا وہ اہالیان مکہ میں سے کسی دوسرے کا مقدر نہ بن سکا۔ اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی بھی ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے امن حاصل ہو گا۔''[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو عطا کردہ یہ عظیم اعزاز اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے زعما اور بااثر لوگوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو نجران کا عامل مقرر کیا اور ان کے بیٹے معاویہ رضی اللہ عنہ کو کاتب وحی الٰہی کے منصب پر فائز فرمایا۔[2] صحیح مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ مجھے کسی علاقے کا امیر مقرر کیا جائے تاکہ میں کفار کے ساتھ اس طرح جنگ کر سکوں جس طرح مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ ان کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ میرے بیٹے معاویہ رضی اللہ عنہ کو کاتب وحی مقرر کر دیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا۔[3] فتح مکہ کے بعد جس شخص کو اس کا پہلا امیر مقرر کیا گیا تھا وہ بھی بنو امیہ کا ہی ایک فرد تھا، اور وہ تھا عتاب بن اسید بن ابو العاص بن امیہ بن عبد شمس۔ ابن اسحاق زید بن اسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ کا عامل مقرر کیا تو اس کا روزینہ ایک درہم مقرر فرمایا۔ اس پر وہ کہنے لگا: لوگو! جو ایک درہم پر بھوکا رہے اور وہ اسے بھوکا ہی رکھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا روزینہ ایک درہم مقرر فرمایا ہے۔ اب مجھے کسی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔[1] اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن سعید بن العاص کو خیبر، وادی القری، تیماء اور تبوک کا والی مقرر فرمایا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اس منصب پر قائم رہے۔[2] آپ نے ابان بن سعید بن العاص کو بحرین کا عامل مقرر فرمایا وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت تک اس منصب پر کام کرتے رہے۔[3] آپ نے

حکم بن سعید بن العاص کو سوق مکہ[4] اور ان کے بھائی خالد بن سعید کو صنعاء کا عامل مقرر فرمایا۔[5] خلاصہ کلام یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک بنو امیہ کے سر کردہ لوگ ولایت، کتابت اور تحصیل داری جیسے اعلی مناصب پر فائز تھے، اور ان عہدوں پر ان کی تعداد دوسرے تمام قبائل کے افراد سے زیادہ تھی۔[6] اور یہ ان کی امانت و دیانت اور بہترین انتظامی صلاحیتوں کی دلیل ہے۔[7]

رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: ((اِذْہَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ))"جاؤ کہ تم آزاد ہو"[8] تو بعض لوگوں نے ان کلمات کو گالی قرار دیتے ہوئے صرف بنو امیہ کی پیشانی پر چپکا دیا اور انہیں یہ کہہ کر عار دلانے لگے کہ وہ آزاد کردہ اور آزاد کردہ لوگوں کے بیٹے ہیں۔ مگر وہ اپنے خبث باطن کی وجہ سے یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ مشرف باسلام ہوئے بلکہ ان کا اسلام بہت خوب بھی رہا۔ ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی اسلام کی نصرت وحمایت میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور بعد ازاں خلفاء راشدین کے دور مسعود میں بھی فتوحات اسلامیہ کے دوران بھی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔[9]

ہم اس جگہ وصف طلقاء کے بارے میں چند نکات کی طرف اشارہ کرنا چاہیں گے: ۱۔ یہ تہمت شدید گروہی اختلافات کے زمانہ کی پیداوار ہے۔ جب خلافت عثمانیہ کے آخری ایام میں بنو امیہ کے خلاف طوفان بدتمیزی برپا کر دیا گیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی قسمت کا ستارہ بلندیوں کو چھونے لگا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا اختلاف سنگین صورت حال اختیار کر گیا تو اس دوران بنو امیہ کی طرف سے ان پر یہ تہمت لگا دی گئی کہ یہ لوگ ضعیف الایمان ہیں اور انہوں نے محض مالی مفادات کے لیے اور اپنی جانوں کے تحفظ کے لیے اسلام قبول کیا تھا تاکہ اس طرح وہ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف سازشوں کے جال بچھا سکیں اور اپنے ذاتی مفادات کے حصول کو یقینی بنا سکیں۔ ۲۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار طلقاء میں نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے قبل اس وقت مسلمان ہو گئے تھے جب آنحضرت اور ان کے ہمراہ آنے والا لشکر اسلام مکہ مکرمہ سے باہر مر الظہران کے مقام پر خیمہ زن تھا اور جب کہ ان کے اسلام کا نور ان کی قوم کے افراد کو صلح و آشتی کا پیغام دے رہا تھا۔ رہے، ان کے بیٹے معاویہ رضی اللہ عنہ تو بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی فتح مکہ سے قبل مسلمان ہو چکے تھے مگر انہوں نے بھی اس وقت بعض دوسرے لوگوں کی طرح اپنے اسلام کو مخفی رکھا۔ مروی ہے کہ وہ عمرۃ القضاء کے دن یا صلح حدیبیہ کے سال مخفی طور سے مسلمان ہو گئے تھے۔[1] مورخین کی طرف سے انہیں طلقاء کی فہرست میں شامل کرنے کی وجہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا فتح مکہ کے قریب مسلمان ہونا ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ وہ مکہ مکرمہ کے سردار تھے اور ان کا اسلام اہل مکہ کے اسلام کے ساتھ مربوط تھا، مزید براں ان کے اسلام قبول کرنے کا چرچا فتح مکہ کے بعد ان آزاد کردہ لوگوں کے ساتھ ہوا تھا۔

۳۔ وصف طلقاء مذمت کا متقاضی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اور انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آزادی کا پروانہ عطا فرمایا۔ ان لوگوں کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کا شمار بہترین مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابوجہل، یزید بن ابوسفیان، حکیم بن حزام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد ابوسفیان بن حارث۔ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیہودہ گفتگو کیا کرتا تھا۔ مگر بعد ازاں اس کا اسلام بہت خوب رہا۔ ان

لوگوں میں عتاب بن اسید بن شامل تھے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد اس کا والی مقرر فرما دیا تھا۔ علاوہ ازیں کتنے ہی ایسے لوگ تھے جن کا اسلام بہت خوب اور قابل تعریف رہا تھا۔

۴۔ مشرف باسلام ہونے والوں کے بارے میں اسلامی نکتہ نظر یہ ہے کہ اسلام ماقبل کے تمام گناہوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے لیے میدان عمل کو کھلا چھوڑ دیتا ہے اور پھر عظیم تر مقاصد کے حصول کے لیے انہیں اس میں آزادانہ کام کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور اس کے لیے وہ لوگوں کو ان کے مقام و مرتبہ پر فائز کرتا ہے۔ اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ جو لوگ قبل از اسلام اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ دین میں سوجھ بوجھ پیدا کر لیں اور دینی شعور حاصل کر لیں۔ یہ انہیں سنہری تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کو ان کے اسلام کے متاخر ہونے نے انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اعلیٰ مقام و مرتبہ کے حصول سے باز نہیں رکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کو سیف اللہ کے لقب سے ملقب کیا اور عمرو بن العاص کو ذات السلاسل کا امیر مقرر فرما کر بھیجا۔ مگر اس کے باوصف مخلصانہ انداز میں اسلام کی طرف سبقت لے جانے والے اہل ایمان کے اعلیٰ ترین اور عظیم ترین مقام و مرتبہ کی پورے طور پر حفاظت کی اور اسے کسی بھی صورت متاثر نہیں ہونے دیا۔ ان سابقین الی الاسلام میں بنو امیہ کے لوگ بھی شامل تھے اور دوسرے بھی۔ جس طرح کہ ان آزاد کردہ لوگوں میں بھی بنو امیہ وغیرہم کے متعدد لوگ شامل تھے۔[2]

دوسری بحث:

اموی اور معاویہ رضی اللہ عنہ ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں

ا... ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کو مشکل ترین حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ پیروان اسلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کے طور پر بالاتفاق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو انہوں نے مسلمانوں کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ مرتدین سے مسلسل جنگ کرنے کے بعد انہیں اسلام اور جماعت کے ساتھ وابستگی کے لیے مجبور کر دیا اور اس کے بعد رومیوں اور ایرانیوں کے شہروں میں فتوحاتِ اسلامیہ کا آغاز ہوا۔

مرتدین کے خلاف جنگ کرنے کے حوالے سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پہلا خط مکہ مکرمہ کے اموی عامل عتاب بن اسید کے نام لکھا اور اس میں انہیں ہدایت کی کہ وہ اسلام پر ثابت قدم رہنے والے لوگوں کے ساتھ مل کر ان لوگوں کے خلاف کارروائی کریں جو ان کے زیر نگیں علاقوں سے مرتد ہو گئے ہیں، چنانچہ عتاب نے تہامہ میں ان کا مقابلہ کیا اور ان کے خلاف بھرپور کامیابی حاصل کی۔[1] پھر مکہ اور اس کے گرد و نواح سے پانچ سو لوگوں پر مشتمل ایک لشکر تیار کیا اور اس کا امیر اپنے بھائی خالد بن اسید کو مقرر کیا اور پھر یمن میں مرتدین کے خلاف مشترکہ کارروائی کی۔[2] اور

حضر موت اور کندہ کے لوگوں کو دائرہ اسلام میں واپس لے آئے۔[3] مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی جنگوں میں لشکر اسلام کے کمانڈر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اپنے لشکر میں شامل مہاجرین کی قیادت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس رضی اللہ عنہ کو سونپی اس دوران زید بن خطاب رضی اللہ عنہ ان کے شریک عمل تھے۔[4] اس جنگ میں ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بڑا شاندار کردار ادا کیا جب جنگ کے آغاز میں مسلمان ادھر ادھر بکھرتے نظر آئے تو ابو حذیفہ نے چلاتے ہوئے کہا: اے اہل قرآن! قرآن کو اپنے کردار سے مزین کرو اور پھر لڑتے لڑتے جام شہادت نوش فرمایا۔[5] مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی یمامہ کی جنگوں میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے خود شرکت کی۔[6] طلیحہ اسدی کے خلاف لڑی گئی جنگ میں بنو امیہ کے حلیف عکاشہ بن محصن شریک ہوئے۔[1] اور ان کے ایک دوسرے حلیف العلاء الحضرمی نے بحرین میں مرتدین کی طرف سے بھڑکائی گئی جنگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کے عمل میں بھرپور کردار ادا کیا اور آخر کار کامیابی سے نوازے گئے۔[2] ارتدادی جنگوں کے خاتمہ، مرتدین کو دائرہ اسلام میں واپس کرنے اور خلافت راشدہ کی ماتحتی قبول کرنے کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوچ پروان چڑھنے لگی کہ محکوم اقوام کو ان کی ظالم حکومتوں کے پنجہ استبداد سے رہائی دلائی جائے اور انہیں اسلام کی دعوت دی جائے، چنانچہ تاریخ کی زبان میں ایران وروم کے دو محاذوں پر "فتوحات کبریٰ" کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اور ان جنگوں میں بھی بنو امیہ نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ جس سے اس موقف کو مزید تقویت ملتی ہے کہ ان کی اسلام سے بڑی گہری وابستگی تھی اور یہ کہ انہوں نے اس عرصہ کے دوران بڑا اہم اور تاریخی کردار ادا کیا۔ اس عرصہ کی اسلامی فتوحات کی تحریک کے دوران دو امور خاص طور سے ابھر کر سامنے آئے[3]:

ا۔ اس دور کی اسلامی فتوحات کے دوران فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والوں اور اس موقع پر آزاد کردہ لوگوں نے بڑا عظیم کردار ادا کیا۔ ان میں بنو امیہ کے بعض لوگ بھی شامل تھے اور ان کا یہ کردار دو اسباب کی وجہ سے متوقع تھا: ا: سیّدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ کہ اسلام سے مرتد ہو کر دوبارہ حلقہ اسلام میں داخل ہونے والوں سے فتوحات کے دوران ہرگز کوئی تعاون حاصل نہ کیا جائے۔[4] اس کی وجہ صدیق اکبر کا اس بات کا حریص ہونا تھا کہ ان فتوحات اسلامیہ کو دین کی کمزوری کے آثار اور ان لوگوں کی نفسانی شہوات سے صاف رکھا جائے جو دین اسلام کے لیے مخلص نہیں ہیں یا انہوں نے اس کے لیے اپنے مخلص ہونے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ بنابریں ان اشراف وسادات کو یہ شوق دامن گیر ہوا کہ انہیں اسلامی خدمات کے حوالے سے اپنی تقصیر کا ازالہ کرنا اور ان کے جو بھائی ان سے پہلے مسلمان ہو کر عظیم مراتب حاصل کر چکے ہیں ان کی صفوں میں شامل ہونا ہے۔[5]

ب: فتوحات اسلامیہ کے سلسلہ میں شام کے محاذ پر اموی رجال کار کی گراں قدر سرگرمیاں ہیں۔ اس محاذ پر اہل مکہ میں سے فاتحین کی کثیر تعداد بھی ان کے ہم رکاب تھی۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ بات خلیفۃ المسلمین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر تھی جنہیں اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ بنو امیہ، اہل مکہ اور ان عرب قبائل کے درمیان بڑے گہرے تعلقات ہیں جو اس وقت سرزمین شام میں رہائش پذیر ہیں اور جو زمانہ جاہلیت میں مکہ اور شام کے درمیان مسلسل تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے مزید مستحکم ہو گئے تھے اور ان کی تجارت کی زیادہ تر باگ ڈور بنو امیہ کے ہاتھ میں تھی۔[1] اسلامی فتوحات کی جنگوں میں بنو امیہ کی شرکت کا آغاز کافی دیر قبل ہی ہو چکا تھا اور وہ اس طرح کہ ولید بن عقبہ بن ابو معیط نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ عراق کی ابتدائی فتوحات میں شرکت کی۔ وہ ہرمز کے قتل کے واقعہ میں بھی ان کے ساتھ تھے اور بعد ازاں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں مال غنیمت، فتح کی بشارت اور ایرانیوں کی طرف سے نئی صف بندی پر مشتمل خبر کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا۔[2] مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد خلیفۃ المسلمین نے انہیں عیاض بن غنم کی مدد کے لیے ان کے پاس بھیجا جنہیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے شمال کی

طرف سے عراق فتح کرنے کے لیے مامور کیا تھا۔ اس وقت انہوں نے دومۃ الجندل کا محاصرہ کر رکھا تھا اور انہیں اس کی فتح کے لیے بڑی مشکلات کا سامنا تھا، ولید نے انہیں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مدد حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے ان سے اس کی درخواست کی تو اسے قبول کر لیا گیا۔ اور پھر ان دونوں نے مل کر دومۃ الجندل کو فتح کر لیا۔[3] اس کے بعد خلیفۃ المسلمین نے انہیں دومۃ الجندل سے متصل قضاعہ سے نصف صدقات فریضہ وصول کرنے کی تولیت دے دی[4] مگر پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد انہیں جہاد فی سبیل اللہ کرنے کی پیش کش کرتے ہوئے ان کے نام خط لکھا تو انہوں نے اسے قبول کر لیا، چنانچہ آپ نے انہیں شام روانہ کر دیا۔[5]

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے شام کے محاذ پر جنگ کے لیے پہلا پرچم خالد بن سعید بن العاص اموی کو دیا اور پھر انھیں معزول کر کے ان کی جگہ دوسرے اموی یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔[6] یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے لشکر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ وہ پہلا بڑا لشکر تھا جسے خلیفۃ المسلمین نے شام کی طرف روانہ کیا اور اسے شہر کے باہر تک پیدل جا کر الوداع کہا۔[7] پھر اس کے پیچھے مزید تین لشکر بھیجے اور ان کی قیادت عمرو بن العاص، شرحبیل بن حسنہ اور ابوعبیدہ بن جراح کے سپرد کی۔[8] یزید بن ابوسفیان کے بارے میں امام ذہبی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: وہ ان چار امراء میں سے ایک ہیں جنہیں ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے بلایا۔ یزید بن ابوسفیان کو خود خلیفہ نے پرچم دیا اور اس کے قافلہ کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے اسے الوداع کیا اور اسے پند و نصائح سے نوازا۔ اس کی وجہ اس کا عزو شرف اور دین میں کمال تھا۔[9] بعد

ازاں خلیفۃ المسلمین نے جہاد کا شوق رکھنے والے بعض اور لوگوں کو بھی یزید کے لشکر کے ساتھ شامل کر دیا اور ان پر معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کو امیر مقرر فرمایا۔[1] شامی محاذ پر لڑی گئی جنگوں میں ابوسفیان بن حرب بھی شامل تھے اگرچہ وہ اس وقت بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔[2] شام کے جہاد میں خالد بن سعید، ابان بن سعید اور عمرو بن سعید رضی اللہ عنہم بھی شامل رہے اور اعدائے اسلام سے لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے کہہ دیا: شام کا جو علاقہ بھی فتح ہوا وہاں سعید بن العاص کی اولاد سے کوئی نہ کوئی آدمی ضرور شہید ہوا۔[3] جنگ یرموک سے پہلے قائدین لشکر جولان میں جنگ کرنے کے بارے میں ایک مجلس مشاورت میں شریک تھے کہ اس دوران ابوسفیان بن حرب ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں گا کہ قریش کے چند کم سن لوگ میرے گھر میں بیٹھ کر جنگ کے بارے میں گفتگو کریں اور دشمن کے خلاف جنگی پلان تیار کرنے کے لیے باہم مشاورت کریں گے مگر مجھے اس مشاورت میں شریک ہونے کی دعوت بھی نہیں دیں گے۔ یہ سن کر انہوں نے ان کے لیے جگہ خالی کی اور پھر آپ نے ان کے ساتھ مل کر جنگی منصوبہ تیار کیا۔[4] جب جنگ یرموک کی تیاریاں آخری مرحلہ میں داخل ہو گئیں تو فریقین کے قائدین اپنی اپنی سپاہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان کے سامنے آئے۔ اگر ایک طرف رومیوں کے علماء اور پادری انہیں عیسائیت کا واسطہ دے کر میدان جنگ میں داد شجاعت دینے پر اکسا رہے تھے اور انہیں ایک ایسی جنگ میں شرکت کرنے کے لیے ابھار رہے تھے جس کی بعد ازاں مثال پیش کرنا بھی مشکل ہے۔[5] تو مسلمان قائدین اپنی سپاہ کو بڑے دلنشین اور جذبات بھڑکانے والے خطبات سے آمادۂ جنگ کر رہے تھے،[6] بلکہ اسی مقصد کے لیے انہوں نے اپنے بزرگوں میں سے ایک سرکردہ شخص کو متعین کر دیا تھا اور یہ اعزاز حاصل کرنے والی شخصیت کا نام تھا: ابوسفیان بن حرب۔[7]

یقیناً انہیں یہ منصب تفویض کیا جانا دین اسلام کے لیے ان کے صدق و اخلاص کی بہت بڑی دلیل ہے، اس لیے کہ اگر اس وقت قائدین لشکر کے علم میں ان کے اخلاص و وفا کے علاوہ کوئی اور بات ہوتی تو انہیں یہ ذمہ داری تفویض نہ کی جاتی کہ انہوں نے لشکر اسلام کی اسلامی حمیت کو بھڑکانا اور ان کے جذبۂ شجاعت و بسالت کو برانگیختہ کرنا ہے۔ نیز اگر سپاہ اسلام میں ان کے صادق الایمان ہونے کے علاوہ کوئی اور بات ہوتی تو ان پر ان کے اس عمل کے اس قدر اچھے اثرات مرتب نہ ہوتے۔ ذمہ داران لشکر اسلام کی طرف سے ابوسفیان کا انتخاب عملاً قابل تعریف اور لائق ستائش رہا جو اس لشکر کی تشکیل و ترتیب کے مزاج سے ہم آہنگ تھا اور جو اُن اہل مکہ اور دیگر عرب قبائل پر مشتمل تھا جو تاخیر سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے اور جنہیں عرصہ دراز سے اپنے زعیم و قائد ابوسفیان پر مکمل اعتماد تھا۔[1] یہ ذمہ داری نبھانے کے لیے ابوسفیان لشکر اسلام کے سامنے کھڑے ہو کر ان کی دینی حمیت و غیرت کو اس طرح ابھارتے: اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، تم عرب قوم کے محافظ اور اسلام کے معاون و مددگار ہو۔ جبکہ تمہارے دشمن روم کے محافظ اور شرک کے انصار و معاونین ہیں۔ میرے اللہ! یہ دن تیرے دنوں میں سے ایک دن ہے۔ یا اللہ! اپنے بندوں کی نصرت فرما۔[2]

۲... عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں

جب ۱۳ھ میں پہلے خلیفہ اسلام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور ان کی جگہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ منتخب ہوئے تو انہوں نے بنو امیہ پر مکمل اعتماد اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہوں نے نہ تو بنو امیہ کے کسی فرد کو اس کے منصب سے معزول کیا اور نہ کسی پر کوئی اعتراض ہی کیا۔ سب لوگ عمر رضی اللہ عنہ کی سخت مزاجی سے بخوبی آگاہ تھے اور اس امر سے بھی کہ آپ ہمیشہ اپنے عمال اور ذمہ داران کے معاملات کی ٹوہ لگاتے رہتے اور ان کے اعمال و اخبار کی حقیقت سے آشنا رہتے ہیں اور بڑے حزم و احتیاط اور باریک بینی سے ان کا محاسبہ کرتے رہتے ہیں، لہٰذا آپ کے زمانہ خلافت میں ان کا اپنے مناصب پر مسلسل فائز رہنا ان کی امانت و دیانت اور ذمہ داریوں کی کماحقہ ادائیگی پر دلالت کرتا ہے۔ اس دوران یزید بن معاویہ بدستور دمشق کے والی رہے۔ جبکہ شام میں معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کے زیر ولایت علاقہ میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔[3]

۱۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی قسمت کا ستارہ طلوع ہونے لگا:

خلیفۃ المسلمین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں سیاسی اور اداراتی میدان عمل میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی قسمت کا ستارہ طلوع ہونے لگا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب فاروق اعظم نے ۱۵ھ میں انہیں قیساریہ[4] کو فتح کرنے کی ذمہ داری تفویض کی۔[5] انہیں یہ ذمہ داری ایک خط کے ذریعے تفویض کی گئی جس کی عبارت یہ تھی: میں نے تمہیں قیساریہ کو فتح کرنے کی ذمہ داری دی ہے۔ اس کی طرف روانہ ہو جائیں۔ ان پر فتح حاصل کرنے کے لیے اللہ سے نصرت کی درخواست کریں اور بکثرت ''لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم'' پڑھا کریں۔ اللہ ہمارا رب ہے، ہم اسی پر بھروسہ کرتے ہیں وہی ہمارا مولیٰ ہے۔ وہ بڑا اچھا مولیٰ اور بہت اچھا مددگار ہے۔[6]

انہیں اس انتہائی ذمہ دارانہ مہم، میدان عمل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ان کا کڑا امتحان تھا جس میں وہ ہر اعتبار سے کامیاب رہے وہاں لشکر کے ساتھ قیساریہ کی طرف روانہ ہوئے جسے ان کے لیے ان کے بھائی یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے تیار کیا تھا۔ جو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے شام کے ایک والی تھے۔ یہ شہر انتہائی محفوظ تھا اور اس کے باسی بھی بڑے دلیر تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرصہ دراز تک اس کا محاصرہ کیے رکھا اور اس کے شہریوں سے بھی متعدد جھڑپیں ہوئیں۔ اگرچہ حالات بڑے کٹھن تھے مگر وہ اس سے مایوس نہ ہوئے۔ انہوں نے بھی اسے فتح کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا۔ آپ نے اپنی سرتوڑ کوششیں جاری رکھیں یہاں تک اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح سے نواز دیا۔ شہر کو فتح کرنے کی مہم میں اس شہر کے باسیوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور ان کے تقریباً ایک لاکھ لوگ اس جنگ میں مارے گئے۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ نے فتح قیساریہ کی مبارک بادی کا پیغام اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا مال غنیمت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ منورہ ارسال کیا۔[2]

اس فاتحانہ معرکہ کے دوران معاویہ رضی اللہ عنہ نے توفیق ایزدی سے جس عزم صادق اور حسن قیادت کا مظاہرہ کیا اس سے انہیں سب لوگوں کا اعتماد حاصل ہوا۔ چنانچہ دمشق کے امیر اور ان کے بھائی یزید نے شام کے ساحلی علاقوں کو فتح کرنے کی مہم ان کے سپرد کر دی جس کے لیے انہوں نے اپنی بھرپور حربی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔[3] انہوں نے کوئی قلعہ دو دنوں میں فتح کیا اور کوئی چند دنوں میں۔ کبھی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور کبھی صرف تیر اندازی ہی اس کی فتح کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ وہ جس شہر کو بھی فتح کرتے اسے بعض مسلمانوں کے حوالے کر دیتے اور اگر کسی جگہ مزید دستوں کی ضرورت ہوتی تو اس کا بندوبست کرتے۔[4] ڈاکٹر عبدالرحمن شجاع کی رائے میں ملک شام کے شہر مسلمانوں کے یکے بعد دیگرے حملوں کے نتیجے میں سرنگوں ہوتے چلے گئے اس لیے کہ شکست وریخت کے اس عمل نے رومیوں کو جس مقام پر لا کھڑا کیا تھا اس نے ان سے کسی جگہ جم کر لڑنے کی سوچ کو بھی سلب کر لیا تھا۔ ان کی اسی پست ہمتی کے نتیجہ میں بیروت، صیدا، نابلس، لد، حلب اور انطاکیہ ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ شام کے شہروں میں سے قیساریہ وہ آخری شہر تھا جو معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں فتح ہوا اور یہ القدس کی فتح کے بعد کا واقعہ ہے۔[5]

قیساریہ کے محاصرہ کے دوران مسلم سپاہ کے میمنہ (دائیں جانب کا دستہ) کی قیادت حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ایک دفعہ کھڑے ہو کر لوگوں کو نصیحت کرنے لگے اسی دوران آپ نے انہیں جانوں کے نذرانے پیش کرنے اور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی تلقین فرمائی اور پھر دشمن پر بھرپور وار کر کے کئی رومیوں کو موت کی نیند سلا دیا مگر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ اپنی روانگی کی جگہ پر واپس گئے اور اپنے ساتھیوں کو جنگ کرنے کی ترغیب دلائی اور حملہ کے مقاصد کے حصول میں ناکامی پر اپنی شدید حیرت کا اظہار کیا۔ وہ اپنی سپاہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: اے اہل اسلام! میں نقباء میں سے سب سے کم سن تھا پھر اللہ نے مجھے اتنی زندگی عطا فرمائی کہ آج میں تمہارے ساتھ مل کر اس دشمن سے برسرپیکار ہوں۔ واللہ! میں جب بھی مومنین کی جماعت کے ساتھ مل کر مشرکین کی کسی جماعت پر حملہ آور ہوا انہوں نے ہمارے لیے میدان خالی کر دیا اور اللہ نے ہمیں کامیابی سے نواز دیا۔ مگر آج تمہیں کیا ہوا کہ تم لوگوں نے ان مشرکین پر حملہ کیا مگر تم انہیں پسپا نہ کر سکے۔[1] پھر فرمایا: اللہ کی قسم! میں تمہارے بارے میں دو چیزوں سے خائف ہوں: یا تو تم مال غنیمت میں خیانت کے مرتکب ہوئے ہو یا پھر تم اس حملہ کے دوران اللہ کے لیے مخلص نہیں تھے۔[2] انہوں نے انہیں صدق دل کے ساتھ طلب شہادت کی ترغیب دلائی اور انہیں اس بات سے مطلع کیا کہ میں ان کے آگے رہوں گا اور اپنی جگہ پر واپس نہیں جاؤں گا الّا یہ کہ اللہ مجھے فتح سے نوازے یا پھر خلعت شہادت عطا فرما دے۔[3]

پھر جب مسلمانوں اور رومیوں کی مڈ بھیڑ ہوئی تو حضرت عبادہ اپنے گھوڑے سے نیچے اترے اور پیدل ہی دشمن سے لڑنے لگے۔ جب عمیر بن سعد انصاری نے انہیں اس طرح جنگ کرتے دیکھا تو مسلمانوں کو آواز دے کر انہیں ان کے امیر کے اس کردار سے آگاہ کرتے ہوئے ان کی اقتداء کرنے کی تلقین فرمائی۔ پھر انہوں نے رومیوں سے اس طرح جم کر لڑائی کی کہ انہیں شکست فاش سے دوچار کرتے ہوئے انہیں ان کے قلعہ میں دھکیل دیا۔[4] قیساریہ کی فتح اور سواحل دمشق کی فتح میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی کامیابی کے بعد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں اردن کی ولایت سونپ دی۔ یہ ۱۷ھ کا واقعہ ہے۔[5]

۲۔ دمشق، بعلبک اور بلقاء پر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولایت:

۱۸ھ میں یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما عمواس کے طاعون میں فوت ہو گئے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کے بھائی کی جگہ دمشق، بعلبک اور بلقاء کا والی مقرر فرما دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کا حضرت معاویہ کے والد اور ان کی والدہ پر گہرا اثر ہوا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ان کے بیٹے یزید کی وفات پر تعزیت کی تو وہ کہنے لگے: امیر المومنین! آپ نے یزید کی جگہ کس کو والی بنایا؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کے بھائی معاویہ کو، یہ سن کر ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہنے لگے: امیر المومنین! آپ نے صلہ رحمی کا حق ادا کر دیا۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنا منصب سنبھالنے کے بعد کام کا آغاز کیا تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے ان کے نام خط لکھا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی: میرے بیٹے! مہاجرین ہم سے پہلے مسلمان ہو گئے تھے جبکہ ہم نے اسلام قبول کرنے میں تاخیر کر دی جس کی وجہ سے انہیں اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک بلند تر مقام و مرتبہ حاصل ہو گیا۔

جبکہ ہماری تاخیر نے ہمیں اس اعزاز سے محروم کر دیا۔ وہ سابق الاسلام ہونے کی وجہ سے قائد اور سردار بن گئے اور ہم ان کے پیروکار بن کر رہ گئے۔ اب انہوں نے تجھے بڑی اہم ذمہ داری تفویض کی ہے تو ان کی حکم عدولی نہ کرنا۔ اس دوران اگر تم کوئی قابل تحسین کام کرو گے تو اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔[6] اسی طرح ان کی والدہ نے انہیں اس مضمون پر مشتمل خط لکھا: میرے بیٹے! اللہ کی قسم! تیرے جیسے بیٹے کو کسی ماں نے کم ہی جنم دیا ہو گا۔ خلیفۃ المسلمین نے تجھے یہ جو اتنا بڑا منصب عطا کیا ہے تو ان کی اطاعت کرنا، وہ کام تجھے پسند آئے یا نہ آئے۔[1] بعض لوگوں نے اور خاص طور سے ان کے بزرگوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی کم سنی کے باوجود منصب ولایت پر فائز کر دیا جبکہ ان سے بہتر اور بڑی عمر کے لوگ بھی موجود ہیں۔ جب اس کی اطلاع عمر رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انہوں نے اس کا جواز پیش کرتے ہوئے فرمایا: تم لوگ اس کی ولایت کے حوالے سے مجھ پر اعتراض کرتے ہو، حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے: "یا اللہ! اسے ہادی اور مہدی بنا اور اس راہ راست پر رکھنا۔"[2]

۳۔ایک عظیم قافلہ کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ کی آمد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ناپسندیدگی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہیں دوسروں سے بڑھ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ان خوبیوں کا ادراک تھا جن کی وجہ سے وہ قیادت وسیادت کا پورا پورا استحقاق رکھتے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک بڑے جلوس کے ساتھ ان کا استقبال کیا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا: اس بڑے قافلے کے صاحب تم ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں، آپ نے فرمایا: اس امر کے باوجود کہ مجھے تمہارے بارے میں یہ اطلاع ملی ہے کہ ضرورت مند لوگ دیر تک تمہارے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں؟ انہوں نے جواباً کہا: آپ کی یہ اطلاع درست ہے۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ میرا ارادہ تو یہ ہے کہ میں تمہیں ننگے پاؤں چل کر سرزمین حجاز پہنچنے کا حکم دوں۔ اس پر وہ گویا ہوئے: امیر المومنین! ہم جس علاقہ میں رہتے ہیں وہاں دشمن کے جاسوس بڑی کثرت کے ساتھ موجود ہیں، لہٰذا ایسے اقدامات کرنا ضروری ہیں جن سے اسلام اور اہل اسلام کی شان وشوکت کا مظاہرہ ہو اور وہ اس سے مرعوب ہوں۔ اگر آپ مجھے حکم دیں گے تو یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اگر آپ روک دیں گے تو اسے ختم کر دیا جائے گا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تمہارا یہ کہنا درست ہے تو یہ ایک دانشمندانہ بات ہے اور اگر غلط ہے تو پھر یہ ایک ادیب کا دھوکہ ہے۔[3] اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: امیر المومنین! اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہ تو میں تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ یہ سن کر ایک آدمی کہنے لگا: امیر المومنین! اس نوجوان نے تمہاری گرفت سے کتنی خوبصورتی کے ساتھ چھٹکارا حاصل کیا۔ اس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان کی انہی صلاحیتوں کی وجہ سے ہی تو ہم نے انہیں اتنی بڑی ذمہ داری کے لیے پابند کیا ہے۔[4]

ایک روایت میں ہے کہ یہ بات کہنے والے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، جو کہ اس وقت اس عظیم الشان قافلہ میں شامل تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے استقبال کے لیے آیا تھا۔[5] معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ جواب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بڑا گہرا سیاسی تجربہ رکھتے تھے۔ مختلف لوگوں کے احوال وظروف سے بخوبی آگاہ تھے، رعیت کے سیاسی امور کا پورا ادراک رکھتے اور اپنے زیر نگین علاقہ میں امن وامان کی فضا قائم رکھنے کے طور طریقوں سے آشنا تھے۔ ان کی انہی خوبیوں کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی سیاست کو بنظر استحسان دیکھا کرتے تھے اگرچہ وہ ان کی سیاست سے یکسر مختلف تھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا ارشاد سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ آپ ان کی سیاست کے انداز کو پسند کرتے تھے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی تربیت کرنے کے لیے انہیں اکثر پند ونصیحت سے نوازا کرتے اور اس کے لیے کبھی ان پر سختی بھی روا رکھتے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام اسلم سے مروی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ سفید رنگ کے اور بڑے خوبرو تھے۔ وہ ہمارے پاس آئے اور عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر حج پر روانہ ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں دیکھتے تو ان کے حسن وجمال کی وجہ سے بڑے تعجب کا اظہار کرتے اور فرماتے: واہ، واہ، اگر اللہ ہمارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں جمع کر دے تو اس صورت میں ہم سب لوگوں سے بہتر ہوں گے۔ اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: امیر المومنین! ہم بڑے خوشحال علاقہ (شام) میں رہتے ہیں، جہاں جگہ جگہ خوشحالی کے مظاہر دیکھے جاسکتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہارے لیے اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ تم دھوپ کی شدت میں ضرورت مندوں کی خبر گیری کرو اور ان کی

مشکلات کے ازالے کے لیے ہر ممکن کوشش کیا کرو۔ پھر جب ہم طویٰ کے مقام پر پہنچے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے خوبصورت لباس زیب تن کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے عمدہ خوشبو آئی تو فرمانے لگے: تم میں سے ایک آدمی حج کے لیے تو خستہ حالت میں نکلتا ہے مگر جب اللہ کے نزدیک بڑے حرمت والے شہر میں آتا ہے تو ایسا لباس زیب تن کرتا ہے گویا کہ وہ خوشبو میں بسا رہا۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: میں نے یہ پوشاک اپنے خاندان اور قوم کے پاس جانے کے لیے پہنی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ناپسندیدگی کی وجہ سے معاویہ رضی اللہ عنہ نے وہ کپڑے اتار کر احرام والے کپڑے پہن لیے۔[2]

عمرو بن یحییٰ بن سعید اموی اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت انہوں نے سبز رنگ کا خوبصورت لباس پہن رکھا تھا، اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی طرف دیکھنے لگے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھا تو انہیں درے سے مارنے لگے۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: امیر المومنین! میرے بارے میں اللہ سے ڈریں، میرے بارے میں اللہ سے ڈریں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی نشست گاہ پر واپس لوٹ گئے۔ لوگ کہنے لگے: امیر المومنین! آپ نے انہیں کیوں مارا، جب کہ آپ کی قوم میں ان جیسا کوئی اور شخص نہیں ہے؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے صرف خیر ہی دیکھی اور مجھ تک صرف خیر ہی پہنچی، مگر میں نے انھیں ذرا اونچا دیکھا تو چاہا کہ ان کے تفوق میں ذرا کمی کر دوں۔[3]

ع مر بن خطاب رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرماتے: یہ عرب کے کسریٰ ہیں۔[1]

معاویہ رضی اللہ عنہ شام پر امارت کے دوران شاہی شان و شوکت اور ہر طرح کی تیاری کی حالت میں رہتے۔ اس کے لیے وہ یہ جواز پیش کرتے کہ میں دشمن کے سامنے مورچہ بند ہوں جس کے لیے حربی اور جہادی شان و شوکت اور شاہانہ اندازِ زیست کے مظاہرہ کی شدید ضرورت ہے۔[2]

ان کا موقف تھا کہ شارع علیہ السلام نے اس کی بادشاہت کی مذمت نہیں کی جو حق اور دین کے غلبہ کا فریضہ سر انجام دے اور عوام الناس کی مصالح کی نگہداشت کرے البتہ وہ بادشاہت یقیناً قابل مذمت ہے جس کے پیش نظر باطل کی سرپرستی کرنا اور لوگوں کو ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات کا اسیر بنانا ہو۔ اگر بادشاہ اللہ کے لیے مخلص رہ کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور جہاد فی سبیل اللہ پر آمادہ کرنے کی ذمہ داری نبھائے تو اس میں سے کچھ بھی مذموم نہیں ہے۔[3]

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کا اس طرح ذکر فرمایا ہے:

﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝﴾ (ص: ۳۵)

"انہوں نے دعا کی: اے میرے رب! میری بخشش فرما اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے سوا کسی کو میسر نہ ہو بیشک تو بڑا دینے والا ہے۔" چونکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی شاہانہ شان و شوکت کے شرعی اغراض و مقاصد تھے، لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی۔

جب ایک دن عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوا تو انہوں نے بڑے خوبصورت الفاظ میں انہیں خراج تحسین پیش کیا۔[4] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بہت زیادہ اعتماد حاصل تھا۔[5] پھر انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس بات کو ثابت کر دکھایا کہ انہیں نہ صرف یہ کہ سیاسی ضروریات کا گہرا ادراک حاصل ہے بلکہ وہ ماحول اور معاشرہ میں مثبت تبدیلیاں لانے کی صلاحیت سے بھی بدرجہ اتم بہرہ مند ہیں۔ الغرض عمر رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظم نے انہیں دولت اسلامیہ کے بڑے اہم صوبوں کی ولایت کے منصب جلیلہ پر فائز کیا بلکہ ان کی ولایت میں مسلسل اضافہ کرتے رہے اور انہیں کبھی ان کے منصب سے معزول نہ کیا حالانکہ انہوں نے اپنے عمال اور امراء کی کثیر تعداد کو ان کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیّدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذہانت و فطانت اور ان کی انتظامی صلاحیتوں کو بنظر استحسان دیکھا کرتے تھے اور اس کا برملا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایک دن اپنے ہم نشینوں سے فرمایا: تم قیصر و کسریٰ اور ان کی شان و شوکت کا ذکر کرتے ہو جبکہ تمہارے پاس معاویہ رضی اللہ عنہ موجود ہیں۔[1]

۴۔ معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے محاذ پر:

جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام کی ولایت کا منصب سنبھالا اور حضرت عمرو بن العاص مصر فتح کرنے کے لیے روانہ ہوئے تو اسلامی مملکت شامی حدود کی حفاظت و توسیع کی ذمہ داری اس عمل سے مربوط ہو گئی۔ اس دوران معاویہ رضی اللہ عنہ نے مندرجہ ذیل دو اہم ترین عسکری منصوبوں کی تکمیل میں کامیابی حاصل کی: موسم سرما اور موسم گرما میں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے نظام کی تشکیل اور اسلامی تاریخ میں پہلی بار بحری بیڑے کی تیاری۔

(۱)...رومیوں کے ساتھ موسم سرما اور موسم گرما میں جنگ کرنے کا نظام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تشکیل پایا جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ رومیوں کو سپاہ اسلام کے ہاتھوں پے در پے شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجہ میں شام اور مصر ان کے ہاتھوں سے نکل گئے جبکہ اس وقت یہ دونوں علاقے اقتصادی، سیاسی اور فوجی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ مگر رومیوں نے ان ہزیمتوں کو تسلیم نہ کیا اور انہوں نے ان پہاڑی راستوں سے شام پر حملے جاری رکھے جو انہیں رومی سلطنت کے دیگر علاقوں سے جدا کرتے تھے۔ جب خلیفۃ المسلمین ۱۶ھ میں شام کے دورے پر آئے تو وہ اس صورت حال کو دیکھ کر فرمانے لگے: میں چاہتا ہوں کہ ان پہاڑی گزرگاہوں کے اس طرف تو رومیوں کا عمل دخل رہے اور اس طرف ہمارا۔[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے شام کے اس دورے کے دوران یہ اصطلاح رائج کی اور آپ کے حکم سے شام کے ان پہاڑی راستوں کو بند کر دیا گیا۔[3] اس امر کا اہتمام بھی موجود ہے کہ ان اسلامی سرحدی شہروں پر رومیوں کے حملوں کا مقصد دیگر رومی شہروں کا دفاع کرنا اور مسلمان سپاہ کی طاقت کو کمزور کرنا ہو۔ مگر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے دشمن کے شہروں کو میدان جنگ میں تبدیل کر دیا جس سے مسلمانوں کے علاقے محفوظ ہو گئے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس مقصد کے حصول کے لیے دفاعی وسائل کو پہلے سے بہتر بنایا اور مختلف شہری مراکز اور چھاؤنیوں کو اگلے مورچوں میں تبدیل کر دیا جن کی ذمہ داری مشکل حالات کا سامنا کرنا اور دشمن کو خبردار کرنا تھا۔ ان مورچوں کو دشمن پر حملہ کرنے والی سپاہ کے لیے روانگی کے مراکز کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ جن میں سے بعض کی قیادت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بنفس نفیس کی۔

مثلاً ۲۲ھ میں دس ہزار کے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے سرزمین روم میں داخل ہوئے، اور ۲۳ھ[4] میں روم میں دور تک پیش قدمی کرتے ہوئے عمودیہ تک جا پہنچے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے عبادۃ بن صامت، ابو ایوب انصاری، ابو ذر غفاری اور شداد بن اوس رضی اللہ عنہم بھی ان کے ساتھ تھے۔[1]

(ب)... اسلامی بحری بیڑہ:... اللہ تعالیٰ نے پہلے اسلامی بحری بیڑے کی تیاری کی سعادت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بخشی جس سے سمندر میں جہاد فی سبیل اللہ کا دروازہ کھل گیا جو کہ مصر اور شام کی حمایت اور دشمن کے بحری بیڑے کی بڑھتی ہوئی نقل و حرکت کو روکنے کے لیے از حد ضروری ہو چکا تھا۔ موسم سرما اور موسم گرما کے دوران کی گئی جنگی کارروائیاں خشکی کے راستوں سے پیش آمدہ خطرات کو تو روکنے میں موثر ثابت ہوئی تھیں مگر انطاکیہ سے لے کر اسکندریہ تک کے ساحلی شہر ابھی تک رومی بحری بیڑے کے رحم و کرم پر تھے۔ نیز معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ ادراک بھی ہو گیا تھا کہ جب تک رومیوں کی بحری قوت کا خاتمہ نہیں ہوتا اس وقت تک افریقہ میں اسلامی فتوحات کے دائرہ کو وسیع کرنا ممکن نہیں ہے۔[2] مگر عملی طور پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بحری غزوات کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں کیا۔ اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

۳... عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت کا منصب سنبھالا تو اس وقت معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے بیشتر علاقوں کے حکمران تھے، جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یمن، بحرین، مصر اور دیگر صوبوں کے گورنروں کو ان کے مناصب پر برقرار رکھا تھا اسی طرح انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی ان کے عہدے پر برقرار رکھا بلکہ بعض مزید علاقے بھی ان کی عملداری میں دے دیئے۔ یہاں تک کہ وہ نہ صرف بلاد شام کے مطلق والی بن گئے بلکہ وہ دیگر والیوں کے مقابلے میں انتہائی طاقتور اور بڑے گہرے اثر و نفوذ کے مالک بھی بن گئے۔ حضرت عثمان کی خلافت کے ابتدائی ایام میں عمیر بن سعد انصاری حمص کے گورنر تھے مگر جب وہ بیماری کی وجہ سے اس عہدے کی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل نہ رہے تو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے معذرت کر لی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ان کی معذرت قبول کرتے ہوئے ان کی ولایت کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت کر دیا جس سے ان کے نفوذ میں مزید اضافہ ہو گیا۔[3] اس طرح فلسطین کے والی علقمہ بن محرز کی وفات کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ صوبہ بھی معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں کر دیا۔ اس طرح عثمان کے خلیفہ بننے کے دو سال بعد معاویہ رضی اللہ عنہ سارے شام کے گورنر قرار پائے اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بلا شرکت غیرے شام کے گورنر رہے۔[4] شام پر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولایت کا دورانیہ احداث و واقعات سے بھرپور رہا۔ اس دوران اس علاقہ کا شمار جہاد اسلام کے اہم ترین علاقوں میں ہوتا تھا۔

اگرچہ شام کے اندرونی حالات میں استحکام آ چکا تھا اور ہر طرف اسلام کا دور دورہ تھا، اور اس علاقہ میں رومیوں کی طرف سے بے چینی پھیلانے کی کوششوں میں نمایاں طور پر کمی آ چکی تھی البتہ اس کی سرحد سرزمین روم سے ملتی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ ان علاقوں میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جہاد کے لیے میدان کھلا تھا جن کا سیاسی قد کاٹھ عثمانی خلافت کے اواخر میں خاصا بڑھ چکا تھا اس لیے کہ وہ ان والیوں میں شامل تھے جنہیں

حضرت عثمان نے باہم مشاورت کے لیے اس وقت جمع کیا تھا جب فتنہ کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے اس اجتماع میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی کچھ خاص آراء کا اظہار کیا جنہیں بعد ازاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔[1]

۱۔ حبیب بن مسلمہ فہری رضی اللہ عنہ کی فتوحات:

بلاد شام پر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولایت کے دوران حبیب بن مسلمہ فہری رضی اللہ عنہ کا شمار جہاد کے ممتاز امراء میں ہوتا تھا۔ جب خلافت عثمانی کے آغاز میں رومیوں نے شام کے مسلمانوں پر زبردست چڑھائی کی تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مدد کے حصول کے لیے خط لکھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے والی کوفہ ولید بن عقبہ کے نام خط لکھا کہ میرا خط ملتے ہی آٹھ سے دس ہزار تک کے ایسے لوگوں پر مشتمل ایک لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجیں جن کی شجاعت وبسالت اور اسلام سے وابستگی تمہارے نزدیک مسلمہ ہو۔[2] خط پڑھتے ہی ولید بن عقبہ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا: لوگو! اللہ تعالیٰ نے اس محاذ پر مسلمانوں کی بڑی اچھی آزمائش کی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ شہر واپس دلا دیئے ہیں جنہوں نے کفر کا ارتکاب کیا تھا اور کئی نئے شہر بھی فتح کروا دیئے ہیں اور انہیں مال غنیمت اور اجر وثواب سے نوازتے ہوئے صحیح وسالم واپس لوٹا دیا۔ ہم اس پر اللہ رب العزت کے شکر گزار ہیں۔ امیر المومنین نے ایک خط کے ذریعے سے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم میں سے آٹھ ہزار سے لے کر دس ہزار لوگوں پر مشتمل ایک بڑا لشکر شام بھیجوں تاکہ تم وہاں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کر سکو اور یہ اس لیے کہ رومی ان پر لشکر کشی کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ اس میں تمہارے لیے اجر عظیم بھی ہے اور اس کا فضل وکرم بھی تمہارے شامل حال رہے گا۔ اللہ تم پر رحم کرے۔ اٹھو اور سلیمان بن ربیعہ کے ساتھ روانہ ہو جاؤ۔ لوگوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور تین دن کے اندر اندر کوفہ سے آٹھ ہزار لوگ اس مقصد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر چند دنوں میں شام جا پہنچے۔ اہل شام پر مشتمل لشکر کی قیادت حبیب بن مسلمہ فہری رضی اللہ عنہ اور اہل کوفہ کے لشکر کی قیادت سلیمان بن ربیعہ باہلی کر رہے تھے اور انہوں نے آتے ہی سرزمین روم پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ جس کے نتیجہ میں بہت سارے قیدی اور مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا اور انہوں نے بہت زیادہ قلعے فتح کر لیے۔[3]

ان تمام شہروں اور قلعوں کا شمار جزری سرحدی مقامات میں ہوتا تھا۔[1] ان کارروائیوں کے بعد جب معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی قوت سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے رومی سرزمین کے اندر تک جنگی کارروائیاں بڑھانے کا پروگرام بنایا، چنانچہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۳۲ھ میں اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے اس کے اندر بہت دور تک چلے گئے یہاں تک کہ قسطنطنیہ کے درے تک جا پہنچے۔[2]

۳۔ معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بحری جنگ کی اجازت طلب کرتے ہیں:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بحری جنگ کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑے اصرار کے ساتھ اجازت طلب کرتے رہے اور انہیں بتاتے رہے کہ روم حمص سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اس قدر قریب کہ حمص کی ایک بستی کے لوگ رومیوں کے کتوں کے بھونکنے اور ان کے مرغوں کی بانگ تک کو سن سکتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ مجھے سمندر اور اس میں سفر کرنے والوں کی

صورت حال سے آگاہ کریں۔ اس لیے کہ میں اس بارے میں مطمئن نہیں ہوں۔ اس کے جواب میں حضرت عمرو نے انہیں لکھا: میں نے ایک بڑی مخلوق دیکھی ہے جس پر چھوٹی سی مخلوق سوار ہوتی ہے۔ اگر اس کا ایک طرف جھکاؤ ہو جائے تو دل پھٹ جاتا ہے، اور اگر حرکت کرے تو عقلوں کو ٹیڑھا کر دیتی ہے۔ اس دوران یقین میں کمی آجاتی ہے اور شک میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کیڑے کسی مکڑی پر سوار ہیں۔ اگر وہ ایک طرف جھک جائے تو ڈوب جائے اور اگر بچ نکلے تو چمک آجائے۔ جب عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا یہ خط پڑھا تو معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا: میں آپ کی یہ درخواست قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے اس ذات کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! میں کبھی بھی کسی مسلمانوں کو اس پر سوار نہیں کروں گا۔ مجھے اللہ کی قسم مجھے ایک مسلمان روم کے سارے خزانوں سے زیادہ محبوب ہے۔ میں آپ کو حکماً کہتا ہوں کہ آئندہ کے لیے مجھ سے یہ درخواست نہ کرنا۔[3] چونکہ معاویہ رضی اللہ عنہ روم کی حیثیت اور اس کے مال و ثروت سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اسے فتح کر کے اس پر اسلام کا پرچم لہرایا جائے، لہٰذا ان کے دل میں بحری سفر کا خیال بار بار آتا رہا۔ پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ نے منصب خلافت سنبھالا تو انہوں نے ان سے اس موضوع پر دوبارہ گفتگو کی اور ان سے اس کی اجازت کے لیے شدید اصرار کیا۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ جواب دیا: جب تم نے عمر رضی اللہ عنہ سے بحری جنگ کرنے کی اجازت طلب کی تھی اور انہوں نے تمہیں اس کا جواب دیا تھا تو میں اس سے بخوبی آگاہ ہوں۔ پھر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں دوبارہ لکھا جس میں انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قبرص کی طرف بحری سفر کو بہت آسان بتایا۔ اس کے جواب میں انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اگر اس سفر کے دوران آپ کی بیوی آپ کے ساتھ ہو تو پھر تو آپ کو اس کی اجازت ہے بصورت دیگر ہرگز نہیں۔[4]

خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ شرط بھی لگائی کہ اس کے لیے نہ تو آپ کسی کا انتخاب کریں گے اور نہ قرعہ اندازی ہی کریں گے۔ آپ لوگوں کو اختیار دیں گے ان میں سے جو شخص خوشی سے بحری جنگ میں شرکت کرنا چاہے اسے اپنے ساتھ لے لیں اور اس کے ساتھ تعاون کریں۔[1] جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ خط پڑھا تو وہ قبرص کی طرف بحری سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے ساحلی پٹیوں پر رہنے والے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کشتیاں تیار کر کے انہیں عکا کے ساحل کے قریب لے جائیں تاکہ مسلمان ان پر سوار ہو کر قبرص کی جانب روانہ ہو سکیں۔[2]

۴۔ غزوہ قبرص:

معاویہ رضی اللہ عنہ نے غازی لشکر کے لیے کشتیاں تیار کرنے کا حکم دیا اور ان کی روانگی کے لیے عکا کی بندرگاہ کو منتخب کیا۔ یہ کشتیاں کثیر تعداد میں تھیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھ اپنی زوجہ محترمہ فاختہ بنت قرظہ کو بھی کشتی پر سوار کرایا۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اپنی بیوی ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس غزوہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے۔[3] یہ وہی ام حرام رضی اللہ عنہا ہیں جن کے بارے میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ آپ کو کھانا کھلایا کرتیں۔ یہ خاتون حضرت عبادہ بن صامت کے نکاح میں تھیں۔ ام حرام رضی اللہ عنہا نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: "میری امت کے کچھ لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا گیا جو کہ فی سبیل اللہ جہاد کر رہے ہوں گے۔ وہ سمندر پر اس طرح سوار ہیں جس طرح بادشاہ تختوں پر بیٹھا کرتے ہیں۔" ام حرام رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے کہا: اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے بھی ان لوگوں میں شامل کرے۔ آپ نے اس کے لیے دعا کی اور پھر دوبارہ سو گئے۔ جب آپ بیدار ہوئے تو

ہنستے ہوئے بیدار ہوئے۔ ام حرام رضی اللہ عنہا نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے والی بات دہرائی۔ ام حرام نے اس لشکر میں شامل ہونے کے لیے پہلے جیسی دعا کرنے کی درخواست کی۔ تو آپ نے فرمایا: "آپ پہلے لوگوں میں سے ہیں۔" ام حرام رضی اللہ عنہا نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ امارت میں سمندری سفر کیا۔ جب وہ سمندر سے باہر نکلیں تو اپنی سواری کے جانور سے گر گئیں۔ جس کی وجہ سے وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔[4] اگرچہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی کو بحری جہادی سفر کے لیے مجبور نہیں کیا تھا، اس کے باوجود مسلمانوں کا بہت بڑا لشکر آپ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔[5] اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کی نظروں میں دنیا و مافیہا کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی۔ اگرچہ دنیا کے تمام دروازے ان کے لیے کھول دیئے گئے تھے اور وہ اس کی نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے مگر وہ ان چیزوں کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اور یہ اس لیے کہ یہ بات ان کی گھٹی میں داخل کر دی گئی تھی کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے کہیں بہتر بھی ہے اور اسے بقا بھی حاصل ہے اور یہ کہ اللہ نے انہیں اس لیے منتخب کیا ہے کہ اس کے دین کی نصرت و حمایت کی جائے۔ دنیا میں عدل قائم کیا جائے، اچھائی کی اشاعت کی جائے برائی سے روکا جائے اور دین الٰہی کی سربلندی کے لیے انتھک کوشش کی جائے۔ ان کا یقین تھا کہ ان کی اصل ذمہ داری اس مہم کو سر کرنا ہے اور یہ کہ جہاد فی سبیل اللہ ہی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے، اگر وہ اس ذمہ داری کی ادائیگی سے قاصر رہتے ہیں اور اپنے فرائض کی تکمیل سے ہمت ہار بیٹھتے ہیں تو پھر اللہ دنیا میں ان کی مدد کرنے سے ہاتھ روک لے گا اور آخرت میں انہیں اپنی خوشنودی سے محروم کر دے گا تو یہ ایک کھلا خسارہ ہو گا۔ اسی بنا پر وہ امیر کے ساتھ کشاں کشاں چلے آئے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہوئے کشتیوں پر سوار ہو گئے۔ شاید ام حرام رضی اللہ عنہا کی حدیث ہی نے ان کے دلوں میں ان جذبات کو اجاگر کیا ہو اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے انہیں اس سمندری سفر کے لیے آمادہ کیا ہو۔

۲۸ھ بمطابق ۶۴۹ء میں موسم سرما کے اختتام پر مسلمان شام سے روانہ ہوئے[1] اور عکا کی بندرگاہ سے کشتیوں پر سوار ہوئے۔ ام حرام رضی اللہ عنہا اپنی سواری پر سوار ہوئیں تو سواری کا جانور بدک گیا اور اس نے انہیں زمین پر گرا دیا جس سے ان کی گردن ٹوٹ گئی اور اس طرح وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔[2] مسلمانوں نے ان قربانیوں کی یاد کے طور پر جو انہوں نے اپنے دین کی اشاعت کے لیے پیش کی تھیں ام حرام رضی اللہ عنہا کو جزیرہ کی زمین میں ہی سپرد خاک کر دیا۔ اس علاقہ میں ان کی قبر کو "نیک بی بی کی قبر" سے جانا جاتا ہے۔[3] اس کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے رفقاء کے ساتھ اکٹھے ہوئے جن میں ابو ایوب انصاری، ابو الدرداء، ابوذر غفاری، عبادہ بن صامت، واثلہ بن اسقع، عبد اللہ بن بشر مازنی، شداد بن اوس بن ثابت، مقداد بن اسود، کعب الحبر بن مالک اور جبیر بن نفیر حضرمی بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے باہم مشورہ کر کے اہل قبرص کے نام پیغام بھیجا کہ ہم تمہارے جزیرہ پر قبضہ کرنے کی غرض سے نہیں آئے۔[4] ہم تمہیں اللہ کے دین کی دعوت دینے کے لیے آئے ہیں نیز ہمارے پیش نظر شام میں دولت اسلامیہ کی حدود کو پر امن رکھنا ہے اور یہ اس لیے کہ بینر نظی جب مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہوتے ہیں تو قبرص کو آرام گاہ کے طور پر استعمال کیا کرتے اور جب ان کا زاد راہ کم پڑ جاتا تو یہاں سے سامان رسد حاصل کیا کرتے تھے۔ اگر مسلمان اس جزیرہ کو اپنے زیر نگین کر کے مطمئن نہ ہوئے اور وہ ان کے ارادے کے تابع نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کا وجود کانٹا بن کر ان کی پیٹھوں میں چبھتا رہے گا اور تیر بن کر مسلمانوں کے سینوں کو چھلنی کرتا رہے گا مگر اس پیغام کے جواب میں اہل جزیرہ نے نہ تو سپاہ اسلام کے سامنے ہتھیار ڈالے اور نہ ان کے لیے اپنے شہروں کے دروازے کھولے اور نہ ان کا سامنا کرنے کے لیے میدان میں ہی اترے بلکہ دار الحکومت میں قلعہ بند ہو گئے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ اہل روم آگے بڑھ کر ان کا دفاع کریں گے اور مسلمانوں کی چڑھائی کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔[1]

۵۔اہل قبرص کی طرف سے صلح کا مطالبہ:

مسلمانوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے قبرص کے دار الحکومت "قسطنطنیہ" کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کو ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ وہ لوگ ان کے ساتھ صلح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے جس کے لیے مسلمانوں نے چند شرائط رکھیں۔ جب کہ اہل قبرص نے یہ شرط رکھی کہ مسلمان ان پر کوئی ایسی شرط عائد نہیں کریں گے جس کی وجہ سے وہ اہل روم کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے کسی مصیبت میں پھنس جائیں اس لیے کہ ہم میں نہ تو ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہے اور نہ ان سے جنگ کرنے کی ہی طاقت۔ اہل قبرص کے ساتھ مسلمانوں کی شرائط کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ اگر جزیرہ کے رہائشی آمادہ جنگ ہوئے تو مسلمان اس کا دفاع نہیں کریں گے۔

۲۔ جزیرہ کے باسی مسلمانوں کو ان کے دشمن رومیوں کی نقل و حرکت سے باخبر رکھیں گے۔

۳۔ اہل جزیرہ مسلمانوں کو سالانہ سات ہزار دو سو درہم ادا کیا کریں گے۔

۴۔ مسلمان ان کے راستے سے اپنے دشمن تک رسائی حاصل کریں گے۔

۵۔ اگر رومی مسلمانوں سے جنگ کریں گے تو وہ ان کی نہ تو مدد کریں گے اور نہ مسلمانوں کے خفیہ معاملات سے ہی انہیں آگاہ ہی کریں گے۔[2]

اہل جزیرہ کے ساتھ صلح کرنے کے بعد مسلمان شام واپس چلے گئے۔ اس حملہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ مسلمان رومیوں کے ساتھ جنگ کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں نیز اس دوران انہیں دشمن کے ساتھ اس قسم کی معرکہ آرائی کے لیے مشق کرنے کا موقع بھی میسر آیا جو اُن پر حملہ آور ہونے کے لیے کمر بستہ رہتا ہے چاہے وہ حملہ بلاد شام پر ہو یا اسکندریہ پر۔[3]

۶۔شام میں اسلامی بحری بیڑے کے کمانڈر عبد اللہ بن قیس:

معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما نے عبد اللہ بن قیس جاسی کو بحری بیڑے کا کمانڈر مقرر کیا، اس دوران انہوں نے شاتیہ اور صائفہ کے درمیان بحری جنگی کارروائیاں کیں جن کے دوران ان کی فوج کا کوئی ایک آدمی بھی نہ تو غرق آب ہوا اور نہ کسی کو کوئی زخم ہی آیا۔ وہ اللہ سے دعا کیا کرتے تھے کہ وہ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ان میں سے کسی کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نوازا۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے اکیلے ہی جام شہادت نوش کرنے کا ارادہ کیا تو وہ کشتی پر سوار ہو کر سرزمین روم میں مرفأ کے مقام پر جا پہنچے۔ وہ ادھر آئے تو کئی بھکاریوں نے انہیں گھیر لیا اور انہوں نے ان پر صدقہ کیا، ایک بھکاری عورت نے انہیں پہچان کر بستی کا رخ کیا اور لوگوں سے کہنے لگی: کیا تمہیں عبد اللہ بن قیس میں دلچسپی ہے؟ انہوں نے دریافت کیا: وہ کہاں ہیں؟ اس نے بتایا: مرفأ میں، وہ کہنے لگے: اللہ کی دشمن، تو انہیں کیسے پہچانتی ہے؟ اس نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا: تم لوگ تو بالکل ہی گئے گزرے ہو بھلا عبد اللہ بھی کسی پر مخفی رہ سکتا ہے۔ وہ لوگ وہاں پہنچ کر ان پر حملہ آور ہوئے یہاں

تک کہ وہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔[1] جس عورت نے رومیوں کو عبد اللہ بن قیس کے خلاف بھڑکایا اس سے پوچھا گیا کہ تو نے عبد اللہ کو کیسے پہچانا؟ تو اس نے کہا: وہ تاجر کے روپ میں تھا مگر جب میں نے اس کے سامنے دست سوال دراز کیا تو اس نے مجھے بادشاہ کی طرح دیا جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ عبد اللہ بن قیس ہے۔[2] یوں اللہ تعالیٰ نے جب اس عظیم قائد کو خلعت شہادت سے نوازنا چاہا تو اسے یہ موقع اس انداز سے فراہم کیا کہ وہ ایسی وضع اختیار کیے ہوئے تھے جو مسلمانوں کی بحری شہرت کے لیے ضرر رساں نہیں تھی۔ وہ تن تنہا دشمن کی نگرانی کرنے اور ان کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور پھر وہ انوکھا واقعہ پیش آیا جس کی گہرائی تک اس ملک کی عورتوں میں سے ایک ذہین عورت نے رسائی حاصل کر لی۔ اس عورت نے دیکھا کہ جو آدمی بظاہر عام تاجروں جیسا نظر آتا ہے وہ بادشاہوں کی طرح جود و سخا کرتا ہے۔ اگرچہ وہ سادہ سی وضع قطع اختیار کیے ہوئے تھے مگر وہ عورت ان میں سیادت و قیادت کی علامات کا مشاہدہ کر کے اس امر سے آگاہ ہو گئی کہ یہ مسلمانوں کا وہ قائد ہے جس نے اس سرزمین میں اپنے دشمنوں کو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ اس طرح دشمنوں تک کے ساتھ اس عظیم قائد کا جود و سخا پر مبنی رویہ ان کے راز کو ظاہر کرنے اور ان کے مرکز سے آگاہی کے حصول کا سبب بن گیا اور یوں اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہا۔ مسلمان قائدین بڑی بڑی کامیابیوں کے حصول کے لیے اپنے اخلاق و کردار کے حوالے سے اس قسم کی اعلیٰ مثالیں قائم کیا کرتے ہیں۔ نیز اس لیے بھی کہ وہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے بہترین قائدانہ صلاحیتوں سے متصف یہ عظیم قائد دشمن کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے از خود اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور یہ معاملہ اپنے کسی لشکری کے سپرد نہیں کرتا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے ان کا اکیلے نکل کھڑا ہونا اگرچہ اپنے آپ کو خطرات سے دوچار کرنے اور دشمن کے ہاتھوں اپنی ہلاکت کو دعوت دینے کے مترادف ہے مگر وہ مشکل ترین حالات کا سامنا کرتے ہوئے تن تنہا یہ فریضہ سرانجام دیتے اور اس دوران دشمن کی عورتوں اور اس کے کمزور لوگوں کے ساتھ بھی وہ اسلام کی اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں کا مظاہرہ کرتے۔ ان کی طرف شفقت اور مہربانی کا ہاتھ بڑھاتے اور مال کے ساتھ جود و سخا کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ قبل ازیں اپنے لشکر کے ساتھ تشدد اور نفرت و غرور پر مبنی رویہ نہیں اپناتے بلکہ وہ بڑی وسیع ظرفی کے ساتھ اس کے رفیق اور دوست کے روپ میں دیکھے جاتے ہیں اور جب ہر طرف سے مشکلات میں گھر جاتے ہیں تو وہ ان پر سختی کرنے اور انہیں ملامت کرنے کی بجائے ان مشکلات کا خاتمہ کرنے کے لیے اکیلے ہی جان لڑا دیتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کی غلامی کے بندھن سے آزاد ہونے کی یہ ایک عظیم مثال ہے اور یہ وہ عظیم اخلاق ہے جس سے اسلام کی پہلی نسل متصف تھی اور یہی وہ امتیازی اوصاف ہیں جن کی وجہ سے انہیں اسلامی فتوحات کی عظیم کامیابیاں میسر آئیں اور امت اسلامیہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے میں ان کے حکام و قائدین کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ ان کا ذکر کس قدر دل آویز اور ان کی قربانیاں کتنی عظیم ہیں۔ وہ ظالم حکمرانوں کے خلاف کتنی بڑی قوت اور مساکین وضعفاء پر کس قدر مہربان، شفیق ثابت ہوئے۔[1]

۷۔ اہل قبرص صلح کا معاہدہ توڑ دیتے ہیں:

۳۲ھ رومیوں نے اہل قبرص پر اس بات کے لیے شدید دباؤ ڈالا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے رومی لشکر کی کشتیوں کی صورت میں مدد کریں۔ یوں انہوں نے اس جبر کے تحت مسلمانوں کے ساتھ صلح کا معاہدہ توڑ ڈالا۔ جب یہ خبر معاویہ رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو انہوں نے جزیرہ پر قبضہ جمانے اور اسے مسلمانوں کے سلطان کے زیر نگین لانے کا پروگرام بنا لیا اور پھر اسے عملی جامہ پہناتے ہوئے جزیرہ پر بھرپور انداز میں حملہ کر دیا۔ یہ حملہ ایک طرف سے معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے اور دوسری طرف سے عبد اللہ بن سعد کے لشکر نے کیا۔ اس دوران دشمن کے بے شمار

لوگ مارے گئے۔ متعدد کو قیدی بنالیا گیا اور بہت سارا مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا۔[2] آخر کار اسلامی قوت کے اس دباؤ کے تحت قبرص کا حاکم مسلمان فاتحین سے صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو گیا، چنانچہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ صلح کے گزشتہ معاہدہ کو بحال کر دیا۔[3]

معاویہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ تجویز آئی کہ اب جزیرہ میں کسی ایسے لشکر کو متعین کیا جائے جو اسے دشمن کی غارت گری سے محفوظ اور امن و امان کو برقرار رکھے تاکہ رومی مسلمانوں کے خلاف سرکشی کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں، چنانچہ انہوں نے وہاں بارہ ہزار پر مشتمل ایک لشکر کو وہاں متعین کر دیا اور بعلبک سے ایک جماعت کو بھی وہاں منتقل کر دیا۔ پھر وہاں ایک شہر تعمیر کیا۔ اس میں ایک مسجد بنائی اور وہاں مامور فوجیوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ اب جزیرہ پُر امن تھا۔ مسلمان رومیوں کے اچانک حملوں سے محفوظ تھے۔ مگر پھر مسلمانوں نے دیکھا کہ اہل قبرص عسکری صلاحیت سے عاری ہیں اور وہ اپنے خلاف جنگ کرنے والوں کے سامنے بالکل کمزور ہیں۔ انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ رومی ان کے معاملات کو اپنے کنٹرول میں لے لیں گے اور اپنے مفادات کے لیے انہیں زیر کر لیں گے۔ دریں حالات ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ انہیں رومیوں کے ظلم سے تحفظ فراہم کیا جائے اور انہیں ان کے تسلط سے آزاد رکھا جائے۔ اس وقت اسماعیل بن عیاش نے فرمایا تھا: اہل قبرص کمزور اور مجبور و مقہور ہیں اگر انہیں اسی حال پر چھوڑ دیا گیا تو رومی ان پر غالب آجائیں گے اور ان کی عورتوں پر تسلط جمالیں گے، چنانچہ ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہم انہیں دشمن سے محفوظ رکھیں اور ان کی حفاظت کا بندوبست کریں۔[4]

۸۔ اللہ کے نافرمان اس کے نزدیک حقیر ترین ہیں:

مذکورہ بالا غزوہ کے سیاق میں ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ جب انہوں نے رومی دشمن کے قیدیوں کی طرف دیکھا تو رونے لگ گئے اور پھر فرمایا: جب لوگ اللہ کے نافرمان بن جاتے ہیں تو اس کے نزدیک بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی طرف دیکھیں، یہ ایک غالب قوت تھے، لوگ ان کے زیر دست تھے مگر جب انہوں نے اللہ کے حکم کو ترک کر دیا اور اس کی نافرمانی میں لگ گئے تو وہ ان ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہو گئے۔[1] دوسری روایت میں وارد ہے کہ جبیر بن نفیر نے ان سے فرمایا: آپ رو رہے ہیں حالانکہ یہ ایسا دن ہے جس میں اللہ نے اسلام اور پیروان اسلام کو عزت و شان سے نوازا ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: یہ غالب و زبردست قوم تھی اور ان کی اپنی بادشاہی تھی مگر جب انہوں نے اللہ کے حکم کو ضائع کر دیا تو اس نے انہیں ان برے حالات سے دوچار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا یہ حکم مسلط کر دیا کہ انہیں قیدی بنالیا جائے اور جب قیدی ہونا کسی قوم کا حق ٹھہرتا ہے تو پھر اللہ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا: جب بندے اللہ کے حکم کو ترک کر دیتے ہیں تو اس وقت اللہ کے نزدیک ذلیل ترین قرار پاتے ہیں۔[2] ابو درداء رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی ان لوگوں پر ازراہ حسرت رو رہے ہیں جن کی بصیرتیں اللہ تعالیٰ نے سلب کر لیں اور انہوں نے دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس دردناک انجام سے دوچار ہوئے۔ بادشاہت اور عزت سے محروم کر دیئے گئے اور ذلت و اطاعت گزاری کے لیے مجبور کر دیئے گئے اور یہ اس لیے کہ وہ باطل کو اپنائے رکھنے پر مصر رہے اور دعوت حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کرتے رہے۔ اگر وہ لوگ عقل سے کام لیتے تو ان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے ان کا ملک بھی باقی رہتا اور ان کے گھر بار بھی آباد رہتے اور انہیں اسلام اور اہل اسلام کی نصرت و حمایت بھی حاصل ہو جاتی۔ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی یہ گہری بصیرت عطف و رحمت کا ایک مظہر ہے جس نے آپ کے آنسوؤں کا روپ دھار لیا جو اس عظیم انسان کی آنکھوں سے بہہ

نکلے۔ یہ آنسو جو اُن میں پنہاں شفقت و رحمت کے جذبات کی تعبیر اور اس قوم کے انجام بد پر اظہار غم کے عکاس ہیں جس نے عزت پر ذلت و رسوائی، ہدایت و گمراہی اور ملک کے زوال کی صورت میں برے انجام کو پسند کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کو لوگوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے کتنی خوشی ہوتی اور ان کے ذلت و رسوائی میں مبتلا رہنے سے کتنا دکھ ہوتا ہے۔[3]

۹۔ معاویہ رضی اللہ عنہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو قبرص کے مال غنیمت کا نگران مقرر فرماتے ہیں:

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا: میں غزوہ حنین کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگ مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کا مال اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: ''اس مال غنیمت میں خمس کے علاوہ میرا کوئی حق نہیں ہے اور خمس بھی تم پر ہی تقسیم کر دیا جائے گا۔'' عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: معاویہ! اللہ سے ڈریں اور مال غنیمت کو صحیح طور سے خرچ کریں اور کسی شخص کو بھی اس کے حصہ سے زیادہ نہ دیں۔ یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: میں اس کی تقسیم کا معاملہ تمہارے سپرد کرتا ہوں اس لیے کہ شام میں تم سے افضل شخص اور کوئی نہیں ہے۔ اسے اس کے حق داروں میں تم تقسیم کرو اور اللہ سے ڈرتے رہنا، چنانچہ اسے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے جملہ حق داروں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے لیے ابو درداء اور ابو امامہ نے ان کی معاونت کی۔[1]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا شمار مدرسہ شامیہ کے مؤسسین میں ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں معلم اور قاضی بنا کر شام بھیجا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر حمص میں قیام کیا پھر فلسطین منتقل ہو کر منصب قضاء پر فائز ہوئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ فلسطین میں یہ منصب سنبھالنے والے پہلے خوش نصیب تھے اس دوران آپ لوگوں کو قرآن حکیم کی تعلیم بھی دیا کرتے اور زندگی کے آخری ایام تک یہ ذمہ داری نبھاتے رہے۔ آپ نے فلسطین میں ہی وفات پائی۔[2]

عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ نے خلافت راشدہ کی علمی، تربیتی اور جہادی سیاست کے نفاذ میں بڑا اہم کردار ادا کیا، آپ کا شمار اہل زہد و تقویٰ میں ہوتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حمص تشریف آوری پر لوگوں سے فرمایا: ''خبردار! دنیا ایک عارضی سامان ہے اور یقیناً آخرت سچا وعدہ ہے، خبردار دنیا کے بھی بیٹے ہیں اور آخرت کے بھی بیٹے ہیں۔ تم آخرت کے بیٹے بنو دنیا کے بیٹے مت بنو۔ اس لیے کہ ہر ماں کے بیٹے اسی کے پیچھے جاتے ہیں۔''[3]

۱۰۔ ابو ذر اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے اختلاف کی حقیقت اور اس بارے عثمان رضی اللہ عنہ کا موقف:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے انہیں اس لیے ہدف تنقید بناتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ربذہ جلاوطن کر دیا تھا۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ عبد اللہ بن سبا نے شام میں ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور انہیں زہد و قناعت اختیار کرنے، فقراء کی دلجوئی کرنے اور ضرورت سے زائد مال خرچ کر دینے کی تلقین کی اور پھر وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی عیب گیری کرنے لگا۔ عبادہ رضی اللہ عنہ اسے پکڑ کر معاویہ

رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے اور ان سے کہنے لگے: اس شخص کو آپ کے پاس ابوذر نے بھیجا ہے۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ابوذر کو شام سے باہر نکال دیا۔[4] احمد امین مصری نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ وہ کسی طرح ابوذر غفاری اور مزدک فارسی کی آراء میں کوئی نہ کوئی مشابہت پیدا کر دے، اس کا کہنا ہے کہ ابن سبا یمن میں مقیم تھا اور اس کی عراق میں بھی آمد و رفت تھی زمانہ قبل از اسلام میں فارسی لوگوں کی کثیر تعداد یمن اور عراق میں آباد تھی، لہٰذا اس بات کا خاصا احتمال ہے کہ ابن سبا نے یہ سوچ عراقی مزدکیت سے اپنائی ہو اور اس سے ابوذر رضی اللہ عنہ نے اخذ کر لی ہو۔[5]

۱۱۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر اقرباء پروری کی تہمت:

خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر شورش پسندوں اور خارجیوں کی طرف سے یہ تہمت لگائی گئی کہ وہ بیت المال میں ناجائز تصرف کرتے ہوئے اقرباء نوازی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس اتہام کو بنیاد بنا کر اعداء اسلام نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک زور دار پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی اور پھر یہ زہریلا مواد کتب تاریخ میں سرایت کر گیا۔ بعض مفکرین اور مؤرخین نے اسے حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا جبکہ حقیقتاً ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور اگر یہ بات ثابت ہے کہ انہوں نے بیت المال سے اپنے قرابت داروں کو کچھ دیا تو اس کا شمار ان کے مناقب میں ہوتا ہے نہ کہ ان کے عیوب میں۔[2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہت زیادہ مالدار تھے اور وہ بہت صلہ رحمی کرنے والے شخص تھے۔[3] اور وہ اس حوالے سے ان پر بڑی رقوم خرچ کیا کرتے تھے، وہ یہ سب کچھ اپنی جیب خاص سے کیا کرتے تھے جبکہ شر پسند لوگوں نے اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ وہ یہ پیسہ بیت المال سے خرچ کرتے ہیں۔ ان کے اس دعویٰ کا جواب عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ دیا تھا: لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں اپنے اہل بیت سے محبت کرتا اور انہیں مال وزر سے نوازتا ہوں۔ جہاں تک ان کے ساتھ محبت کا تعلق ہے تو میں نے ان کی محبت میں آکر کسی پر ظلم نہیں کیا بلکہ میں ان کو حقوق کی ادائیگی کے لیے پابند کرتا ہوں۔ رہا انہیں مال وزر سے نوازنا، تو یہ میں انہیں اپنے مالِ خاص سے دیتا ہوں۔ میں مسلمانوں کے مال کو نہ تو اپنے لیے جائز سمجھتا ہوں اور نہ کسی اور کے لیے۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر صدیق اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کے ادوار میں بھی لوگوں کو اس وقت بڑے بڑے عطیات دیا کرتا تھا جب مجھے اس کی حرص بھی تھی اور شدید ضرورت بھی۔ اب جبکہ میں عمر کے آخری حصے میں ہوں تو ملحدین نے میرے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔[4]

عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا مال اور زمین بنو امیہ میں تقسیم کر دی تھی۔ اس دوران انہوں نے اپنی اولاد کو ان میں سے بعض کے برابر ہی حصہ دیا۔ آپ نے اس کا آغاز ابو العاص کے بیٹوں سے کیا۔ آل حکم کے مردوں کو دس دس ہزار دیئے، اس طرح انہوں نے آپ سے ایک لاکھ وصول کیے۔ آپ نے اپنے بیٹوں کو بھی اتنا ہی دیا۔ آپ نے بنو العاص، بنو العیص اور بنو حرب پر بھی مال تقسیم کیا۔[5] یہ اور اس قسم کی دیگر نصوص آپ کے اعطاء مال کے حوالے سے بھی بڑی شہرت کی حامل ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے متعدد فضائل و مناقب کے بارے میں وارد صحیح احادیث ان کے بارے میں مشہور کردہ ان بے اصل اور خرافاتی روایات کی بیخ کنی کے لیے کافی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ عثمان ذوالنورین بیت المال کا زیادہ تر حصہ اپنے قرابت داروں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔[6]

اپنے قرابت داروں کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کردار اسلام کے کریمانہ ورحیمانہ پہلو کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا﴾ (الاسراء: ۲۶)

"اور قرابت دار مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو، اور فضول خرچی نہ کرو۔"

ان کا یہ قابل تعریف رویہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے عملی پہلو کو اپنانے کی بھی اعلیٰ مثال ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کے بارے میں جو کچھ جانتے تھے وہ دوسرے نہیں جانتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قرابت داروں کے ساتھ بڑی محبت کرتے، ان کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے اور ان پر احسان فرمایا کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بحرین سے مال آیا تو آپ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دوسرے سب لوگوں سے زیادہ دیا۔[1] صرف عثمان رضی اللہ عنہ ہی نہیں بلکہ دیگر تمام مومنین کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہترین نمونہ ہیں۔[2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ان کے مخالفین ومعاندین کے اس الزام واتہام کی تردید میں ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیت المال سے اپنے قرابت داروں کو بہت زیادہ مال دیتے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے قریش کے چار لوگوں میں چار لاکھ دینار تقسیم کر دیئے اور ایسے ہی مروان بن حکم کو لاکھوں روپے دے دیئے۔ مگر یہ محض الزام ہے اور یہ کسی بھی صحیح دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ ہاں آپ اپنے قرابت داروں کو بھی دیا کرتے تھے اور غیر قرابت داروں کو بھی۔ بلکہ آپ تو تمام اہل اسلام کے ساتھ حسن سلوک پر مبنی رویہ اپنایا کرتے تھے۔ مگر یہ کہنا کہ آپ اتنی کثیر مقدار میں لوگوں کو مال سے نوازا کرتے تھے تو اسے ثابت کرنے کے لیے صحیح اور ثابت شدہ دلیل کی ضرورت ہے، یہ ایک صریح جھوٹ ہے، اتنی بڑی رقم نہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کسی کو دی اور نہ خلفائے راشدین میں سے کسی اور نے۔[3]

۱۲۔ کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کا حق دبا کر اپنے کسی قرابت دار کو کوئی عہدہ دیا؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کا حق دبا کر اپنے کسی قرابت دار کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ اگر آپ نے ایسا کرنا ہوتا تو اس رعایت کے سب زیادہ حق دار ان کے سوتیلے بیٹے محمد بن ابو حذیفہ تھے۔ مگر آپ رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر انہیں کسی ایسے منصب پر فائز کرنے سے انکار کر دیا جس کی وہ اہلیت نہیں رکھتے تھے: میرے بیٹے! اگر تم میں یہ کام کرنے کی صلاحیت ہوتی تو میں یہ ذمہ داری تمہیں ضرور دیتا، مگر تم اس کی اہلیت نہیں رکھتے۔[4] یہ آپ رضی اللہ عنہ کی اصول پسندی تھی نہ کہ اس سے کراہت یا نفرت کا اظہار۔ اگر ایسا ہوتا تو جب انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ سے مصر جانے کی اجازت طلب کی تھی تو اسے اس سفر کے لیے تیار نہ کرتے اور نہ اسے زاد راہ ہی دیتے۔[5] اس کے لیے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ موجود تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں روم سے جنگ کرنے کے لیے ایک لشکر تیار کیا اور اس پر اسامہ بن زید کو عامل مقرر فرمایا۔[1] پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس لشکر کی روانگی پر اصرار کیا مگر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چاہتے تھے کہ اس لشکر کا اسامہ کی جگہ کسی اور کو قائد بنایا جائے۔ انہوں نے اس بارے میں عمر رضی اللہ عنہ سے بات کی تاکہ وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بات کریں مگر جب انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بات سنی تو غضبناک ہو کر عمر رضی اللہ

عنہ سے فرمانے لگے: عمر! اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامل مقرر فرمایا تھا۔ اب تم یہ چاہتے ہو کہ اسے میں اس عہدے سے معزول کر دوں۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے فرمایا تھا: میں نے صرف ذمہ دار اور پسندیدہ لوگوں کو عامل بنایا، یہاں ان کے شہر والے اور ماتحت موجود ہیں تم ان کے بارے میں ان سے پوچھ لو، اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ اس سے پہلے ان سے زیادہ کم عمر لوگوں کو عامل مقرر کیا گیا اور آج میرے لیے جو بات کی جا رہی ہے اس سے زیادہ سخت بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی گئی تھی، کیا یہ درست نہیں ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ بالکل درست ہے۔ لوگ دوسروں پر ایسے الزامات لگاتے ہیں جن کی وہ وضاحت نہیں کر پاتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صرف ذمہ دار اور عادل لوگوں کو عامل بنایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ کا عامل مقرر فرمایا اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔[3] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شہروں کے والی شرعی امور سے ناواقف نہیں ہوتے تھے، وہ دین پر عمل کرنے میں کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوتے تھے اور ان سے گناہوں کا صدور ہوا بھی تو انہوں نے بہت ساری نیکیاں بھی کی تھیں، پھر یہ گناہ ان کی ذات سے متعلق ہوا کرتے تھے، مسلم معاشرہ میں ان کے اثرات مرتب نہیں ہوتے تھے۔ جب ہم نے ان کے آثار و اعمال کا جائزہ لیا تو ہمیں معلوم ہوا کہ وہ اسلام اور اہل اسلام کے لیے بڑے بڑے فوائد کے حامل تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ولاۃ الامور کے ہاتھوں پر لاکھوں لوگوں نے اسلام قبول کیا اور ان کی فتوحات کی وجہ سے بڑے بڑے وسیع و عریض علاقے مملکت اسلامیہ میں شامل ہوئے۔ اگر وہ شجاعت و بسالت اور دین سے متصف نہ ہوتے جو انہیں جہاد کی ترغیب دلایا کرتے تھے تو وہ اس جہاد کے لیے لشکروں کی قیادت نہ کرتے جس میں ہلاکت کا خدشہ رہتا ہے اور آرام و راحت اور دنیوی ساز و سامان کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ جب میں نے عمال کی سیرت و کردار کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ان سب لوگوں نے اپنے زیر ولایت علاقوں کے آس پاس اسلامی فتوحات کے دائرے کو وسعت دی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان فضائل و مناقب اور صفات حسنہ سے بھی متصف تھے جو انسان کو قیادت کے اہل بناتی ہیں۔ میں نے اپنی کتاب کی ایک مستقل فصل میں ولاۃ عثمان رضی اللہ عنہ پر روشنی ڈالی ہے۔[4]

جو شخص صحیح تاریخی واقعات کی طرف رجوع کرتے ہوئے عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ عمال و ولاۃ کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرے گا اور اسلامی دعوت کی تاریخ میں ان کے جہاد کے بہترین ثمرات کا مشاہدہ کرے گا اور ان عظیم نتائج کا جائزہ ضرور لے گا جو ان کے حسن انتظام کی وجہ سے امت اسلامیہ کی خوش نصیبی اور سعادت کی شکل میں سامنے آئے تو وہ انہیں داد دیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ولاۃ الامور اعدائے اسلام سے اپنا دفاع کرنے، ان سے جہاد کرنے اور ان کا راستہ روکنے کے لیے ہمیشہ مصروف عمل رہے۔ دولت اسلامیہ کے دائرہ کو توسیع دیتے رہے اور نئے نئے علاقوں پر اسلام کا پرچم لہراتے اور اس کے اثر و رسوخ کو بڑھاتے رہے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ نے سر اٹھایا اور الزامات و اتہامات کا رخ ان کی طرف موڑ دیا گیا تو ان منصب داروں نے صورت حال کو براہ راست متاثر کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امت کی خیر خواہی کے لیے کسی قسم کی کوتاہی روا نہ رکھی۔ اسی طرح انہوں نے اپنے خیال میں صرف باصلاحیت لوگوں کو ہی ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ خود اور ان کے مقرر کردہ عمال و ولاۃ فتنہ پردازوں

کے اتہامات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اسی طرح وہ ان بہت سارے مصنّفین سے بھی محفوظ نہ رہ سکے جو اپنی کتابوں میں ان کے عہد خلافت کی غیر حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ خصوصاً ان نئے محققین سے جو چند واقعات کو لے کر بلا تحقیق احکام صادر کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اصحاب قلم و قرطاس ضعیف یا شیعی روایات کی بنا پر خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں باطل اور ظالمانہ احکام صادر کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے چند نامور مؤرخین اور ان کی تالیفات کے نام درج ذیل ہیں: نمبر شمار نام مولف نام کتاب

۱ طه حسين الفتنة الكبرى

۲ راضی عبدالرحيم النُظام الاداری و الحربی

۳ صبحی الصالح النظم الاسلامية

۴ مولوی حسين الادارة العربية

۵ صبحی محمصانی تراث الخلفاء الراشدين فی الفقه و القضاء

۶ توفيق اليوزبکی دراسات فی النظم العربية و الاسلامية

۷ محمد الملحم تاريخ البحرين فی القرن الاوّل الهجری

۸ بدوی عبداللطيف الاحزاب السياسية فی فجر الاسلام

۹ انور الرفاعی النظم الاسلامية

۱۰ محمد الرّيّس النظريات السياسية

۱۱ علی حسن خربوطلی الاسلام و الخلافة

۱۲ ابو الاعلی مودودی خلافت و ملوکيت

۱۳ سيد قطب العدالة الاجتماعية[1]

اکثر مؤرخین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اپنے قرابت داروں کے ساتھ محبت کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عثمانی عہد خلافت میں حکومتی باگ ڈور انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان مورخین کے خیال میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت سارے لوگوں کی ناراضی کا سبب یہی لوگ تھے۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرابت داروں میں سے سب سے پہلے جس شخص کو والی مقرر کیا گیا وہ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما ہیں۔ دوسرے عبداللہ بن ابوالسرح، تیسرے ولید بن عقبہ، چوتھے سعید بن العاص اور پانچویں عبداللہ بن عامر ہیں۔ یہ پانچ لوگ ہیں جنہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف علاقوں پر والی مقرر کیا اور ان تمام کا شمار ان کے قرابت داروں میں ہوتا ہے اور یہ ان کے نزدیک عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے قابل اعتراض بات ہے۔ اگر ہم اعداد و شمار جمع کریں تو معلوم ہو گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں والیوں کی تعداد چھبیس تھی۔ کیا بنو امیہ میں سے ولایت کا استحقاق رکھنے والے پانچ اشخاص کا منصب ولایت پر فائز ہونا صحیح نہیں ہے اور خاص طور سے اس وقت جب ہمیں معلوم ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو امیہ کے افراد کو دوسروں سے زیادہ اس منصب پر فائز فرمایا تھا؟ یاد رہے کہ یہ پانچ لوگ ایک ہی وقت میں منصب ولایت پر فائز نہیں تھے۔ بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلے ولید بن عقبہ کو والی مقرر کیا پھر انہیں معزول کر کے ان کی جگہ پر سعید بن العاص کو والی مقرر کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت بنو امیہ کے صرف مندرجہ ذیل تین افراد اس عہدہ پر متمکن تھے: معاویہ، عبداللہ بن سعد بن ابوالسرح اور عبداللہ بن عامر بن کریز۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ اور سعید بن العاص کو معزول کیا، مگر کہاں سے؟ کوفہ سے جہاں سے عمر رضی اللہ عنہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو معزول کیا تھا، وہ کوفہ جو کبھی بھی کسی والی سے راضی نہ ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ان لوگوں کو ان کے عہدوں سے معزول کرنا ان کے لیے قابل اعتراض نہیں ہے بلکہ اس شہر کے ان شورش پسندوں کے لیے ہے جن کا انہیں والی مقرر کیا گیا تھا۔[3] بنو امیہ کو نہ صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں عامل مقرر فرمایا بلکہ ان کے بعد یہ سلسلہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی جاری رکھا جبکہ ان پر ان لوگوں کے ساتھ قرابت داری کی تہمت بھی نہیں تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کے عمال میں سے بنو عبد شمس کے عاملین کی تعداد دوسرے تمام قریشی قبائل سے زیادہ تھی اور یہ اس لیے کہ ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور وہ شرف و سرداری میں بھی دوسروں سے بڑھ کر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب بن اسید بن ابوالعاص کو مکہ مکرمہ کا عامل بنایا۔ ابوسفیان بن حرب کو نجران کا اور خالد بن سعید کو بنو مدحج سے زکوٰۃ وصول کرنے کا مسؤل مقرر فرمایا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابان بن سعید کو بحرین کا عامل قرار دیا۔

عثمان رضی اللہ عنہ نے صرف ان لوگوں کو ہی عامل بنایا جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا تھا اور ان کے خاندان اور ان کے قبیلہ سے بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو شامی فتوحات کے لیے والی مقرر کیا اور پھر عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس عہدے پر برقرار رکھا اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے بھائی معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کو والی بنایا۔[1] اس جگہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں نے اپنی منصبی ذمہ داریاں باندازِ احسن پوری کیں یا نہیں؟ علمی حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے قرابت داروں میں سے جن لوگوں کو منصب ولایت پر فائز کیا تھا انہوں نے اپنے اپنے زیر نگیں علاقوں کے معاملات کی انجام دہی کے لیے اپنی صلاحیت و طاقت کا لوہا منوایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں بہت سارے شہر اور علاقے فتح کروائے اور انہوں نے اپنی رعیت میں عدل و احسان پر کاربند رہنے کا طریقہ

اپنایا۔[2] مثلاً معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی ولایت کے دوران لوگوں کے ساتھ بہترین رویہ اختیار کیے رکھا جس کی وجہ سے وہ آپ کے ساتھ بہت زیادہ محبت کیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہارے حکمرانوں میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم ان کے لیے دعا گو رہو اور وہ تمہارے لیے دعائیں کرتے رہیں، تمہارے حکمرانوں میں سے بدترین لوگ وہ ہیں کہ تم ان سے نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں، تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنتیں برسائیں۔"[3] قاضی ابن العربی نے بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات کا اثبات کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنا کاتب مقرر فرمایا اور یہ اعزاز صرف انہی کے حصہ میں آیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی دولت اسلامیہ کے والی رہے اور آپ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین خلفاء راشدین کے بھی، صرف اسی پر بس نہیں بلکہ حضرت حسن بن علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما نے بھی آپ کے ساتھ صلح کرنے کے بعد ان کی خلافت کو تسلیم کیا۔[4] **۱۳۔ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے اسباب:** زہری فرماتے ہیں: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بارہ سال تک امیر المومنین کے منصب پر فائز رہے۔ پہلے چھ سالوں میں کسی بھی شخص نے آپ پر انگلی نہیں اٹھائی۔ قریش عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے زیادہ آپ سے محبت کرتے تھے اور یہ اس لیے کہ عمر رضی اللہ عنہ ان پر سختی روا رکھتے تھے، جبکہ عثمان رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ نرم رویہ اپناتے اور ان سے صلہ رحمی کیا کرتے تھے۔

پھر اس کے بعد فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلمان مؤرخین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے نصف ثانی (۳۵-۳۰ھ) کے دوران پیش آنے والے واقعات کو فتنہ سے موسوم کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی صورت میں سامنے آیا۔[1] حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چند سالوں میں مسلمان باہم اتفاق و یگانگت سے رہتے تھے اور ان کے درمیان کوئی نزاع نہیں تھا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اواخر میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے ان کے درمیان قدرے اختلاف پیدا ہو گیا اور آخر کار فتنہ پردازوں کے ایک گروہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا جس کے بعد مسلمان تفرقہ بازی کا شکار ہو گئے۔[2]

صدیقی و فاروقی خلافت اور عثمانی خلافت کے ابتدائی سالوں میں مسلمان معاشرہ مندرجہ ذیل امتیازات کا حامل تھا:

☆ عمومی طور سے یہ معاشرہ ہر اعتبار سے ایک اسلامی معاشرہ تھا۔ اس کا اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر پختہ ایمان تھا۔ اسلامی تعلیمات و احکام کی تطبیق کا پورا پورا التزام کیا جاتا تھا اور معاصی کا ارتکاب بہت کم دیکھنے میں آتا تھا۔ ☆ یہ ایسا معاشرہ تھا جس میں امت کا حقیقی اور ربانی معنی اپنے اعلیٰ ترین معیار پر متحقق تھا۔ یہ ایک ایسی امت تھی جو زبان، رنگ، جنس اور علاقہ ارضی سے صرف نظر کرتے ہوئے محض عقیدہ و ایمان کی بنیاد پر باہم مربوط تھی۔ یہ ایک ایسا امتیازی نشان ہے جو تاریخ عالم میں امت مسلمہ کے علاوہ اور کسی امت کو حاصل نہ ہو سکا۔

☆ یہ ایک اخلاقی معاشرہ تھا جو واضح اخلاقی بنیاد پر استوار تھا اور یہ بنیاد دینی احکام اور اس کی توجیہات سے ماخوذ تھی۔

☆ یہ ایک ذمہ دار اور سنجیدہ معاشرہ تھا جو بلند تر مقاصد کے حصول کے لیے مصروف عمل رہتا تھا۔ یہ معاشرہ جس سنجیدگی کا حامل تھا وہ ترش روئی اور تند مزاجی سے عبارت نہیں تھی بلکہ وہ ایسی روح تھی جو لوگوں میں عزم و ہمت پیدا کرتی اور انہیں سرگرمی، عمل اور حرکت پر آمادہ کرتی تھی۔[3]

☆وہ ایک ایسا معاشرہ تھا جسے ہر شعبہ حیات میں عمل و فعل کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ جس میں فوجی روح کار فرما تھی اس روح کو نہ صرف یہ کہ جہاد فی سبیل اللہ میں بلکہ جملہ پہلوؤں اور رجحانات میں واضح طور سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔[4]

☆یہ ایک عبادت گزار معاشرہ تھا جس کے جملہ تصرفات میں روح عبادت واضح طور سے دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ عبادت صرف فرائض و نوافل کی ادائیگی تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس کا دائرہ کار تمام اعمال کی انجام دہی تک وسیع تھا۔ یہ ہیں وہ اہم صفات و امتیازات جن کے ساتھ اسلامی معاشرہ خلفاء راشدین کے عہد میں متصف تھا۔ مگر یہ بات پیش نظر رہے کہ ہم جس قدر عہد نبوت کے قریب ہوتے جائیں گے یہ صفات قوی ہوتی چلی جائیں گی اور جس قدر اس عہد زریں سے دور ہوتے چلے جائیں گے ان میں ضعف پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ اس تبدیلی کا آغاز شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے فتنہ کے ظہور کے ساتھ ہوا۔ امت مسلمہ کے اس سنگین آزمائش سے دوچار ہونے کے کئی اسباب ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

الف:... آسودہ حالی اور اس کے معاشرہ پر اثرات:

مال و دولت کی کثرت اور فتوحات اسلامیہ کی وجہ سے حاصل شدہ آمدن کے اثرات معاشرے پر مرتب ہونے لازمی تھے۔ اس سے معاشرے میں آسودگی آتی ہے اور لوگ دنیوی امور میں منہمک ہو جاتے ہیں نیز اس سے باہم مقابلہ بازی اور منافرت کا ماحول پروان چڑھتا ہے خاص طور ان لوگوں میں جن کے نفوس کو ایمان نے صیقل نہیں کیا ہوتا اور تقویٰ نے انہیں مہذب نہیں بنایا ہوتا۔ جیسا کہ بادیہ نشین، فتوحات کے دوران مسلمان ہونے والے لوگ اور ناز و نعمت میں پلنے والی اقوام کے نوجوان لوگ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اس بات سے بخوبی آگاہ تھے۔ آپ نے ایک دفعہ اس تبدیلی سے خبردار کرتے ہوئے لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا: دنیوی نعمتوں کا پورے طور سے میسر آنا، تمہاری لونڈیوں سے تمہاری اولاد کا جوان ہونا، بادیہ نشین اور غیر عرب اقوام کا قرآن پڑھنا۔[1] پھر وہی کچھ ہوا جس کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ توقع کر رہے تھے، پہلے پہل تو اس تبدیلی کے آثار دولت اسلامیہ کے اطراف و کنار میں ظاہر ہونے لگے اور پھر آہستہ آہستہ خلافت اسلامیہ کا مرکز بھی اس کی زد میں آ گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ کے دوران ارشاد فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا اس لیے دی ہے تاکہ تم اس کے ساتھ آخرت کو حاصل کرو۔ اس لیے نہیں دی کہ تم اسی کے ہو کر رہ جاؤ، یقیناً دنیا فنا ہونے والی ہے جبکہ آخرت باقی رہے گی۔ خبردار! فانی چیز تمہیں نہ تو قبول حق سے باز رکھے اور نہ باقی رہنے والی چیز سے تمہاری توجہ کو ہٹا دے۔ اپنی جماعت سے وابستہ رہو اور گروہ بندی سے اجتناب کرو۔[2] پھر آپ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (اٰل عمرٰن: ۱۰۳، ۱۰۴)

"اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور جدا جدا نہ ہونا، اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، تو تم اس کی نعمت کی بدولت بھائی بھائی بن گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تم کو اس سے بچالیا، اللہ ایسے ہی کھول کھول کر بیان کرتا ہے، تمہارے لیے اپنی آیات کو تاکہ تم ہدایت پر رہو، اور تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہونا چاہیے جو خیر کی دعوت دیتی رہے اور برائی سے روکتی رہے اور یہی لوگ ہیں کامیاب ہونے والے۔" جب مسلمانوں کے لیے دنیوی نعمتوں کی فراوانی ہوگئی اور لوگ فتوحات کے بعد فارغ ہو کر بیٹھ گئے تو وہ اپنے ہی خلیفہ سے ناراض ہو کر ان سے حسد کرنے لگے۔[1] یہیں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آسودگی و خوش حالی نے خلیفۃ المسلمین کے خلاف اٹھنے والی تحریک میں کیا کردار ادا کیا؟

ب:... عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں اجتماعی تبدیلی کا مزاج:

مسلمان معاشرے میں جو گہری تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ ایسی قوت اور خاموشی کے ساتھ روبعمل رہیں کہ اکثر لوگ ان کا احساس کرنے سے قاصر رہے، یہاں تک کہ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے نصف ثانی کے آغاز میں پر تشدد طریقہ سے کھل کر سامنے آگئیں اور پھر وہ سرکشی کی اس انتہاء تک جا پہنچیں جس کا نتیجہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی شکل میں سامنے آیا۔[2]

فتوحات اسلامیہ کی تحریک کے دوران جب دولت اسلامیہ کی حدود میں وسعت پیدا ہوئی تو معاشرے کی ترکیب میں بھی تبدیلی رونما ہوئی اور اس کی بناوٹ میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

اس لیے کہ دولت اسلامیہ کو جہاں رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے وسعت میسر آئی وہاں اسے اس وسیع و عریض رقبہ پر مختلف اجناس و الوان، لغات و ثقافات، عادات و اطوار، افکار و معتقدات، ادبی و عمرانی فنون اور متعدد دیگر مظاہر سے بھی پالا پڑا جس نے اسلامی معاشرہ کو غیر ہم آہنگ، غیر منظم اور مضطرب کر دیا، اور خاص طور سے موثر کردار کے حامل بڑے بڑے شہروں میں، مثلاً بصرہ، کوفہ، شام، مصر، مدینہ اور مکہ وغیرہ، یہ شہر اپنے محل وقوع اور اہمیت کی وجہ سے فتوحات کے لیے لشکر روانہ کرتے اور ان کی واپسی پر ان کا استقبال کرتے۔

جب موت یا قتل جیسی مختلف وجوہات کی بنا پر ان کی آبادی میں کمی آگئی تو ان کی جگہ مفتوحہ علاقوں کے لوگوں نے لے لی، مثلاً فارسی، رومی، ترکی، قبطی، کرد اور بربر وغیرہ۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق فارس، نصاریٰ عرب اور یہودیوں سے تھا۔[3]

ان شہروں کے زیادہ تر رہائشی عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور عام طور سے شرف صحابیت سے بہرہ مند نہ تھے، یعنی ان لوگوں کا شمار ان خوش قسمت افراد میں نہیں ہوتا تھا جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کافی تربیت حاصل کی یا تو اس لیے کہ وہ فتوحات میں مصروف رہے یا پھر صحابہ کرام کی تعداد میں کمی آجانے کی وجہ سے وہ اس سعادت سے محروم رہے۔

ج:... نئی نسل کا ظہور:

اسلامی معاشرہ میں یہ بڑی تبدیلی بھی رونما ہوئی کہ ایک نئی نسل وجود میں آگئی جس نے معاشرہ میں اپنا مقام بنانا شروع کر دیا اور یہ نسل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نسل سے مختلف تھی۔ یہ نسل جس زمانے میں رہتی تھی وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے مختلف تھا اور اس نسل میں وہ اوصاف نہیں تھے جن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متصف تھے۔[1]

یہ نسل اپنے سے پہلی اس نسل سے کم تر حیثیت کی حامل تھی جس نے دولت اسلامیہ کی تعمیر و ترقی کا فریضہ اپنے سر لے رکھا تھا۔ مسلمانوں کی پہلی نسل ایمانی قوت اور اسلامی عقائد کے فہم سلیم سے متصف تھی اور وہ کتاب و سنت کے احکام و فرامین کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دینے کی پوری پوری استعداد رکھتی تھی جبکہ یہ اوصاف اس نئی نسل میں بہت ہی کم دیکھنے میں آتے ہیں جو وسیع و عریض فتوحات اسلامیہ کے نتیجہ میں معرض وجود میں آئی۔ اس نسل میں ذاتی مفادات کے حصول نے سر اٹھایا اور جنسی و قومی تعصبات ابھرنے لگے۔ ان میں سے بعض تو زمانہ جاہلیت کے بہت سارے طور طریقوں کو اپنائے ہوئے تھے اور وہ صحیح اسلامی عقائد کی بنیاد پر قائم اسلامی تربیت سے اس طرح فیض یاب نہ ہو سکے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فیض یاب ہوئے تھے۔ یہ لوگ اپنی کثیر تعداد اور نئی فتوحات میں مشغول رہنے کی وجہ سے صحیح اسلامی تربیت سے محروم رہے تھے۔[2]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے بعد کے تمام لوگوں سے بہت ہی کم فتنوں سے دوچار ہوئے۔ پھر زمانہ جس قدر دور نبوت سے دور ہوتا چلا گیا تفرقہ بازی اور اختلافات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔[3]

[1] الدولة الاموية، يوسف العش، ص: ۱۳۲. [2] تحقيق مواقف الصحابة فى الفتنة: ۱/۳۵۶۔ [3] ذوالنورين عثمان بن عفان از مآل الله، ص: ۹۹.

د:... معاشرے کا پروپیگنڈہ سے متاثر ہونا:

مخلوط قسم کا یہ غیر آہنگ معاشرہ اضطرابی کیفیت سے دوچار جھوٹے پروپیگنڈہ سے متاثر اور افواہوں پر کان دھرنے کا عادی بن چکا تھا۔[4] یہی وجہ تھی کہ جب لوگ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام میں عہد رسالت کے قریب اور ایمان و صلاح کے حوالے سے بڑی عظمت کے حامل اور ان کے ائمہ و حکمران اپنی ذمہ داری کو باندازِ احسن نبھانے والے تھے تو ان میں کسی فتنہ نے سر نہیں اٹھایا تھا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت کے دوران ایسے لوگوں کی کثرت ہو گئی جنہوں نے اگر کچھ نیک کام کیے تو ساتھ ہی ساتھ کئی گناہوں کے مرتکب بھی ہوئے، لہٰذا شہوت پرستی کا دور دورہ ہوا اور ایمان و دین کے ساتھ شکوک و شبہات کی آمیزش ہو گئی۔ یہ بیماری رعایا کے بعض لوگوں ہی میں نہیں بلکہ بعض حکمرانوں میں بھی سرایت کر گئی اور پھر اسی قسم کے لوگوں میں مزید اضافہ ہوتا گیا جس کی وجہ سے شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کا فتنہ کھڑا ہو گیا اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس کی وجہ طرفین میں اعلیٰ درجہ کے تقویٰ و اطاعت کا فقدان اور ان میں خواہش پرستی اور معصیت کی آمیزش تھی۔ ان میں سے ہر فریق تاویل کرتا اور یہ دعویٰ کرتا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام

دے رہا ہے۔ یہ کہ وہ حق اور عدل کے ساتھ ہے۔ مگر ان کی اس تاویل میں نفسانی خواہشات کا بھی عمل دخل تھا۔ اگرچہ ان میں سے ایک جماعت دوسری سے زیادہ حق کے قریب تھی۔ ہمارے اس موقف کی وضاحت امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ایک پیروکار کے درمیان ان کی اس بات چیت سے ہوتی ہے، وہ آدمی کہنے لگا: مسلمانوں کو کیا ہوا کہ انہوں نے آپ کے بارے میں اختلاف کیا جبکہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں اختلاف نہ کیا؟ اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما مجھ جیسے لوگوں کے حکمران تھے جبکہ میں آج تم جیسے لوگوں کا حکمران ہوں۔[1]

امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مسلم معاشرہ میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا بخوبی ادراک تھا۔ اسی لیے آپ نے امراء کے نام ایک خط میں لکھا: رعیت میں انتشار پیدا ہو رہا ہے اور وہ حریص اور لالچی ہو چکی ہے اور اس کی تین وجوہات ہیں: دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا، نفسانی خواہشات کی تکمیل کرنا اور دلوں میں بغض رکھنا۔[2]

ہ:... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خلیفہ بننا:

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے فوری بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا مسند خلافت سنبھالنا۔ چونکہ ان دونوں کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھا جس کی وجہ سے رعیت کے ساتھ ان کا طرز عمل اور رویہ بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ سخت مزاج تھے وہ اپنا محاسبہ بھی بڑی سختی کے ساتھ کیا کرتے تھے اور اپنے ماتحت لوگوں کا بھی۔ جبکہ عثمان رضی اللہ عنہ نرم خو، نرم زبان اور نرم دل انسان تھے جس کی وجہ سے وہ نہ تو عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اپنا محاسبہ کرتے اور نہ دوسرے لوگوں کا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ عمر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے جو طاقت عمر رضی اللہ عنہ میں تھی وہ کسی اور میں کہاں؟[3] اگرچہ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز ہی میں انہیں ان کی نرم مزاجی کی وجہ سے بڑا پسند کیا، اس لیے کہ وہ ان کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے یہاں تک کہ ان کی محبت ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی تھی مگر بعد ازاں انہوں نے احسان فراموشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے۔ لوگوں کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محبت پر مبنی یہ رویہ ان کی نرم مزاجی، خوش اطواری اور ان کے حلم و حوصلہ کی وجہ سے تھا۔ اور اس کا انہیں بخوبی ادراک بھی تھا۔ انہوں نے بیت خلافت کا محاصرہ کرنے والوں سے فرمایا تھا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم لوگوں کو میرے خلاف اتنا دلیر کس نے بنایا؟ تمہیں میرے خلاف اس قدر دلیری میرے حلم و حوصلہ نے دی۔[4]

جب عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام لوگوں کے سامنے باغیوں کے ان تمام اعتراضات کا جواب دے دیا تو مسلمانوں نے انہیں قتل کرنے کے علاوہ کسی بھی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے حلم و حوصلہ اور صلح جوئی کی وجہ سے انہیں قتل کرنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا: ہم ان سے درگزر کریں گے، ان کے عذر کو قبول کریں گے اور کسی سے نہیں لڑیں گے یہاں تک کہ وہ کسی شرعی حدود کا ارتکاب کریں یا کفر کو ظاہر کریں۔[1]

و:... کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا مدینہ منورہ سے چلے جانا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین میں قریش کے سرکردہ لوگوں پر ان کی اجازت کے بغیر مدینہ چھوڑ کر دوسرے شہروں میں آباد ہونے پر پابندی لگادی تھی۔ جب لوگوں نے ان سے اس بارے میں شکایت کی تو آپ نے فرمایا: اس طرح قریش اللہ کے مال پر اللہ کے دوسرے بندوں سے ہٹ کر قبضہ جمانا چاہتے ہیں مگر میں ہر ممکن طریقہ سے ان کا راستہ روکوں گا۔ میں قریش کو جہنم میں گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف مفتوحہ شہروں میں آباد ہونے سے خائف تھے، اگر مدینہ منورہ میں آباد مہاجرین میں سے کوئی شخص آپ کے پاس آکر شہر سے باہر جانے کی اجازت طلب کرتا تو آپ اس سے فرماتے: تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شامل ہو کر جہاد کرنے سے جو مقام و مرتب ملا وہ آج کے جہاد سے حاصل ہونے والے مقام و مرتبہ سے کہیں افضل ہے۔[3] جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے انہیں مدینہ منورہ سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔

ز:... جاہلی عصبیت:

ابن خلدون فرماتے ہیں: جب اسلامی فتوحات کی تکمیل ہو گئی، ملت اسلامیہ کی بادشاہت مکمل ہو گئی اور عرب لوگ بصرہ، کوفہ، شام اور مصر میں رہائش پذیر ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا اعزاز حاصل کرنے والے اور آپ کے آداب و سنن کی اتباع کرنے والے یہ لوگ تھے: انصار و مہاجرین، قریش، اہل حجاز اور یہ اعزاز حاصل کرنے والے دوسرے لوگ، جہاں تک دوسرے تمام عربوں کا تعلق ہے جیسا کہ بنو بکر بن وائل، عبد القیس، ازد، کندہ، تمیم، قضاعہ، ربیعہ اور دوسرے لوگ تو ان میں سے صرف چند کو ہی شرف صحابیت حاصل ہو سکا۔

ح:... فتوحات اسلامیہ میں توقف:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اواخر میں بعض اسباب کی وجہ سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ رک گیا اور وہ فارس، افریقہ اور بلاد شام کے شمال میں آگے نہ بڑھ سکا۔ جس کے نتیجہ میں اموال غنیمت کی آمد کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اس دوران بادیہ نشین لوگ سوال کرنے لگے کہ پہلی غنیمتیں کہاں گئیں؟ مفتوحہ اراضی کہاں گئی؟[4] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق مسلمانوں کے لیے وقف زمینوں میں ناجائز تصرف کرتے ہوئے انہیں اپنے پسندیدہ لوگوں کے نام الاٹ کر دیا ہے۔ اس قسم کی افواہوں نے بادیہ نشینوں کو بڑا متاثر کیا اور خصوصاً ایسے حالات میں کہ ان میں سے زیادہ تر لوگ بے کار بیٹھے اپنے وقت کا آدھا حصہ کھانے پینے اور سونے میں گزارتے اور آدھا حکومتی اور ریاستی سیاست میں بحث مباحثہ کرنے اور عثمان رضی اللہ عنہ کے تصرفات کے بارے میں گفتگو کرنے میں جنہیں سبائی بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک عامل عبد اللہ بن عامر کو اس صورت حال کا ادراک ہوا تو انہوں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ لوگوں کو جہاد کرنے کا حکم دیں اور انہیں جنگوں کا ایندھن بنا دیں تاکہ ان کے ارادوں کو خاک میں ملا دیا جائے۔[1] ایسے افراد کی اس قسم کی گفتگو اور غور و فکر کے ماحول میں جو کہ دین کی زیادہ سوجھ بوجھ کے بغیر جنگ کے عادی تھے ان سے کسی بھی برائی کی توقع کی جا سکتی ہے، اور اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اعراب

کو تحریک دے کر انہیں کسی راستے پر لگا دیا جائے۔ پھر یہ ہوا کہ یہ لوگ بغاوت پر اتر آئے، ہیجان پیدا کرنے لگے، فتنے کھڑے کرنے لگے۔ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے فتنہ میں اور اس کی آگ بھڑکانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔[2]

ط:... حلال کو حرام قرار دینے کا غلط مفہوم:

شریعت میں ورع و پرہیز گاری بڑا عمدہ وصف ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کو ترک کر دیا جائے جن کے اپنانے میں کوئی حرج نہیں اور جن میں کوئی حرج ہے ان سے ڈرا جائے اور یہ اصل میں "اللہ کے لیے مباحات سے ہاتھ کھینچ لینا" سے عبارت ہے۔ ورع و پرہیز گاری ایک شخصی وصف ہے جس کا انسان اپنے آپ سے تو مطالبہ کر سکتا ہے مگر دوسروں سے نہیں۔ اس کی سب سے خطرناک قسم کی پرہیز گاری یہ ہے جو یہ اپنی جہالت کی وجہ سے مباح کو حرام یا فرض قرار دے دیتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں فتنہ پرداز لوگ مبتلا ہو گئے تھے۔[3] باغی عناصر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے مباح امور کے اپنانے کو اسلام سے خروج اور ان سے پہلے لوگوں کی سنت کو تبدیل کرنے پر محمول کیا، لہٰذا جہلاء کے نزدیک یہ امور بڑے سنگین قرار پائے اور اس بنا پر انہوں نے خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خون کو مباح قرار دے دیا اور یوں ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے لیے فتنہ کا دروازہ کھول دیا۔[4]

ی:... خود غرض لوگوں پر مشتمل نئی نسل کا ظہور:

دوسری نسل (اولاد صحابہ رضی اللہ عنہم) کے لوگوں میں سے کچھ ایسے افراد بھی سامنے آئے جو اپنے آپ کو حکومتی باگ ڈور سنبھالنے کا اہل تصور کرتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں نے یہ سمجھا کہ حکومت تک رسائی کا راستہ ان کے سامنے بند ہے۔ عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ جب جاہ پسند اور خود غرض لوگ اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے کوئی راہ نہیں پاتے تو وہ تبدیلی کی جائز و ناجائز ہر کارروائی میں حصہ لیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے معاملات کو نمٹانا بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔[5]

ک:... کینہ پرور گروہ کا وجود:

اس دوران دائرہ اسلام میں کچھ ایسے منافق بھی داخل ہو گئے جو اسلام اور مسلمانوں سے بدلہ لینے سے قاصر تھے چونکہ یہ لوگ کینہ پرور بھی تھے اور بڑے ذہین اور عیار و چالاک بھی، لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کے ان کمزور پہلوؤں کا ادراک کر لیا جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ فتنہ کھڑا کرنے کی پوزیشن میں آ گئے اور پھر کچھ ایسے لوگ بھی ان کے ہتھے چڑھ گئے جو ان کی چکنی چپڑی باتوں کو پورے انہماک سے سنا کرتے تھے اور جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔[1]

ہم قبل ازیں مملکت اسلامیہ میں یہود و نصاریٰ اور فارسیوں کے وجود نامسعود سے آگاہ ہو چکے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب لوگ اسلام اور دولت اسلامیہ کے خلاف اپنے دلوں میں بغض اور کینہ رکھتے تھے، مگر ہم اس جگہ اس امر کا اضافہ کرنا چاہیں گے کہ اگر اس قسم کے لوگوں میں سے کسی

پر اس کے کسی جرم کی پاداش میں حد یا تعزیر نافذ کی گئی اور اس کو یہ سزا خلیفہ نے یا اس کے نامزد کسی والی نے کسی شہر میں دی خصوصاً بصرہ، کوفہ، مصر اور مدینہ میں تو یہود و نصاریٰ اور جرائم پیشہ لوگوں نے بعض ایسے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکایا جن میں سے زیادہ تر بادیہ نشین تھے اور وہ دین کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے جس کے نتیجہ میں ان لوگوں کے حمایت کنندگان کی ایک ایسی جماعت معرض وجود میں آئی جن کے بارے سب کا کہنا یہی تھا کہ یہ شر پسند لوگ ہیں، اخلاق باختہ، بد کردار، پست ذہن اور پرلے درجے کے احمق، گھٹیا اور ذلیل اور شیطان کے آلہ کار ہیں۔[2] ان گھٹیا ترین ناقدین اسلام کے ضمن میں متعدد مآخذ و مصادر میں عبد اللہ بن سبا صنعانی یہودی کا نام بار بار آتا ہے۔ یہ بدنام زمانہ شخص یہودی تھا پھر اس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا مگر اس کے خفیہ اور مذموم مقاصد سے کوئی بھی آگاہ نہ ہو سکا، وہ ایک مسلمان فرد کی حیثیت سے مختلف اسلامی شہروں میں گھومتا پھرتا رہا اور پس پردہ فتنہ کی آگ بھڑکاتا رہا، اس کے بارے میں تفصیلی گفتگو آگے چل کر کی جائے گی۔

ل:... عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے کا ٹھوس منصوبہ:

خلافت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں معاشرہ مختلف عوامل و اسباب کی وجہ سے جھوٹی افواہوں پر کان دھرنے کے لیے آمادہ اور اپنے اندر پیدا کردہ دراڑوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ اصحاب فتنہ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام پر خلیفۃ المسلمین کے امراء میں کیڑے نکالنے پر اتفاق کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ خلیفۃ المسلمین پر جو اعتراضات کیے گئے اور جن کی وجہ سے انہیں ہدف تنقید بنایا گیا، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ منصب خلافت سنبھالنے سے قبل ان کا ذاتی کردار، یعنی بعض غزوات اور مواقع سے ان کا غائب رہنا۔

۲۔ ان کا طرز حکمرانی: اپنے قرابت داروں کو والی مقرر کرنا اور منصب ولایت کی تفویض کا طریقہ کار۔

۳۔ ان کی اپنی ذات یا امت کی مصلحت کی خاطر ان کے اجتہادات (منیٰ میں پوری نماز پڑھنا، قرآن جمع کرنا، مسجد نبوی میں توسیع کرنا)

۴۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم مثلاً عمار، ابو ذر اور عبد اللہ بن مسعود کے ساتھ ان کا برتاؤ۔ میں نے ان اعتراضات کے حوالے سے حضرت عثمان کا موقف اپنی کتاب ''تیسیر الکریم المنان فی سیرۃ امیر المومنین عثمان بن عفان شخصیتہ و عصرہ'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی زندگی میں یا ان کی شہادت کے بعد ان پر جتنے بھی اعتراضات کیے گئے اور جن جن لوگوں کی طرف سے بھی کیے گئے وہ صحیح نہیں ہیں اور وہ اس حد تک نہیں پہنچتے تھے کہ ان کی وجہ سے خلیفہ راشد کو قتل کر دیا جاتا۔[1]

مذکورہ بالا اعتراضات پر مشتمل روایات جو کہ تاریخ طبری اور دیگر کتب تاریخ میں مندرج ہیں اور جو غیر معروف راویوں اور ضعیف مورخین اور خاص طور پر شیعہ سے مروی ہیں وہ ہمیشہ سے خلفاء اور ائمہ کی سیرت کے حقیقی پہلوؤں کے لیے ایک بڑی آفت بنی رہی ہیں۔ خصوصاً وہ روایات جو اضطراب و فتن کے دور سے متعلق ہیں۔ افسوس کہ امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی سیرت کو ان خرافاتی روایات سے وافر حصہ ملا۔ پیچیدہ انداز میں

احداث وواقعات کو روایت کرنا اور لا اصل امور کو وضع کرنا غالی قسم کے منحرفین کی ایسی کارستانی ہے جس سے مقصود ان لوگوں کی روشن و نیر سیرت کو داغدار کرنا ہے اور جس کا ادراک خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی ہو گیا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے امراء کے نام لکھا: لوگوں نے انتشار پھیلانا شروع کر دیا ہے اور وہ شر کی طرف مائل ہو رہے ہیں، اور ایسا تین وجوہ سے ہو رہا ہے: دنیا کو ترجیح دینا، نفسانی خواہشات کی فوری تسکین چاہنا اور دلوں میں کینہ رکھنا۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لگائے گئے ان الزامات و اتہامات کے بارے میں ابن العربی فرماتے ہیں: وہ کاذب راویوں کی روایات پر اعتماد کرتے ہوئے ازراہ ظلم وزیادتی یہ کہتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دوران مظالم کا ارتکاب کیا اور غیر معروف طور طریقے اپنائے... مگر سند اور متن کے اعتبار سے یہ سب کچھ باطل ہے۔[3]

م:... لوگوں کو اشتعال دلانے والے اسالیب ووسائل کا استعمال:

باغی عناصر بھی محفلوں میں لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑکاتے، ان سے مناظرہ کرتے، لوگوں کے سامنے ان سے جھگڑا کرتے، ان کے امراء پر لعن طعن کرتے اور عائشہ، علی، طلحہ اور زبیر جیسے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے جھوٹے خطوط تحریر کرتے اور انہیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے۔ انہوں نے اس بات کی بڑی تشہیر کی کہ خلافت کے اصل حق دار علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ تھے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد ان کے لیے خلافت کی وصیت کی تھی۔ انہوں نے کوفہ، بصرہ اور مصر ایسے شہروں میں کچھ گروہوں کو بھی منظم کیا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ انہوں نے اہل مدینہ کو یہ تاثر دیا کہ ہم یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دعوت پر آئے ہیں، پھر انہوں نے معاملات کو یہاں تک بھڑکایا کہ بات خلیفۃ المسلمین کی شہادت تک جا پہنچی۔[1] جھوٹے پروپیگنڈہ کے ان وسائل کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے لوگوں سے یہ کہنا بھی شروع کر دیا کہ ہم عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے روا رکھے گئے مظالم کے خلاف جہاد کر رہے ہیں اور ہم صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دے رہے ہیں، ہمارا مطالبہ ہے کہ ولاۃ الامر کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے لوگوں کا تقرر کیا جائے، پھر اس سے آگے بڑھ کر وہ عثمان رضی اللہ عنہ کی دست برداری کا مطالبہ کرنے لگے، پھر سرکشی پر مبنی ان کی جرأت اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے خلیفۃ المسلمین کو شہید کر ڈالا۔ انہوں نے یہ قدم اس وقت اٹھایا جب انہیں یہ خبر ملی کہ مختلف شہروں سے لوگ ان کی نصرت و معاونت کے لیے مدینہ منورہ کی طرف بڑھ رہے ہیں جس سے ان کے خلیفہ رضی اللہ عنہ کا گھلا گھونٹ دینے کے جذبات مزید بھڑکے اور انہیں یہ شوق چرایا کہ جس طرح بھی بن پائے انہیں فوراً قتل کر دیا جائے۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حکام سے مشورہ اور اس بارے معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے باغی عناصر کی طرف سے کھڑے کیے گئے فتنہ کا مختلف وسائل و اسالیب کے ساتھ مقابلہ کیا، اس دوران آپ نے پوری کوشش کی کہ اہل فتنہ کے اصل اغراض و مقاصد سے آگاہی حاصل کی جائے۔ مذاکرات کے ذریعے شورش پسندوں اور سرکشی اختیار کرنے

والوں کے خلاف اتمام حجت کیا جائے اور ان کے جائز مطالبات کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس کا ایک طریقہ یہ تھا کہ آپ نے مشورہ کے لیے مندرجہ ذیل حکام کو اپنے پاس بلایا: عبداللہ بن عامر، معاویہ بن ابو سفیان، عمرو بن العاص، عبداللہ بن سعد اور سعید بن العاص رضی اللہ عنہم، یہ سب لوگ مشورہ کرنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوئے۔ سب حضرات نے اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا اور اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ اپنے سپہ سالاروں کو حکم دیں کہ وہ اپنے اپنے علاقہ کا انتظام کریں۔ میں اہل شام کو قابو میں رکھنے کا ذمہ لیتا ہوں۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اجلاس میں شریک تمام لوگوں کی آراء و تجاویز سن لیں تو آپ نے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرنے کے بعد فرمایا: میں نے تمہاری آراء سن لیں، ہر آنے والے واقعہ کا ایک دروازہ ہوتا ہے جس سے وہ آتا ہے۔ اس امت کے لیے جس حادثہ کا خوف ہے وہ آکر رہے گا۔ اگر اس کا دروازہ بند بھی کر دیا جائے تو اسے بزور کھول دیا جائے گا مگر میں اسے نرمی سے بند کروں گا۔ البتہ حدود اللہ میں کسی سے کوئی نرمی نہ ہو گی۔ اگر یہ دروازہ بزور بازو کھولا گیا تو پھر مجھ پر کسی کی حجت باقی نہ رہے گی۔ اللہ جانتا ہے کہ میں نے لوگوں کی بھلائی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ فتنہ کی چکی چلنے والی ہے اگر عثمان رضی اللہ عنہ اس حالت میں فوت ہو گیا کہ اس نے چکی کو حرکت نہ دی تو اس کے لیے بشارت ہے۔ تم لوگ واپس جا کر لوگوں میں سکون پیدا کرو، ان کے حقوق ادا کرو، ان کی کوتاہیوں سے درگزر کرو اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوئی مداہنت نہ کرو۔[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکام کو یہ بھی ہدایت کی کہ ہنگامہ آرائی کرنے والوں پر سختی نہ کی جائے۔ نہ انہیں قید کیا جائے اور نہ کسی کو قتل کیا جائے اور یہ کہ ان کے ساتھ اچھائی اور نرمی والا معاملہ کیا جائے۔[2] آپ نے اپنے عمال سے کہا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں لوٹ جائیں اور اس فتنہ کا اسی انداز سے مقابلہ کریں جس کا ان کے سامنے اعلان کیا گیا ہے۔ ایسا فتنہ جسے صاحب بصیرت آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔[3]

معاویہ رضی اللہ عنہ شام روانگی سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا: امیر المومنین! آپ میرے ساتھ شام تشریف لے چلیں قبل اس کے کہ ایسے امور و واقعات آپ پر ہجوم کر آئیں جن کا آپ سامنا نہ کر سکیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائیگی کو کسی بھی چیز کے بدلے میں نہیں بیچ سکتا۔ چاہے اس کے بدلے میری شاہ رگ ہی کیوں نہ کاٹ دی جائے۔ یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: پھر میں آپ کے لیے شام سے لشکر بھیج دیتا ہوں۔ وہ متوقع خطرات کا مقابلہ کرنے، آپ اور اہل مدینہ کا دفاع کرنے کے لیے مدینہ میں قیام کرے گا۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس لشکر کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسائیوں کا رزق کم نہیں کر سکتا اور نہ میں اہل ہجرت اور اہل نصرت کو مشکلات میں ہی ڈال سکتا ہوں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ گویا ہوئے: امیر المومنین! یا تو آپ کو اچانک قتل کر دیا جائے گا یا آپ سے جنگ کی جائے گی۔ اس پر عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: "حسبی اللہ و نعم الوکیل" "میرے لیے اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔"[4] پھر وہی ہوا جس کی معاویہ رضی اللہ عنہ توقع کر رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کرنے اور آخر کار انہیں قتل کر دینے کے ارادہ سے اہل فتنہ کے جتھے آنا شروع ہو گئے مگر مختلف صوبوں سے آنے والے ان باغیوں میں شام کی کوئی جماعت شامل نہیں تھی۔[5]

شہادت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا موقف:

باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ بڑا سخت کر دیا یہاں تک کہ انہیں مسجد نبوی میں نماز پڑھنے سے بھی روک دیا گیا مگر اس دوران جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا انہوں نے بڑے صبر اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا۔ آپ قضاء و قدر پر بڑا پختہ ایمان رکھنے کے ساتھ اس

امر کے لیے کوشش کرتے رہے کہ اس مصیبت کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے۔ اس کے لیے آپ کبھی تو مسلمان کے خون کی حرمت کے بارے لوگوں کو خطبہ دیتے نظر آتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ کسی بھی مسلمان کا ناحق خون کرنا جائز نہیں ہے۔ کبھی لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے انہیں اپنے فضائل و مناقب سے آگاہ کرتے اور اسلام میں اپنی خدمات جلیلہ سے آشنا کراتے ہیں اور اس کے لیے عشرہ مبشرہ کے فضائل سے استشہاد کرتے ہیں۔[1] گویا کہ آپ یہ فرمانا چاہتے تھے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بیان کردہ ان فضائل و مناقب اور اسلام کے لیے میری ان گراں قدر خدمات کے باوجود میرے لیے یہ ممکن ہے کہ میں دنیا کا طمع کرتے ہوئے اسے آخرت پر ترجیح دوں گا اور کیا یہ بات معقول ہے کہ ایسا شخص امانت میں خیانت کرے گا، امت کے اموال کو من مانے انداز میں لٹائے گا اور اس کے خون کا مذاق اڑائے گا؟ جبکہ وہ اللہ کے ہاں اس کے انجام سے بھی بخوبی آگاہ ہو؟ اور وہ وہی ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست تربیت حاصل کی، آپ نے اس کی پاکیزگی کی گواہی دی؟ جس شخص کا جوانی میں یہ کردار رہا ہو بھلا وہ اسی سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کر سکتا ہے؟ مدینہ منورہ پر سرکشوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی یہاں تک کہ وہ لوگوں کو نمازیں بھی خود ہی پڑھانے لگ گئے۔[2] جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ ادراک ہوا کہ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح اس کا تاثر دیا گیا اور وہ صورت حال کے برے انجام سے ڈرے اور انہیں یہ خبر ملی کہ باغی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے درپے ہیں، تو انہوں نے آپ کو ان کا دفاع کرنے اور شورش پسندوں کو مدینہ منورہ سے باہر نکال دینے کی پیش کش کی، مگر آپ نے اس خدشہ کے پیش نظر ان کی اس پیش کش کو رد کر دیا کہ اس سے خونریزی ہو گی۔[3] کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیے بغیر اپنے بیٹوں کو ان کے پاس بھیجا جن میں حسن بن علی رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ عثمان رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بڑی محبت کرتے اور ان کا احترام کیا کرتے تھے، جب ان کا محاصرہ کر لیا گیا تو انہوں نے حسن رضی اللہ عنہ کو قسم دی کہ وہ اپنے گھر لوٹ جاؤ تاکہ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔[4] انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا: میرے بھتیجے! واپس لوٹ جائیں یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے۔[5] صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو محاصرہ کے دن بیت خلافت سے زخمی حالت میں اٹھایا گیا تھا۔[6] ان کے علاوہ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، محمد بن حاطب رضی اللہ عنہما اور مروان بن حکم کو بھی زخم آئے۔ اس دوران حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ان کے ساتھ تھے۔[7] محاصرہ کے دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سب لوگوں سے زیادہ دفاع حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا جس کے گواہ مروان بن حکم ہیں۔[8] اسی طرح ابن عساکر جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ میرے پاس پانچ سو زرہ پوش لوگ موجود ہیں، آپ اجازت دیں تو میں ان لوگوں سے آپ کا دفاع کروں۔ اس لیے کہ آپ نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کی وجہ سے آپ کو قتل کرنا جائز ہو۔ اس کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا خون ہو۔[1] متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محاصرہ کے دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ مثلاً: جب شورش پسندوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پانی بند کر دیا اور آپ کے اہل خانہ پیاس کی شدت کی وجہ سے قریب الموت ہو گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس پانی سے بھری ہوئی تین مشکیں بھجوائیں مگر وہ ان تک نہ پہنچ پاتیں اگر اس کے لیے بنو ہاشم اور بنو امیہ کے متعدد آزاد کردہ غلام زخمی نہ ہوتے۔ واقعات برق رفتاری سے آگے بڑھتے گئے اور آخر کار شر پسند عناصر اور باغی لوگوں نے آپ کو شہید کر ڈالا۔ جب یہ خبر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ملی جن کے زیادہ تر لوگ مسجد میں موجود تھے تو وہ وحشت زدہ ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں سے پوچھا:

جب تم دروازے پر موجود تھے تو پھر عثمان رضی اللہ عنہ کو کیسے شہید کر دیا گیا؟ اس دوران انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو تھپڑ بھی مارا جب کہ وہ پہلے ہی زخمی تھے۔[2] انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سینہ پر ضرب لگائی اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور اور ابن طلحہ رضی اللہ عنہما کو برا بھلا کہا۔ پھر وہ ناراضی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے: تم ہمیشہ کے لیے برباد رہو۔ میرے اللہ میں تیرے سامنے عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔ میں نے نہ تو انہیں قتل کیا اور نہ کسی کو ہی اس کا اشارہ کیا۔[3] فتنہ کے ایام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی دلیری کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ ان سے مشاورت کرتے رہے۔ ان کی خیر خواہی کرتے اور سمع و اطاعت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے سب سے بڑھ کر ان کا دفاع کیا اور انہیں کبھی برائی کے ساتھ یاد نہ کیا۔ آپ نے اصلاح احوال کی بڑی کوشش کی، خلیفۃ المسلمین اور ان کے خلاف خروج کرنے والوں کے درمیان افہام و تفہیم کے لیے سرگرم عمل رہے۔ مگر صورت حال ان کے کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی۔ اللہ کا فیصلہ یہی تھا کہ امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو شہادت کی موت سے مشرف ہو کر فوز و فلاح سے ہم کنار ہونا ہے۔[4]

اور مفسدین کو یہ گناہ اپنے سر لینا ہے۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے قتل عثمان رضی اللہ عنہ کو ناپسند کیا اور ان کے خون ناحق سے براءت کا اظہار کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبات کے دوران اور دیگر متعدد مواقع پر یہ بات قسم اٹھا کر بیان کی کہ انہوں نے نہ تو عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ نہ کسی کو اس کا حکم دیا، نہ کسی کو اس کا اشارہ کیا اور نہ اسے پسند ہی کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ سے یہ بات متعدد ایسے طرق سے ثابت ہے جو قطعیت کا فائدہ دیتے ہیں۔[5] اس کے برعکس روافض یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ ان کی رضامندی سے ہوا۔[6] شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں وارد بعض اخبار و روایات کو ذکر کرنے کے بعد امام حاکم لکھتے ہیں: "بدعتی لوگوں کا یہ دعویٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں باغیوں کو امیر المومنین علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کا تعاون حاصل تھا محض کذب ہے۔ متواتر اخبار و روایات صورت حال اس کے برعکس بتاتی ہیں۔"[1] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ سب کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر محض کذب و افتراء ہے، وہ نہ تو قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک ہوئے نہ اس کا حکم دیا اور نہ اسے پسند ہی کیا۔ ان سے یہی کچھ مروی ہے، اور وہ بالکل سچے ہیں۔"[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود فرمایا تھا: میرے اللہ! میں تیرے حضور عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔[3] بعض کتب تاریخ نے شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے فتنہ کے دوران اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موقف کو مسخ کر کے پیش کیا ہے، جس کی وجہ سے مؤرخین کی بیان کردہ ضعیف اور موضوع روایات ہیں۔ تاریخ طبری اور دیگر کتب تاریخ میں مندرجہ ابو مخنف، واقدی اور ابن اَعثم کی روایات کے حوالے سے فتنہ کے احداث کا مطالعہ کرنے والا ہی تاثر لیتا ہے کہ اس تحریک کو چلانے والے اور اس کی آگ کو بھڑکانے والے دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ ابو مخنف رافضی ہے، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بار بار یہ تہمت لگاتا ہے کہ ان سے بکثرت غلطیاں سرزد ہوئیں، لہٰذا وہ اس چیز کے مستحق تھے۔ جبکہ طلحہ اپنی مرویات میں ایک ایسے شخص کے روپ میں سامنے آتا ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کوئی انتقام لینا چاہتا ہو۔ واقدی کی روایات بھی ابو مخنف کی روایات جیسی ہی ہیں۔ روافض سے ایسی روایات بکثرت وارد ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش کرنے کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تہمت لگاتی ہیں۔ اور یہ کہ ان لوگوں نے فتنہ کو تحریک دی اور لوگوں کو اشتعال دلایا۔ مگر یہ سب کچھ جھوٹ اور فریب کاری ہے۔[4] ضعیف اور موضوع روایات کے برعکس بحمد اللہ تعالیٰ کتب حدیث نے ہمارے لیے ایسی صحیح روایات کو محفوظ رکھا ہے جن سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دست و بازو بنے۔ ان کا دفاع کیا اور ان کے قتل سے لاتعلق رہے۔[5] اور پھر ان کی شہادت کے بعد ان کے

قصاص کا مطالبہ لے کر اٹھے۔ یہ سب کچھ اس امر کی دلیل ہے کہ فتنہ کو تحریک دینے اور اسے ہوا دینے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کسی طرح سے بھی شریک عمل نہیں تھے۔[6] تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عثمان رضی اللہ عنہ کے خون ناحق سے لاتعلق ہیں۔ جو شخص بھی اس کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کی بات باطل ہے۔ اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی ایک بھی صحیح دلیل نہیں ہے۔ خلیفہ اپنی تاریخ میں عبد الاعلی بن ہیثم سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے باپ سے کہ میں نے حسن رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین میں انصار و مہاجرین میں سے بھی کوئی شخص شامل تھا؟ انہوں نے فرمایا: ہرگز نہیں۔ وہ اہل مصر میں سے اجڈ اور وحشی قسم کے لوگ تھے۔[1] امام نووی فرماتے ہیں: ان کے قتل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص بھی شریک نہیں تھا۔ عثمان کے قاتل نچلے طبقہ کے وحشی قسم کے ذلیل اور گھٹیا قسم کے لوگ تھے جو مصر سے گروہ در گروہ مدینہ پہنچے اور شہر میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انہیں روکنے میں بے بس ہو گئے۔ ان لوگوں نے بیت خلافت کا محاصرہ کر لیا اور پھر انہیں قتل کر ڈالا۔[2] ابن زبیر رضی اللہ عنہما بتاتے ہیں کہ وہ مختلف شہروں کے شورش پسند لوگ تھے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وہ مختلف قبائل کے دھتکارے ہوئے لوگ تھے۔[3] ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ خوارج، فسادی، گمراہ، باغی اور زیادتی کرنے والے تھے۔[4] امام ذہبی فرماتے ہیں: وہ سنگ دلی اور جفا و ظلم کی انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے۔[5] فرماتے ہیں: وہ بڑے گھٹیا اور قبائل کے ذلیل ترین لوگ تھے۔[6] اس کی تائید ان کے اس سنگدلانہ رویے سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے خلیفہ وقت کے ساتھ ان کے محاصرہ سے لے کر ان کی شہادت تک ان کے ساتھ روا رکھا اور ان پر بڑے بڑے مظالم ڈھائے گئے۔ ان تک پانی اور خوراک کی ترسیل روک دی گئی، حالانکہ انہوں نے اپنی جیب سے خرچ کر کے مسلمانوں کے لیے مفت پانی مہیا کیا تھا۔[7] اور جب بھی انہیں بھوک اور کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا انہوں نے اس کے ازالہ کے لیے بھاری رقوم خرچ کیں اور ان کی مشکلات کو کم کرنے کے لیے ان کے ساتھ مالی تعاون کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا۔[8] یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی محاصرین کو ڈانٹتے ہوئے اور صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: لوگو! جو کچھ تم کر رہے ہو یہ امیر المومنین کے شایان شان نہیں ہے۔ تمہارا یہ رویہ کافروں سے بھی بدتر ہے۔ ان تک پانی اور خوراک کی ترسیل مت روکو، رومی اور فارسی تو اپنے قیدیوں کو بھی کھانا کھلاتے اور پانی پلاتے ہیں۔[9]

الغرض صحیح اخبار و روایات اور تاریخی واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لوگوں کو حضرت عثمان کے خلاف بھڑکانے یا ان کے خلاف فتنہ کھڑا کرنے میں باغیوں کے شراکت دار نہیں تھے۔[10] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں میری کتاب ''سیّدنا عثمان بن عفان، شخصیت اور کارنامے۔''

تیسری بحث:

امیر المومنین علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے عہد میں

معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ادوار اور خلافت میں شام کے حکمران رہے مگر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منصب خلافت سنبھالا تو انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کے عہدے سے الگ کرنے کا ارادہ کیا۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ شورش

پسندوں نے اس کے لیے ان پر دباؤ ڈالا تھا اور خصوصاً ایسے حالات میں کہ وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ میں نے یہ موقف اس لیے اختیار کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے قبل معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ نیز اس لیے بھی کہ اس کے بعد ان لوگوں نے مصر سے قیس بن سعد کی معزولی کے لیے بھی ان پر دباؤ ڈالا اور جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی جگہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو والی شام مقرر کرنا چاہا مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا اور اس بنا پر معذرت کی کہ میرے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان قرابت اور معاہرت کا رشتہ ہے۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی اس معذرت کو قبول کرتے ہوئے انہیں شام جانے کے لیے مجبور نہ کیا۔ جن روایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے شام کی ولایت کا منصب سنبھالنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے سے انکار کی وجہ سے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر سختی کی، تو ان میں قطعاً کوئی صداقت نہیں ہے۔[2] حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ان کا یہ بیان مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میری طرف پیغام بھیجا اور فرمایا: ابو عبد الرحمن! اہل شام میں تمہاری بات مانی جاتی ہے، لہٰذا آپ شام کے لیے روانہ ہو جائیں میں نے آپ کو شام کا امیر مقرر کیا ہے۔ اس پر میں نے کہا: میں آپ کو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی قرابت داری اور ان سے اپنی قرابت کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ مجھ سے درگزر فرمائیں۔ مگر علی رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کر دیا۔ میں نے اس بارے میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا ذریعہ استعمال کیا تو انہوں نے پھر بھی انکار کر دیا، اس پر میں راتوں رات مکہ کے لیے روانہ ہو گیا۔[3] یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کی تھی اور یہ کہ وہ ان کی اطاعت میں داخل تھے، اس لیے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ علی رضی اللہ عنہ اس شخص کو منصب ولایت تفویض کریں جس نے ان سے بیعت ہی نہ کی ہو۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے موت کے وقت فرمایا: مجھے اس چیز کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں نے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو کر باغی گروہ کے ساتھ جنگ کیوں نہ کی۔[1] یہ روایت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر رکھی تھی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما اس بات پر اپنی ندامت کا اظہار کر رہے ہیں کہ انہوں نے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر باغی گروہ کے ساتھ جنگ نہ کی۔ یاد رہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو فتنہ کے دوران غیر جانبدار رہے اور کسی ایک گروہ کے ساتھ مل کر دوسرے گروہ سے لڑائی نہ کی۔ اگر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ کی ہوتی تو وہ اس بات پر ندامت کا اظہار کرتے اور اس کی صراحت بھی کرتے، اس لیے کہ امیر کی بیعت کرنا شرعاً واجب ہے اور ایسا نہ کرنے والے کو وعید سنائی گئی ہے۔ خود انہیں سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں امیر کی بیعت نہ ہوئی تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔"[2] یہ معاملہ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل رہ کر جنگ کرنے سے مختلف ہے، اس لیے کہ اس بارے صحابہ میں اختلاف رہا ہے اور ان میں کچھ اس جنگ سے بالکل الگ تھلگ رہے تھے، دریں حالات یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اس مختلف فیہ جنگ میں شریک نہ ہونے پر تو نادم ہوں مگر ترک بیعت پر نادم نہ ہوں جبکہ اس بارے بڑی سخت وعید بھی وارد ہو۔ اس سے ان بعض مورخین کے اس قول کا بطلان ہوتا ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی تھی۔ انہوں نے ان سے صرف بیعت ہی نہیں کی تھی بلکہ ان کا شمار ان کے مقرب لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں وہ منصب ولایت تفویض کرنے اور ان سے تعاون حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ آپ جانتے تھے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما میرے سچے دوست اور خیر خواہ ہیں۔[3] جب ابن عمر رضی اللہ عنہما نے شام کی ولایت قبول کرنے سے معذرت کر لی تو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ سہیل بن حنیف کو شام کا والی بنا کر بھیجا اور ابھی وہ مشارف شام تک بھی نہیں

پہنچے تھے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے شہسواروں نے انہیں پکڑ لیا اور پھر کہا کہ اگر تمہیں عثمان رضی اللہ عنہ نے بھیجا ہے تو ہم تم کو خوش آمدید کہتے ہیں اور اگر کسی اور نے بھیجا ہے تو پھر یہیں سے واپس لوٹ جائیں[4] اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بلادِ شام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت پر بڑے غضبناک تھے۔

اولاً:... صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس بارے میں اختلاف تھا کہ قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص کس طرح لیا جائے

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اور طلحہ و زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف اور پھر علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا یہ سبب ہرگز نہیں تھا کہ ان لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر کوئی اعتراض تھا، ان لوگوں کا اس بات پہ اجماع تھا کہ علی رضی اللہ عنہ خلافت و ولایت کے زیادہ حق دار ہیں۔ ابن حزم رقمطراز ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ نے نہ تو کبھی علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا انکار کیا اور نہ خلافت کے لیے ان کے استحقاق کا ہی۔ مگر ان کے اجتہاد نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا بیعت پر مقدم ہے اور یہ کہ میں عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کرنے کا زیادہ حقدار ہوں۔[1] ابن تیمیہ رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: "معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت کا دعویٰ نہ کیا، اور انہوں نے علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تو کسی سے اپنی خلافت کے لیے بیعت نہیں لی۔ انہوں نے نہ تو خلیفہ کے طور پر علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی اور نہ خلافت کا حقدار ہونے کا دعویٰ کیا۔ سب لوگ علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے حتیٰ کہ معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس کا اقرار کرتے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کا آغاز کبھی نہیں کیا اور نہ وہ اسے صحیح ہی خیال کرتے تھے۔"[2] اختلاف کا یہ سبب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے باعث عیب نہیں تھا۔ ان کا اختلاف خلافت کے مسئلہ میں نہیں تھا بلکہ عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینے کے قضیہ میں تھا اور اس طریقہ میں تھا جس کے ساتھ اس قضیہ کو نمٹایا جاسکے۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اصولی طور سے قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کے حق میں تھے مگر ان کی یہ رائے تھی کہ جب تک صورت حال میں استحکام نہیں آتا اسے اس وقت تک موخر کر دیا جائے اور صائب بات بھی یہی تھی۔[3] امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان جنگوں کا سبب مسائل کا الجھاؤ تھا اور اس الجھاؤ میں شدت کی وجہ سے ان کے اجتہاد میں اختلاف واقع ہوا جس کی وجہ سے وہ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ کے اجتہاد نے ان پر یہ بات عیاں کی کہ حق اس طرف ہے اور ان کا مخالف گروہ باغی ہے، لہٰذا ان کی مدد کرنا ضروری ہے، لہٰذا انہوں نے اپنے اعتقاد کی رو سے باغی گروہ سے جنگ کی اور امام عدل کی مدد کرنے میں کوئی تاخیر روا نہ رکھی۔ جبکہ اس کے برعکس دوسرے گروہ کی اجتہادی کاوشوں نے ان پر یہ امر منکشف کیا کہ حق دوسری طرف ہے، لہٰذا ان کی مدد کرنا اور اس پر زیادتی کرنے والے گروہ سے جنگ ہم پر واجب ہے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جبکہ تیسرے گروہ کے سامنے یہ قضیہ الجھا رہا اور وہ اس بارے حیران ہو کر رہ گئے اور دونوں گروہوں سے کسی ایک گروہ کی ترجیح ان پر ظاہر نہ ہوئی، لہٰذا وہ غیر جانبدار ہو کر بیٹھ رہے اور ان کے حق میں یہ غیر جانبداری ہی واجب تھی اس لیے کہ کسی بھی مسلمان کے خلاف لڑائی کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ وہ اسی کا مستحق ہے۔ اگر ان لوگوں کے نزدیک کسی ایک فریق کا رجحان ظاہر ہو جاتا اور انہیں یہ علم ہو جاتا کہ حق اس کے ساتھ ہے تو ان کے لیے اس پر زیادتی کرنے والوں سے لڑائی کر کے اس کی مدد کرنے سے ہاتھ کھینچ لینا جائز نہ ہوتا۔"[4]

نہ تو کبھی علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا انکار کیا اور نہ خلافت کے لیے ان کے استحقاق کا ہی۔ مگر ان کے اجتہاد نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا بیعت پر مقدم ہے اور یہ کہ میں عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کرنے کا زیادہ حقدار ہوں۔[1] ابن تیمیہ رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: "معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت کا دعویٰ نہ کیا، اور انہوں نے علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تو کسی سے اپنی خلافت کے لیے بیعت نہیں لی۔ انہوں نے نہ تو خلیفہ کے طور پر علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی اور نہ خلافت کا حقدار ہونے کا دعویٰ کیا۔ سب لوگ علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے حتیٰ کہ معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس کا اقرار کرتے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کا آغاز کبھی نہیں کیا اور نہ وہ اسے صحیح ہی خیال کرتے تھے۔"[2] اختلاف کا یہ سبب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے باعث عیب نہیں تھا۔ ان کا اختلاف خلافت کے مسئلہ میں نہیں تھا بلکہ عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینے کے قضیہ میں تھا اور اس طریقہ میں تھا جس کے ساتھ اس قضیہ کو نمٹایا جاسکے۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اصولی طور سے قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کے حق میں تھے مگر ان کی یہ رائے تھی کہ جب تک صورت حال میں استحکام نہیں آتا اسے اس وقت تک موخر کر دیا جائے اور صائب بات بھی یہی تھی۔[3]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان جنگوں کا سبب مسائل کا الجھاؤ تھا اور اس الجھاؤ میں شدت کی وجہ سے ان کے اجتہاد میں اختلاف واقع ہوا جس کی وجہ سے وہ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ کے اجتہاد نے ان پر یہ بات عیاں کی کہ حق اس طرف ہے اور ان کا مخالف گروہ باغی ہے، لہٰذا ان کی مدد کرنا ضروری ہے، لہٰذا انہوں نے اپنے اعتقاد کی رو سے باغی گروہ سے جنگ کی اور امام عدل کی مدد کرنے میں کوئی تاخیر روا نہ رکھی۔ جبکہ اس کے برعکس دوسرے گروہ کی اجتہادی کاوشوں نے ان پر یہ امر منکشف کیا کہ حق دوسری طرف ہے، لہٰذا ان کی مدد کرنا اور اس پر زیادتی کرنے والے گروہ سے جنگ ہم پر واجب ہے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جبکہ تیسرے گروہ کے سامنے یہ قضیہ الجھا رہا اور وہ اس بارے حیران ہو کر رہ گئے اور دونوں گروہوں سے کسی ایک گروہ کی ترجیح ان پر ظاہر نہ ہوئی، لہٰذا وہ غیر جانبدار ہو کر بیٹھ رہے اور ان کے حق میں یہ غیر جانبداری ہی واجب تھی اس لیے کہ کسی بھی مسلمان کے خلاف لڑائی کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ وہ اسی کا مستحق ہے۔ اگر ان لوگوں کے نزدیک کسی ایک فریق کا رجحان ظاہر ہو جاتا اور انہیں یہ علم ہو جاتا کہ حق اس کے ساتھ ہے تو ان کے لیے اس پر زیادتی کرنے والوں سے لڑائی کر کے اس کی مدد کرنے سے ہاتھ کھینچ لینا جائز نہ ہوتا۔"[4]

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قاتل کون ہے؟

ابو العادیہ جہنی اپنی طرف سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے جنگ صفین کے موقع پر دونوں گروہوں کی صفوں کے درمیان ایک آدمی کی سرین پر نیزہ مارا تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑا اور اس کے سر سے خود گر گئی پھر میں نے اس پر تلوار کا وار کیا تو پتا چلا کہ یہ تو عمار کا سر ہے پھر اسے قتل کر ڈالا۔ جہنی نے پانی مانگا تو اسے شیشے کے برتن میں پانی دیا گیا مگر اس نے اس برتن میں پانی پینے سے انکار کر دیا پھر اسے پیالے میں پانی ڈال کر دیا گیا تو اس نے پی لیا۔ یہ منظر دیکھ کر ایک آدمی نے کہا: ... اسے دیکھو کہ یہ شیشے کے برتن میں تو پانی پینے سے پرہیز کرتا ہے مگر اس نے عمار کو قتل کرنے سے پرہیز نہیں کیا۔[5]

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرمارہے تھے: عمار کا قاتل اور ان کے جسم سے ہتھیار اتارنے والا جہنمی ہے۔"[6] ابن کثیر فرماتے ہیں: "یہ بات سبھی کے علم میں ہے کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما صفین کے دن علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے اور انہیں اہل شام سے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے قتل کیا ان کے قاتل کا نام ابو الغادیہ تھا، ایک (شاذ) قول کی رو سے وہ صحابی تھا۔"[7] ابن حجر فرماتے ہیں: "ان جنگوں میں شریک صحابہ کرام کے بارے میں یہ گمان رکھنا چاہیے کہ وہ تاویل کنندہ تھے اور غلطی کرنے والے مجتہد کے لیے اکہرا اجر ہے۔ جب یہ اصول عام لوگوں کے لیے ثابت ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بطریق اولیٰ ثابت ہے۔"[8]

امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رافضیوں کے نزدیک ابن ملجم آخرت میں ساری مخلوق سے زیادہ بدنصیب ہو گا۔ جبکہ اہل سنت اس کے لیے جہنم کی امید کرتے اور اسی امر کو جائز بتاتے ہیں کہ اگر اللہ چاہے تو اس سے درگزر کر سکتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا عقیدہ خوارج اور رافضیوں جیسا نہیں ہے اور اس کا حکم عثمان رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ، عمار رضی اللہ عنہ، خارجہ رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں والا ہے۔ ہم ان سب سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ کے لیے ان سے بغض رکھتے ہیں ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔"[1] ابن حجر رحمہ اللہ کے اس قول کے بارے میں شیخ البانی فرماتے ہیں: "ان کا یہ قول مبنی برحق ہے مگر امت کے ہر فرد پر اس کا اطلاق مشکل ہے، اس لیے کہ اس طرح قاعدہ مذکورہ اس حدیث کے مناقض ہو گا: "عمار کا قاتل اور ان کے جسم سے ساز و سامان اتارنے والا جہنمی ہے۔"[2] اس لیے کہ یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ عمار کے قاتل ابو غادیہ کو اجر و ثواب سے نوازا جائے گا، کیونکہ اس نے عمار رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کرتے ہوئے قتل کیا تھا اور یہ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "عمار کا قاتل جہنمی ہے۔"[3] دریں حالات یہ کہنا صائب ہو گا کہ یہ قاعدہ صحیح ہے الا یہ کہ کوئی قطعی دلیل اس کے خلاف پر دلالت کرے تو وہ صورت اس سے مستثنیٰ ہو گی جیسا کہ اس جگہ ہے۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ اس قاعدہ کی رو سے صحیح حدیث کو مسترد کر دیا جائے۔[4] ابو الغادیہ جہنی کے حالاتِ زندگی میں ابن عبد البر فرماتے ہیں: اس کے نام میں اختلاف ہے، ایک قول کی رو سے اس کا نام یسار بن سعید ہے، دوسرے قول کی رو سے یسار بن ازہر اور تیسرے قول کی رو سے اس کا نام اسلم ہے، وہ شام میں سکونت پذیر تھا، واسط میں بھی رہائش پذیر رہا، اس نے بچپن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا، اس سے اسی کا یہ قول مروی ہے کہ میں نے بچپن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا یہ فرمان سنا تھا: ((لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ))[5] "میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔" یہ شخص عثمان رضی اللہ عنہ کا محب تھا اور وہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قاتل ہے، وہ ان کے قتل کا واقعہ بے دھڑک بیان کیا کرتا تھا، اہل علم کے نزدیک اس کا یہ واقعہ بڑا تعجب خیز ہے۔[6]

۷۔ دورانِ جنگ طرفین کا قابل قدر رویہ:

جنگ صفین مسلمانوں میں ایک عجیب و غریب واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، یہ واقعہ اس حد تک انوکھا ہے کہ اس کا قاری جو کچھ پڑھتا ہے اس کی تصدیق نہیں کر سکتا اور طرفین کے رویے کے سامنے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ہر فریق جنگ کے دوران اپنے موقف کی صحت پر مکمل یقین رکھتے ہوئے تلوار لہرائے کھڑا ہے، یہ معرکہ ایسا نہیں تھا جسے قیادت کی طرف سے لشکر پر مسلط کر دیا گیا ہو اور وہ اس سے کسی حد تک بھی مطمئن نہ ہو، بلکہ یہ اپنے اسباب، طریقہ کار اور نتائج کے اعتبار سے بڑا انوکھا اور یکتا معرکہ تھا، اس میں شریک ہونے والے دینی اعتبار سے ایک دوسرے کے بھائی تھے، وہ پانی

کے گھاٹ پر ایک ساتھ جاتے اور سب مل کر پانی پیتے اور اگر اسی دوران رش زیادہ ہو جاتا تو وہ پھر بھی ایک ساتھ پانی پیتے اور ایک دوسرے کو کوئی تکلیف نہ دیتے[1] اور پھر جب جنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا جاتا تو وہ بھائیوں کی طرح ایک ساتھ رہتے سہتے۔ اس جنگ میں شریک ایک شخص کا بیان ہے: جب ہم لڑائی موقوف کر دیتے تو ایک دوسرے کے کیمپ میں چلے جاتے اور باہم باتیں کرتے[2] اور وہ سب ایک ہی قبیلہ کے لوگ تھے اور ہر ایک کا اپنا اپنا اجتہاد تھا، ایک ہی قبیلہ کے لوگ طرفین میں منقسم ہو کر تباہ کن لڑائی کرتے، ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو حق پر خیال کرتا اور اپنے اندر اس کے لیے لڑنے کی پوری پوری استعداد رکھتا۔ دو آدمی باہم لڑتے رہتے یہی پھر جب لڑتے لڑتے تھک جاتے تو تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کر لیتے اور اسی دوران جی بھر کر باتیں بھی کر لیتے اور پھر دوبارہ اٹھ کر لڑنا شروع کر دیتے۔[3]

حالانکہ وہ ایک ہی دین کے پیروکار تھے اور وہ انہیں اپنی جانوں سے کہیں بڑھ کر محبوب تھا، پھر جب نماز کا وقت ہوتا تو وہ اس کی ادائیگی کے لیے جنگ کو موقوف کر دیتے۔[4] عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی نماز جنازہ دونوں طرف کے لوگوں نے ادا کی۔[5] اس جنگ میں شریک ہونے والے ایک دوسرے شخص کا بیان ہے کہ ہم صفین میں خیمہ زن ہوئے تو کئی دن لڑتے رہے جس کے نتیجہ میں بہت سارے لوگ مارے گئے، اس پر علی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا کہ مقتولین کو دفن کر لیں تو انہوں نے ان کی اس بات کو تسلیم کر لیا، اور پھر انہوں نے باہم گھل مل کر لاشوں کی تجہیز و تکفین اور تدفین کا فریضہ سرانجام دیا۔ اسی دوران وہ برائی سے اجتناب کی بھی سختی سے تاکید کرتے رہے۔ صفین کے مقام پر اہل عراق اور اہل شام سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں پر مشتمل ایک جماعت بھی موجود تھی جو قراء کے لقب سے مشہور تھی، وہ نہ تو علی رضی اللہ عنہ بن ابو طالب کے ساتھ تھے اور نہ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہی۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ہم نکلیں گے تو تمہارے ساتھ مگر تمہارے لشکر میں شامل نہیں ہوں گے۔ ہم الگ رہ کر تمہارے اور اہل شام کے معاملات کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ اگر فریقین میں سے کسی نے کوئی ناجائز کام کیا یا اس سے کسی زیادتی کا صدور ہوا تو ہم اس کے خلاف جائیں گے، جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ یہ دینی سوجھ بوجھ اور دانست کے علم کا نتیجہ ہے اور اسے پسند نہ کرنے والا ظالم اور خائن ہے۔[6]

۸۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک:

جنگ صفین کے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک پر مبنی رویہ فریقین کے نزدیک ایک بدیہی امر تھا۔ اسلام نے قیدیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے معاملہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کی عزت کرنے اور گنجائش کے مطابق انہیں اچھے طریقے سے اچھا کھانا کھلانے کی ترغیب دی ہے، یہ کریمانہ رویہ تو غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ مطلوب ہے اور اگر وہ مسلمان ہوں تو یقیناً ان کا اکرام کرنا اور ان کے ساتھ احسان کرنا بطریقِ اولیٰ ہو گا۔ مگر چونکہ اس جنگ میں قیدی کو اپنی جماعت کی قوت کے طور سے دیکھا جاتا تھا۔[1] لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے اسے قید میں رکھا جاتا اگر وہ آپ رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لیتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا اور اگر اس سے انکار کرتا تو اس سے اس کا اسلحہ اور سواری لے لی جاتی، اور یہ چیزیں اسے قیدی بنانے والے کو دے دی جاتیں اور اس سے یہ حلف لیا جاتا کہ وہ آئندہ ہمارے خلاف جنگ نہیں کرے گا، ایک روایت میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ اسے چار درہم عطا فرماتے۔[2] خلیفہ راشد کا مقصد اس سے بالکل واضح تھا اور وہ تھا باغی گروہ کے پلڑے کو کمزور کرنا۔ جنگ صفین کے موقع پر ایک قیدی کو لایا گیا تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا: مجھے باندھ کر قتل نہ کرنا، آپ رضی اللہ عنہ نے

فرمایا: میں تجھے اس طرح قتل نہیں کروں گا، مجھے اللہ رب العالمین سے خوف آتا ہے۔ پھر آپ نے اسے رہا کرتے ہوئے فرمایا: کیا تجھ سے کسی خیر کی امید کی جاسکتی ہے۔[3] مذکورہ صدر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جنگی قیدیوں کے ساتھ معاملہ اس طرح سے تھا:

☆قیدی کی عزت کرنا اور اس پر احسان کرنا۔

☆اسے بیعت کرنے اور اطاعت امیر کے دائرہ میں داخل ہونے کی دعوت دینا اور یہ دعوت قبول کرنے کی صورت میں اسے چھوڑ دینا۔

☆بیعت سے انکار کی صورت میں اس کے ہتھیاروں پر قبضہ کر لینا اور آئندہ جنگ نہ کرنے کے حلف پر اسے آزاد کر دینا۔

☆اور اگر وہ جنگ کرنے پر مصر رہے تو دوران قید اس کی نگہداشت کرنا اور اسے باندھ کر قتل نہ کرنا۔[4]

ایک دفعہ علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پندرہ قیدی پیش کیے گئے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ زخمی تھے۔ اگر ان میں سے کوئی مر جاتا تو آپ اسے غسل دیتے، کفن پہناتے اور اس کی نماز جنازہ پڑھتے۔[5] محب الدین خطیب اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس کے باوجود یہ شامی جنگ انسانی تاریخ کی وہ پہلی جنگ ہے جس میں دونوں متحارب گروہوں نے ان اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاس داری کی جن پر عمل درآمد کرنے کے لیے مغربی دانشور متمنی رہے ہیں چاہے ایسا اکیسویں صدی میں ہی ہو پائے۔ اسلام میں بیشتر جنگی قوانین کی تدوین اسی جنگ کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکی اور اللہ کا ہر امر مبنی بر حکمت ہوا کرتا ہے۔[1] ابن عدیم فرماتے ہیں: یہ باغیوں کے لیے احکامات ہیں۔ اس لیے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ رویہ ہمارے سامنے نہ آتا تو کسی کو مسلمانوں کی جنگوں میں سیرت و کردار کا علم نہ ہوتا۔[2]

جنگ صفین میں مقتولین کی تعداد:

اس جنگ میں مقتولین کی تعداد کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، ابن ابی خیثمہ ذکر کرتے ہیں ان کی تعداد ستر ہزار تھی، ان میں پچیس ہزار اہل عراق سے اور پینتالیس ہزار شام سے تھے۔[3] جبکہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کی تعداد ستر ہزار یا اس سے بھی زائد تھی۔[4]

ہمارے نزدیک یہ شماریات غیر حقیقی بلکہ محض خیالی ہیں۔ اس لیے کہ حقیقی اور عام جنگ محض تین دن جاری رہی اور اسی دوران بھی جمعہ کی رات کے علاوہ رات کے وقت اسے موقوف کر دیا جاتا، اس اعتبار سے جنگ کا دورانیہ صرف تیس گھنٹے تھا۔[5]

یہ جنگ جس قدر بھی شدید تھی جنگ قادسیہ سے زیادہ شدید نہ تھی جس میں شہداء کی کل تعداد ساڑھے آٹھ ہزار سے زائد نہیں تھی۔[6] علاوہ ازیں مقتولین کی اس بھاری تعداد پر مشتمل روایات کو عقل بھی قبول کرنے سے قاصر ہے۔

[1]العواصم من القواصم، ص: ۱۶۸،۱۶۹. [2] بغیۃ الطالب فی تاریخ حلب: ۱/۳۰۹۔ خلافۃ علی، ص: ۲۴۵. [3] الانباء للقضاعی، ص: ۵۹ نقلاً عن خلافۃ علی رضی اللہ عنہ، ص: ۲۴۵. [4] الصواعق المرسلۃ: ۱/۳۷۷، بدون سند، تحقیق محمد دخیل اللہ. [5] الدولۃ الاموية، ص: ۳۶۰،۳۶۲ .

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے مقتولین کی خبر گیری اور ان کے بارے میں جذبہ رحم:

امیر المومنین علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ جنگی کارروائیوں کے اختتام پر مقتولین کی خبر گیری کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے، ایک چشم دید گواہ کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہباء خچر پر سوار مقتولین کے درمیان گھوم رہے ہیں،[7] اس دوران اشتر بھی آپ کے ساتھ تھا، آپ کا گزر ایک ایسے مقتول پر ہوا جس کا شمار شام کے مشہور قاضیوں اور عبادت گزاروں میں ہوتا تھا، اسے دیکھ کر اشتر یا عدی بن حاتم کہنے لگا: امیر المومنین: کیا حابس[8] بھی ان کے ساتھ مارا گیا؟ اللہ کی قسم! اس کے بارے میں میرا تجربہ یہ ہے کہ یہ شخص مومن تھا۔ یہ سن کر علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے: آج یہ واقعی مومن ہے۔ غالباً یہ مقتول شخص وہی قاضی تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: امیر المومنین! میں نے ایک پریشان کن خواب دیکھا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: کون سا خواب؟ وہ کہنے لگا: میں نے خواب میں دیکھا کہ سورج اور چاند باہم لڑ رہے ہیں اور آدھے ستارے سورج کے ساتھ ہیں اور آدھے چاند کے ساتھ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: تو کس کے ساتھ تھا؟ اس نے کہا: میں چاند کے ساتھ تھا۔ اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً﴾ (الاسراء: ۱۲) "اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا۔" تو یہاں سے چلا جا اور آئندہ کے لیے میرا کوئی کام نہ کرنا۔ راوی کہتا ہے: مجھے یہ خبر ملی ہے کہ یہ شخص معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ساتھ شامل ہو کر جنگ صفین میں مارا گیا۔[1] علی رضی اللہ عنہ اپنے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے مقتولوں کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگے: اللہ تعالیٰ تم سب کی مغفرت فرمائے، اللہ تم سب کی مغفرت فرمائے۔[2] یزید بن اصم کہتے ہیں: فریقین میں صلح طے پا جانے کے بعد علی رضی اللہ عنہ اپنے مقتولین کے پاس آئے اور کہنے لگے: یہ سب لوگ جنتی ہیں، پھر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقتولین کے پاس جا کر کہنے لگے: یہ بھی جنتی ہیں؛ یہ ذمہ داری مجھ پر اور معاویہ رضی اللہ عنہ پر عائد ہوتی ہے۔[3] علی رضی اللہ عنہ ان مقتولین کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: یہ سب مومن ہیں۔[4] آپ جنگ جمل میں کام آنے والوں کے بارے میں بھی یہی کچھ فرمایا کرتے تھے۔[5]

شاہ روم کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ روم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے زیر تصرف بعض اراضی پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنایا اور اس کے لیے وہ ایک بڑا لشکر لے کر بعض بلاد اسلامیہ کے قریب آن پہنچا۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس کے نام یہ خط لکھا: اے ملعون! اللہ کی قسم! اگر تو اپنے اس پروگرام سے باز نہ آیا اور یہاں سے واپس نہ گیا تو میں اور میرے عم زاد مل کر تجھے تیرے تمام شہروں سے نکال باہر کریں گے اور زمین کو اس کی وسعت کے باوجود تجھ پر تنگ کر دیں گے، شاہ روم نے جب یہ خط پڑھا تو وہ ان کی ہیبت سے ڈر کر واپس ہٹ گیا اور پھر ان کے ساتھ صلح کی درخواست کرنے لگا۔[6] یہ اثر اس بات پر دلالت کرتا ہے اگر شام میں دولتِ اسلامیہ کا امن خطرات سے دوچار ہوتا ہے تو معاویہ رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کا اختلاف لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں رہتا اور اگر رومیوں کو اس بات کا علم نہ

ہو تا کہ ان کے مخالفین کے یہ اختلافات نسیلِ مطلق کے قابل ہیں، تو وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس دھمکی کو سنجیدگی سے نہ لیتے اور نہ وہ آگے بڑھنے سے ہی باز آتے۔[7]

جنگ صفین کے حوالہ سے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک بے سروپا واقعہ:

نصر بن مزاحم کہتا ہے: اہل عراق نے حملہ کیا تو اہل شام ان کے مقابلہ پر آئے اور بڑی دلجمعی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ جب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا تو ان کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ آن کھڑے ہوئے اور انہیں نیزہ مار کر گرا لیا جس سے ان کی شرم گاہ ننگی ہو گئی جس پر علی رضی اللہ عنہ واپس لوٹ گئے۔ لوگ کہنے لگے: امیر المومنین! آپ نے اسے ایسے ہی چھوڑ دیا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں معلوم ہے کہ وہ آدمی کون ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہیں، ان کی شرم گاہ کھل گئی تو میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔[1] اس واقعہ کو ابن الکلبی نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ جیسا کہ سہیلی نے روض الانف میں اس کا ذکر کیا ہے۔[2] مگر یہ واقعہ محض کذب و افتراء اور سراسر تہمت ہے۔ اس کی تردید مندرجہ ذیل حقائق سے ہوتی ہے: پہلی روایت کا راوی نصر بن مزاحم کوفی ہے جو کہ بڑا متعصب رافضی ہے۔ یہ ایک کذاب راوی ہے اور صحابہ کرام پر افتراء پردازی اس کا مشغلہ رہا ہے، اس کے بارے میں ذہبی فرماتے ہیں: نصر بن مزاحم کوئی متعصب رافضی ہے اور اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جاتا۔ ابو خیثمہ نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔[3] ابن حجر نے اس کے بارے میں عجلی کا یہ قول نقل کیا: وہ غالی قسم کا رافضی تھا... وہ نہ تو ثقہ ہے اور نہ قابل اعتماد ہی۔[4] جہاں تک کلبی کا تعلق ہے، تو اس کے غالی رافضی ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے کون اخذ و بیان کرتا ہے؟ میرا نہیں خیال کہ کوئی ایک شخص بھی اس سے بیان کرتا ہو۔ جبکہ دار قطنی نے اسے متروک قرار دیا ہے۔[5] ان دونوں رافضیوں کی سند سے یہ قصہ جگہ جگہ پھیل گیا اور ان کے بعد کے شیعہ اور بعض سنی مورخین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔[6] ہم اس قصہ کو رافضیوں کے اکاذیب اور اصحاب پیغمبر پر افتراءات کے نمونوں میں شمار کرتے ہیں۔ رافضی مؤرخین میں سے دشمنان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خود تراشیدہ بے شمار نقائص و عیوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کر دیئے اور پھر انہیں حکایات و واقعات کا رنگ دے دیا تا کہ انہیں مسلمانوں میں آسانی سے پھیلایا جا سکے۔ جس سے مقصود ان عظیم ہستیوں کی سیرت کو داغ دار کرنا اور ان کے مقام و مرتبہ کو گھٹانا تھا، جبکہ اہل سنت غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ جب وہ بہت بعد میں تاریخ اسلامی کی روایات کی تحقیق کے میدان میں اترے تو اس وقت تک ان خرافات و روایات کو قصہ گو لوگوں میں بڑی پذیرائی مل چکی تھی اور ان میں سے زیادہ تر کو اہل سنت کے مورخین کے نزدیک مسلّمات کی حیثیت دی جا چکی تھی۔[7]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صفین سے واپسی کے بعد قبروں کے پاس سے گزرنا:

جب امیر المومنین صفین سے واپس لوٹتے وقت قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: وحشت ناک اور غیر آباد گھروں کے رہنے والو! تم پر سلام ہو جو اہل ایمان اور اہل اسلام مردوں اور عورتوں میں سے ہیں۔ تم ہم سے بہت پہلے چلے آئے جبکہ ہم تمہارے پیچھے آنے والے اور عنقریب تمہیں ملنے والے ہیں، یا اللہ! ہمیں بھی معاف فرما اور انہیں بھی معاف فرما، اور اپنے لطف و کرم سے ہم سے بھی درگزر فرما اور ان سے بھی درگزر فرما۔ سب

تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے زمین کو زندوں اور مردوں کو سمیٹنے والی بنایا، سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے تمہیں پیدا کیا، وہ زمین پر ہی تمہیں اکٹھا کرے گا اور اسی میں سے تمہیں اٹھائے گا، اس شخص کو مبارک ہو جس نے آخرت کو یاد کیا، حساب کے لیے تیاری کی اور قناعت سے نوازا گیا۔[1]

جنگ جاری رکھنے پر قاتلین عثمان کا اصرار:

قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ اس بات کے شدت کے ساتھ خواہش مند تھے کہ یہ جنگ جاری رہے یہاں تک کہ دونوں طرف کے لوگ ختم ہو جائیں اور ان کی طاقت کمزور پڑ جائے اور اس طرح وہ قصاص اور سزا سے بچ جائیں۔ جب انہوں نے اہل شام کو نیزوں پر قرآن بلند کر کے آگے بڑھتے اور علی رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف سے صلح کی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے مسلمانوں کے خون بچانے کے لیے جنگ بند کرنے پر آمادہ دیکھا تو انہوں نے انہیں اس سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی مگر جب وہ اس میں ناکام ہوئے تو" الحکم للہ" کا نعرہ لگا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کر دی اور پھر طرفین سے الگ ہو کر بیٹھ گئے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مؤرخین نے اس مرحلہ پر ان کے کردار کو اپنی توجہ کا مرکز نہ بنایا، حالانکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے، نہ تو انہوں نے ان مذاکرات کی ناکامی کے پس پردہ امور کی نشاندہی کی جو کئی مہینوں تک جاری رہے اور نہ اس کردار کی پردہ دری کی جو جنگ صفین میں شامل ہونے والے ان حامیان علی رضی اللہ عنہ نے ادا کیا تاکہ طرفین میں جاری صلح کی کوششوں کو ناکام بنا دیا جائے۔ اس لیے کہ اگر علی رضی اللہ عنہ کی معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح ہو جاتی تو ان کی جانیں بچ نہ پاتیں، یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ جن مؤرخین نے جنگِ جمل کے فتنہ کے اسباب کی کھوج لگانے کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر ڈالیں وہ معرکہ صفین میں ایسا کرنے سے کیوں قاصر رہے۔[2]

سیّدنا علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرنے اور اہل شام کو لعن طعن کرنے سے منع کرتے:

مروی ہے کہ جب امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی کہ ان کے دو ساتھی معاویہ رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرتے اور اہل شام کو لعن طعن کرتے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ وہ دونوں آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: امیر المومنین! کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں، مجھے رب کعبہ کی قسم! وہ گویا ہوئے: تو پھر آپ ہمیں ایسا کرنے سے کیوں روکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ تم لعن طعن کرنے والے بن جاؤ۔ تم یہ دعا کیا کرو: اے اللہ! ہمارے اور ان کے خون محفوظ فرما، ہمارے معاملات کی اصلاح کیجیے، اور انہیں گمراہی سے دور لے جائیے۔[1] اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قنوت میں معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب و رفقاء پر لعنت کیا کرتے اور معاویہ رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ پر لعنت کیا کرتے تھے تو یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شارع علیہ السلام کے احکام پر سختی کے ساتھ عمل پیرا تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو گالی گلوچ کرنے اور ان پر لعن طعن کرنے سے منع فرمایا ہے۔[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن پر لعنت کرنا اسے قتل کرنے کے مترادف ہے۔"[3] اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مومن لعن طعن کرنے والا نہیں ہوتا۔"[4] اور آپ صلی اللہ علیہ

وسلم ہی کا ارشاد گرامی ہے: ''لعنتیں کرنے والے قیامت کے دن نہ تو کسی کی شفاعت کر سکیں گے اور نہ کسی کے حق میں گواہی دے سکیں گے۔''[5] علاوہ ازیں طرفین کے سر کردہ لوگوں کی ایک دوسرے پر لعنت کرنے کی مذکورہ روایت سند کے اعتبار سے بھی ثابت نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا ایک راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ رافضی ہے جس کی روایات قابل اعتماد نہیں ہیں، مزید براں روافض کے نزدیک ان کی صحیح ترین کتابوں میں بھی صحابہ کرام کو گالی گلوچ کرنے سے نہی وارد ہے، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کار کو گالیاں دینے والوں کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا: میں تمہارے لیے اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ تم گالیاں دینے والے بن جاؤ، اگر تم اس کی بجائے ان کے اعمال و اوصاف کا تذکرہ کرو تو یہ زیادہ بہتر رہے گا، تم انہیں گالی گلوچ کرنے کی بجائے یہ دعا کیا کرو: یا اللہ! ہمارے اور ان کے خون کی حفاظت فرما اور ہمارے آپسی معاملات کی اصلاح فرما۔[6] سب وشتم اور تکفیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وطیرہ نہیں تھا، جس کا اعتراف اہل تشیع کی صحیح ترین کتب میں بھی کیا گیا ہے۔[7]

چھٹی بحث:

حسن بن علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما کے عہد میں

عبد الرحمن بن ملجم مرادی خارجی کے ہاتھوں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رمضان ۴۰ھ میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی امیر المومنین کے طور سے بیعت ہوئی۔[1] جن کا آپ کے والد کے بعد لوگوں نے انتخاب کیا تھا، عبد اللہ بن سبع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرمارہے تھے: میری داڑھی کو میرے سر کے خون سے رنگ دیا جائے گا۔ بدنصیب میرے بارے میں کیا انتظار کر رہا ہے۔[2] لوگوں نے کہا: امیر المومنین! آپ اپنے قاتل کے بارے میں ہمیں آگاہ فرمائیں، ہم اس کے قرابت داروں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ آپ نے فرمایا: اس طرح تو تم میرے بدلہ میں میرے قاتل کے علاوہ کسی اور کو قتل کر دو گے۔ انہوں نے کہا: آپ کسی کو ہمارا خلیفہ مقرر کر دیں، انہوں نے فرمایا: نہیں، میں تمہیں اس کے لیے چھوڑ جاؤں گا جس کے لیے تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا تھا۔ وہ کہنے لگے: جب اپنے رب کے پاس جاؤ گے تو اس وقت کیا کہو گے؟ فرمایا: میں یہ کہوں گا کہ میرے اللہ! جب تک تو نے چاہا مجھے ان میں باقی رکھا پھر تو نے مجھے اپنی طرف قبض کر لیا اگر تو چاہے تو ان کی اصلاح کر دے اور اگر چاہے تو انہیں خراب کر دے۔[3] دوسری روایت میں ہے: میں کہوں گا: یا اللہ! جب تک تو نے چاہا مجھے ان کا خلیفہ بنائے رکھا پھر تو نے مجھے قبض کر لیا اور میں تجھے ان میں چھوڑ آیا۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ چار تکبیروں کے ساتھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور انہیں کوفہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ حسن رضی اللہ عنہ کی سب سے پہلے قیس بن سعد نے بیعت کی، انہوں نے کہا: اپنا ہاتھ آگے بڑھائیں میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور عہد شکن لوگوں کے ساتھ قتال پر آپ سے بیعت کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: کتاب اللہ اور اس کے نبی کی سنت پر، اس لیے کہ یہ ہر شرط کا احاطہ کرتی ہے، چنانچہ اس نے آپ سے بیعت کی اور خاموش ہو گیا اس کے بعد دوسرے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔[5] جب اہل عراق نے آپ سے بیعت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے ان

سے فرمایا: تم میری بات سنو گے بھی اور میری اطاعت بھی کرو گے جس سے میں صلح کروں گا اس سے تم بھی صلح کرو گے اور جس سے میں جنگ کروں گا اس سے تم بھی جنگ کرو گے۔[6]

دوسری فصل

بیعت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی اہم صفات اور نظام حکومت

پہلی بحث:

بیعت معاویہ رضی اللہ عنہ، ان کی اہم صفات اور علماء کی طرف سے ان کی تعریف

(ا)... بیعت معاویہ رضی اللہ عنہ

سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دستبرداری کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے منصب خلافت سنبھالنے کے تمام عوامل مکمل اور کل اسباب فراہم ہو گئے، ۴۱ھ میں امیر المومنین کے طور پر ان سے بیعت کی گئی اور اس سال کو عام الجماعۃ کے نام سے موسوم کیا گیا[1] اور پھر وہ امت کے ذہن میں اسی نام کے ساتھ محفوظ ہو گیا، یہ واقعہ امت کے قابل فخر کارناموں میں شمار ہوتا ہے جس پر وہ آج تک نازاں و فرحاں ہے۔ اس سال معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت پر امت کا اتفاق ہوا اور اس نے انہیں اپنے امیر کے طور سے پسند کر لیا، اس ہمہ گیر وحدت و یگانگت پر درد دل رکھنے والے مسلمانوں کو دلی خوشی ہوئی۔ امت اسلامیہ پر اولاً تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا اور پھر اس عظیم اصلاحی پروگرام کے منصوبہ ساز سیّد کبیر حضرت حسن بن علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما کا یہ احسان عظیم تھا۔ عام الجماعۃ دلیل نبوت بھی ہے اور حسن رضی اللہ عنہ کے فضائل میں سے ایک کھلی اور روشن فضیلت بھی۔ عقاد نے اپنے جس قول میں ان تمام مورخین کو گمراہ اور جاہل بتایا ہے جنہوں نے اس سال کو عام الجماعۃ کے نام سے موسوم کیا تو ان کا یہ قول غیر صحیح فہم کا نتیجہ ہے، لہٰذا نا قابل التفات ہے۔[2] عقاد یہ غلط فیصلہ کرنے والا پہلا شخص نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے اکثر شیعہ مورخین بھی یہ بات کہہ چکے ہیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے یہی فخر کافی ہے کہ ان کے زمانے میں تمام بقید حیات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان سے بیعت کی، معاویہ رضی اللہ عنہ پر امت کا اجماع ہوا اور علماء صحابہ و تابعین نے ان سے بیعت کی، ان کی خلافت کو شرعی قرار دیا، ان کی امامت کو پسند کیا۔ ان کے نزدیک معاویہ رضی اللہ عنہ ہی وہ بہترین فرد تھے جو مسلمانوں کے معاملات کو سرانجام دینے اور اس مرحلہ میں ان کا حق ادا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند تھے۔ اوزاعی سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ خلافت معاویہ کا دور متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پایا، مثلاً سعد، اسامہ، جابر، ابن عمر، زید بن ثابت، مسلمہ بن مخلد، ابو سعید خدری، رافع بن خدیج، ابو امامہ، انس بن مالک اور متعدد دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ یہ سب لوگ ہدایت کے چراغ اور علم کے ظروف تھے۔ جنہوں نے نزول قرآن کا مشاہدہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر اخذ کی۔ اس دور کو پانے والے تابعین میں سے مسور بن مخرمہ، عبد الرحمن بن الاسود بن عبد یغوث، سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن محیریز سر فہرست ہیں۔ رحمہم اللہ[3]

ابن حزم فرماتے ہیں: پہلے حسن رضی اللہ عنہ سے بیعت کی گئی اور پھر یہ معاملہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا گیا۔ جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو بدون اختلاف ان دونوں سے افضل تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے فتح سے قبل خرچ بھی کیا اور قتال بھی۔ ان سب لوگوں نے اوّل سے آخر تک معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کی اور ان کی خلافت کو درست تسلیم کیا۔[1]

یقیناان اصحاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس وقت ہی بیعت کی جب انہوں نے دیکھا کہ ان میں عدالت سمیت امامت کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص معاویہ رضی اللہ عنہ کی عدالت و امامت پر طعن کرتا ہے، جس شخص کو ان عظیم لوگوں نے اپنے دین اور دنیا کے لیے پسند اور قبول کیا تو کیا اسے ہم قبول نہ کریں اور اسے ہم پسند نہ کریں؟ ان میں سے جس نے یہ کہا کہ شاید انہوں نے کسی خوف کے پیش نظر ان سے بیعت کی ہو گی، تو یہ ان نفوس قدسیہ پر بزدلی اور کتمان حق کی تہمت ہے جو کہ یقیناناروا ہے، وہ تو ایسے لوگ ہیں جن کی شجاعت و بسالت سے ہر کوئی آگاہ ہے اور یہ کہ وہ اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پروا نہیں کیا کرتے تھے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنا اپنے اندر تشتت و افتراق سے نہی پر مشتمل قرآنی آیات کا گہرا فہم اور درس بلیغ رکھتا ہے، مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ اَنَّ ہٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ o﴾ (الانعام: ۱۵۳)

"اور یہ کہ یہ دین میرا سیدھا راستہ ہے، پس تم اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر نہ چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس کا اللہ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیز گاری اختیار کرو۔" صراط مستقیم سے مراد قرآن، اسلام اور فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا فرمایا، اور سبل سے مراد نفسانی خواہشات، فرقے اور بدعات و خرافات ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں: سبل سے مراد بدعات، شبہات اور گمراہیاں ہیں۔[3] اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اختلاف اور تفرق جیسی ان چیزوں سے منع فرمایا جن میں گزشتہ امتیں مبتلا ہو گئیں اور یہ اس امر کے بعد ہوا جب ان کے پاس واضح دلائل آئے اور اللہ نے ان پر کتابیں اتاریں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَہُمُ الْبَیِّنٰتُ وَاُولٰٓئِکَ لَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ o﴾ (آل عمران: ۱۰۵)

"اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آ جانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا، انہی لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔" اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اختلاف سے بچنے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

"اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ فرقہ مت بنو۔"

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی کامیاب صلح سے شریعت کا وہ عظیم مقصد پورا ہو گیا جو مسلمانوں کی وحدت اور اجتماع سے عبارت ہے جو کہ زمین میں اللہ کے دین کو موثر اور طاقت ور بنانے کا اہم ترین ذریعہ ہے جبکہ ہم ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرنے اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنے کے پابند ہیں۔ مسلمانوں کے مابین حقیقی اصلاح کے لیے اسلامی تحریکوں کے قائدین، داعی حضرات اور مسلم علماء و طلباء کی کاوشوں کو مربوط کرنا اور ان کا ایک دوسرے کی مدد کرنا از حد ضروری ہے۔ اس لیے کہ کسی مسئلہ کا آدھا حل اصلاح سے زیادہ بگاڑ پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ مسلمانوں کے باہمی تعاون اور ان کی وحدت کے وجوب پر دلالت کرنے والی قرآنی آیات اور احادیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: سب سے بڑا جہاد مسلمانوں کے دلوں کو جوڑنا، انہیں ان کے دین پر اکٹھا کرنا اور ان کی دینی اور دنیوی مصالح کے لیے کوششیں کرنا ہے۔[1] ابو سعید اور مجالد[2] سے مروی یہ مزعومہ حدیث ہر گز قابل التفات نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم معاویہ رضی اللہ عنہ کو میرے منبر پر دیکھو تو اسے قتل کر دو۔"[3] اس لیے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کا ایک راوی علی بن زید ضعیف ہے۔ جبکہ مجالد بھی ضعیف ہے۔ اس حدیث کو حکم بن ظہیرہ[4] کے طریق سے بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ متروک ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو سب سے پہلے اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمل کرتے اس لیے کہ وہ اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پروا نہیں کیا کرتے تھے۔[5]

ا۔ عہد خلافت راشدہ کا اختتام:

خلافت راشدہ علی منہاج النبوۃ کے دور کا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہونے کے ساتھ اختتام ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تک اللہ چاہے گا تم میں نبوت باقی رہے گی، پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھالے گا، پھر خلافت علی منہاج النبوۃ قائم ہو گی اور وہ جب تک اللہ چاہے گا باقی رہے گی پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھالے گا، پھر بادشاہت قائم ہو گی اور جب تک اللہ چاہے گا وہ باقی رہے گی، پھر جب اللہ اسے اٹھانا چاہے گا اٹھالے گا۔ اس کے بعد جبری بادشاہت قائم ہو گی اور جب تک اللہ چاہے گا وہ باقی رہے گی اور پھر جب چاہے گا اسے اٹھالے گا۔ اس کے بعد پھر خلافت علی منہاج النبوۃ قائم ہو گی۔" پھر آپ خاموش ہو گئے۔[6] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی صراحتاً فرمایا: "خلافتِ نبوت تیس سال تک رہے گی پھر اللہ جسے چاہے گا اسے بادشاہت یا اپنی بادشاہت عطا فرمائے گا۔"[7] اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "میری امت میں خلافت تیس سال تک رہے گی پھر اس کے بعد بادشاہت قائم ہو جائے گا۔"[1] اور خلافت کی یہ تیس سالہ مدت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت پر پوری ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو وفات پائی اور حسن رضی اللہ عنہ ربیع الاوّل ۴۱ھ میں خلافت سے دستبردار ہوئے، اس طرح یہ مدت تیس سال بنتی ہے اور یہ خبر دلائل نبوت میں سے ایک اہم دلیل ہے۔[2]

یہ حدیث نبوی مندرجہ ذیل تاریخی مراحل کی طرف اشارہ کرتی ہے:

الف:... عہد نبوت ب:... خلافت راشدہ کا دور

ج:... متشددانہ بادشاہت کا دور د:... جابرانہ بادشاہت کا دورہ:...

بعد ازاں خلافت علی منہاج النبوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی وضاحت فرمادی کہ پہلے خلافت نبوت و رحمت ہو گی اور پھر بادشاہت و رحمت۔ خلفائے راشدین کے بعد کے حکمران اگرچہ بادشاہ تھے مگر انہیں خلفاء کے نام سے موسوم کرنا بھی جائز ہے۔ مگر وہ انبیاء کے خلفاء نہیں تھے۔ اس کی دلیل ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی، جب ایک نبی موت سے دوچار ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی آ جاتا، اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور عنقریب خلفاء ہوں گے اور بکثرت ہوں گے۔ لوگوں نے کہا: آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پہلے سے وفاداری کرو، پھر اس کے بعد والے کی، اور انہیں ان کا حق دو، اللہ ان سے ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں ضرور سوال کرے گا۔"[3] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "وہ بکثرت ہوں گے" اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد خلفاء راشدین کے علاوہ دیگر خلفاء ہیں، اس لیے کہ وہ زیادہ نہیں تھے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول: "پہلے کی بیعت کا ایفاء کرو پھر اس کے بعد والے کی بیعت کا اور انہیں ان کا حق دو۔" اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اختلاف کریں گے جبکہ خلفاء راشدین کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "انہیں ان کا حق دو اور اللہ ان سے ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں دریافت کرنے والا ہے۔" اہل سنت کے اس مذہب کی دلیل ہے کہ امراء کو مال اور غنیمت سے ان کا حق ادا کرنا چاہیے۔[4] معاویہ رضی اللہ عنہ اس امت کے افضل ترین بادشاہ ہیں اور ان سے پہلے کے لوگ خلفائے نبوت ہیں، معاویہ رضی اللہ عنہ کی بادشاہت، بادشاہت بھی تھی اور رحمت بھی چونکہ ان کی بادشاہت میں رحمت بھی تھی، حلم و حوصلہ بھی اور مسلمانوں کی منفعت بھی، لہٰذا وہ دوسروں کی بادشاہت سے بہت بہتر تھی۔[5] معاویہ رضی اللہ عنہ پرہیز گار عالم اور عابد تھے البتہ ان میں یہ صفات خلفائے راشدین سے کم تھیں۔ یہ تفاوت اولیاء میں بھی ہے بلکہ فرشتوں اور انبیاء میں بھی ہے، ان کی امارت اگرچہ اس بنا پر صحیح تھی کہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع تھا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے مگر وہ گزشتہ خلافت کے منہاج پر نہیں تھی، معاویہ رضی اللہ عنہ نے مباحات میں بڑی وسعت اختیار کی جبکہ خلفاء اربعہ ان سے احتراز کیا کرتے تھے، اسی طرح عبادات و معاملات میں بھی ان کا رجحان کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔[1] ابن خلدون کا کہنا ہے کہ اگرچہ خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو گئی تھی مگر اس میں خلافت کی بعض خصوصیات باقی تھیں، جو نظام حکومت پہلے دینی تھا اب وہ عصبیت اور شمشیر زنی میں تبدیل ہو گیا مگر خلافت کے اہداف و مقاصد باقی رہے۔ اس دوران شریعت اسلامیہ کے مطابق عدل کا دور دورہ تھا اور اسلامی احکامات کے مطابق واجبات شرعیہ کا التزام کیا جاتا تھا، یعنی حکومت یا بادشاہت اسلامی اور شرعی تھی۔[2] ابن خلدون خلافت کے مختلف ادوار کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: آغاز کار میں خلافت بادشاہت کی آمیزش کے بغیر معرض وجود میں آئی، پھر اس کے معانی و خصوصیات میں التباس پیدا ہو گیا اور اس کی بادشاہت کے ساتھ آمیزش ہو گی۔[3] ابن خلدون جس پہلے دور کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ خلفاء راشدین کا دور ہے اور وہ خالص یا کامل خلافت کا کارنامہ ہے۔ جب کہ دوسرا دور اموی اور عباسی خلفاء کا ہے، اس میں عثمانی دور حکومت کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ بادشاہت کے ساتھ مخلوط خلافت یا خلافت کے ساتھ مخلوط بادشاہت کا ہے، یعنی ایسی بادشاہت جو مقاصدِ خلافت کی نگہبان تھی۔ جبکہ تیسرا دور محض بادشاہت کا دور ہے جس سے مقصود بادشاہت کی قدامت کا حصول اور دنیوی اغراض و مقاصد کی تکمیل تھا اور یہ حقیقت خلافت یا اس کی دینی خصوصیات سے بہت دور تھی۔[4]

حقیقی یا کامل خلافت یا خلافتِ نبوت تیس سال تک جاری رہی اور یہ خلفاء راشدین کا زمانہ ہے، پھر خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو گئی مگر اس دور میں خلافت کلیتاً ناپید نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے معانی یا مقاصد باقی تھے تبدیلی اس اساس میں ہوئی تھی جس پر وہ قائم تھی جہاں تک اس کی حقیقت کا تعلق

ہے تو وہ باقی تھی، گویا کہ یہ تبدیلی کلی نہیں بلکہ جزئی تھی، اس کی مزید وضاحت اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ عصر اوّل میں خلافت کامل اور مثالی تھی پھر بعض وجوہات سے اس کی مثالیت میں نقص در آیا مگر اس کے زیادہ تر عناصر باقی رہے، یہ کم درجہ کی خلافت تھی یا بادشاہت سے مخلوط خلافت تھی۔[5] اسلام میں عمومی رائے مثالی خلافت، خلافت نبوت یا خلافت کاملہ سے وابستہ ہے اور یہ شوریٰ اور امت کے انتخاب و اختیار تام پر قائم ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خلافت کا بادشاہوں اور ان کے نائبین، ولاۃ، امراء اور قضاۃ کے ہاتھوں میں آجانا صرف ان میں موجود نقص کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ یہ نقص ان کے ساتھ ساتھ ان کی رعیت میں بھی موجود تھا اس لیے کہ جس طرح کی رعایا ہوتی ہے ان پر حکمران بھی ویسے ہی مسلط کیے جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ (الانعام: ۱۲۹)

"اور اسی طرح ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں اس لیے کہ وہ برے کام کرتے تھے۔" جب خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو گئی تو امراء و حکام میں نقص پیدا ہو گیا، صرف انہی میں نہیں بلکہ یہ اہل علم اور اہل دین میں بھی پیدا ہو گیا، جمہور صحابہ خلفاء اربعہ کی خلافت کے اختتام کے ساتھ ختم ہو گئے یہاں تک کہ اہل بدر میں سے چند لوگ باقی رہ گئے تھے۔ جمہور تابعین اصاغر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کے آخر میں ختم ہو گئے اور جمہور تبع تابعین کا وجود دولت امویہ کے آخر اور دولت عباسیہ کے اوائل میں ناپید ہو گیا تھا۔[1]

۲۔ کیا معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار بارہ خلفاء میں ہوتا ہے؟

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں اپنے باپ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا تو میں نے آپ کو فرماتے سنا: "یہ امر اس وقت تک ختم نہیں ہو گا جب تک ان میں بارہ خلفاء نہیں گزریں گے۔" پھر آپ نے ایسی بات کی جو مجھ پر مخفی رہی، میں نے اپنے باپ سے دریافت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟ انہوں نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے۔"[2] جابر رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری روایت میں ہے: "اسلام بارہ خلفاء تک غالب رہے گا ان سب کا تعلق قریش سے ہو گا۔"[3] انہی سے مروی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: "یہ دین بارہ خلفاء تک غالب اور محفوظ رہے گا، وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے۔"[4] سنن ابو داود میں جابر سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر واپس تشریف لائے تو قریش آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے: پھر قتل و قتال اور فتنہ کا دور دورہ ہو گا۔"[5] ابن کثیر اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس حدیث میں بارہ نیک خلفاء کی بشارت دی گئی ہے جن کے زمانے میں حق قائم رہے گا اور عدل ہوا کرے گا، اس سے ان کا پے در پے آنا لازم نہیں آتا، بلکہ ان میں سے چار تو یکے بعد دیگرے آئے اور وہ ہیں خلفاء اربعہ: ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم۔ ائمہ کرام کے نزدیک حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا شمار بھی ان خلفاء میں ہوتا ہے، بعض عباسی خلفاء بھی اس زمرے میں آتے ہیں، ظاہر یہ ہے کہ امام مہدی کا شمار بھی ان بارہ خلفاء میں ہوتا ہے جن کی احادیث میں بشارت دی گئی ہے۔ یقیناً یہ وہ مہدی نہیں ہیں جن کا رافضی انتظار کر رہے ہیں اور جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ اس وقت موجود ہیں اور سامراء کے تہہ خانہ سے ظاہر ہوں گے۔[6] اس لیے کہ اس بات کی نہ تو کوئی حقیقت ہے اور نہ اس کا کوئی وجود ہی۔ یہ محض کم عقلی کا شاخسانہ اور محض توہم و خیال ہے۔ اسی طرح ان

بارہ خلفاء سے مراد شیعہ کے بارہ امام بھی نہیں ہیں۔[7] نص کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بارہ خلفاء خلافت سنبھالیں گے، ان کے ادوار میں اسلام غالب اور محفوظ رہے گا، لوگوں کا ان پر اجتماع ہو گا اور لوگوں کے معاملات کامیاب اور درست رہیں گے۔ مگر ان اوصاف کا شیعہ کے بارہ اماموں پر انطباق نہیں ہوتا۔ ان میں امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی بھی خلیفہ نہیں بنا۔[1] پھر اس حدیث میں ائمہ کی اس تعداد کا حصر نہیں ہے بلکہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے آگاہ فرمایا ہے کہ ان کے زمانوں میں اسلام غالب، قوی اور محفوظ رہے گا اور اسلام کی ہر حالت خلفائے راشدین اور خلفائے بنو امیہ میں رہی۔[2] اسی لیے ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اموی دور حکومت میں اسلام مابعد کے ادوار کے مقابلہ میں زیادہ غالب اور وسعت پذیر رہا۔[3] امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار بھی ان بارہ خلفاء میں ہوتا ہے۔[4]

(۲)... معاویہ رضی اللہ عنہ کی اہم صفات

معاویہ رضی اللہ عنہ بہت ساری صفات کے ساتھ شہرت رکھتے ہیں۔ جن میں سے زیادہ اہم مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ علم وفقہ:

معاویہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل رفاقت سے علم و تربیت حاصل کی۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بکثرت احادیث روایت کیں، جن میں سے بعض کا قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے۔ امام بخاری اور مسلم نے ان سے روایات لی ہیں، حالانکہ ان کی شرط یہ ہے کہ وہ صرف فقیہ، ضابط اور صدوق راویوں سے ہی روایات اخذ کریں گے۔[5] عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی آپ کی فقاہت کی شہادت دی ہے۔ ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ ایک وتر پڑھتے ہیں، اس بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ انہوں نے فرمایا: وہ ٹھیک کرتے ہیں، وہ فقیہ ہیں۔[6] شارحین حدیث فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجتہد ہیں، ابن ملیکہ سے ہی مروی بخاری کی دوسری روایت میں ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے نماز وتر ایک رکعت ادا کی اس وقت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام ان کے پاس تھے وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور ان سے اس بات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا: انہیں چھوڑیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا شمار فضلاء صحابہ میں ہوتا ہے، ان کی وسعت علمی کی وجہ سے انہیں حبر الامۃ اور ترجمان القرآن کا لقب دیا گیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے علم و حکمت اور تاویل و تفسیر کی دعا کی اور اسے شرف قبولیت سے نوازا گیا، آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حلقہ خواص سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے مخالفین پر شدید تنقید کیا کرتے تھے، علی رضی اللہ عنہ نے انہیں خوارج کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے بھیجا تو انہوں نے انہیں لاجواب کر دیا۔ ان جیسا انسان معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے اجتہاد کی گواہی دے رہا ہے اور وہ اپنے آزاد کردہ غلام کو اس بنیاد پر انہیں تنقید کا نشانہ بنانے سے روک رہے ہیں کہ وہ صحابی رسول ہیں۔[1] مزید برآں معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی بھی تھے۔ مفتی حرمین احمد بن عبد اللہ بن محمد طبری "خلاصۃ السیر" میں رقمطراز ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبان وحی کی تعداد تیرہ تھی: خلفائے اربعہ، عامر بن فہیرہ، عبد اللہ بن ارقم، ابی بن کعب، ثابت بن قیس بن شماس، خالد بن سعید بن العاص، حنظلہ بن ربیع اسلمی، زید بن ثابت، معاویہ بن ابوسفیان

اور شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہم۔ ان میں معاویہ بن ابوسفیان اور زید رضی اللہ عنہم کو خصوصی حیثیت حاصل تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو اس کے لیے پابند کر رکھا تھا۔[2] فقہاء کرام کو ان کے اجتہاد پر مکمل اعتماد تھا اور وہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ان کے فقہی مذہب کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کا قول ہے: معاذ بن جبل، معاویہ اور سعید بن مسیب کا مذہب ہے کہ مسلمان کافر کا وارث بنے گا۔ اسی طرح ان کا قول ہے: دونوں یمانی رکنوں کا استلام حسن رضی اللہ عنہ یا حسین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے[3] اور یہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے صحیح طور پر ثابت ہے۔ صحابی ابودرداء رضی اللہ عنہ نے اہل شام سے فرمایا: میں نے تمہارے اس امام (معاویہ رضی اللہ عنہ) سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز پڑھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔[4] معاویہ رضی اللہ عنہ کو لوگوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ابو امامہ سہل بن حنیف سے مروی ہے: میں نے معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما سے سنا اس وقت وہ منبر پر بیٹھے تھے کہ موذن نے اذان دیتے وقت کہا: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اس کے جواب میں انہوں نے کہا: اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ موذن نے کہا: اشہد ان لا الہ الا اللہ، تو معاویہ نے بھی یہی کلمات دہرائے۔ موذن نے کہا: اشہد ان محمد رسول اللہ، تو معاویہ نے بھی یہی کلمات ادا کیے۔ جب موذن نے اذان مکمل کر لی تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگو! میں نے اسی جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اذان کے جواب میں وہی کچھ سنا جو کچھ اب تم نے مجھ سے سنا۔[5]

معاویہ رضی اللہ عنہ لوگوں کو دین میں سوجھ بوجھ حاصل کرنے کی ترغیب دلایا کرتے اور انہیں اس کی اہمیت کے بارے میں احادیث سنایا کرتے تھے۔ زہری سے مروی ہے کہ انہیں حمید نے بتایا کہ انہوں نے معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کو دوران خطبہ یہ کہتے سنا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: "اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا فرما دیتا ہے، میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ دیا کرتا ہے، اس امت کا معاملہ ہمیشہ سیدھا رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی، یا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے گا۔"[6] آپ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خط و کتابت کے ذریعے ان سے وہ احادیث سیکھا کرتے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت کی ہوتیں۔ وراد مولیٰ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے شعبہ کو خط لکھا کہ مجھے وہ چیز لکھ بھیجیں جو آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بعد پڑھتے سنی ہو۔ اس پر مغیرہ نے مجھے لکھوایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے: ((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ)) ابن جریج کہتے ہیں: مجھے کئی لوگوں نے خبر دی کہ اسے وراد نے اس کی خبر دی تھی۔ اس کے بعد میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو میں نے سنا کہ وہ لوگوں کو یہ دعا پڑھنے کی تلقین کیا کرتے ہیں۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ سنت نبویہ کی اتباع کے بڑے حریص تھے۔ سعید بن مسیب اور حمد بن عبدالرحمن بن عوف سے مروی ہے کہ جب معاویہ رضی اللہ عنہ آخری دفعہ مدینہ منورہ آئے تو آپ نے منبر نبوی پر فرمایا: اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن یوم عاشوراء کے بارے میں سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے جو شخص اس کا روزہ رکھنا چاہتا ہے وہ رکھ لے۔" دوسری روایت میں ہے: "اور میں روزے سے ہوں۔" اس پر لوگوں نے بھی یہ روزہ رکھنا شروع کر دیا۔[2] اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ ان جیسی چیزوں سے منع فرمایا کرتے تھے، انہوں نے اپنی آستین سے بالوں کا ایک گچھا نکالا اور فرمایا: بنی اسرائیل اس وقت ہلاک ہو گئے جب ان کی عورتوں نے اسے اپنانا شروع کر دیا۔[3] یعنی عورت کا اپنے بالوں کے ساتھ دوسرے بالوں کو ملانا۔ متعدد احادیث صحیحہ سے بال ملانے والی اور ملوانے والی عورتوں پر

لعنت ثابت ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے لوگوں سے کہا: تم نے بہت بری بدعت شروع کر رکھی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زُور[4] (جھوٹ) سے منع فرمایاہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام زُور اس لیے رکھا کہ اس میں تزویر اور تبدیلی کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان آثار واحادیث کی روشنی میں ہم دیکھ رہے کہ وہ عاشوراء کے روزہ کی سنت کے احیاء کی حرص کرتے ہیں۔ جسے لوگوں نے غیر اہم سمجھ رکھا تھا۔ اسی طرح وہ لوگوں میں رواج پکڑنے والی ایک بدعت کو ختم کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں اور وہ ہے مصنوعی بال لگانے کے حوالے سے یہودیوں کی بدعت کی تقلید کرنا۔[5] عبدالرحمن بن ہرمز الاعرج روایت کرتے ہیں کہ عباس بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے عبدالرحمن بن حکم سے اپنی بیٹی کا نکاح کروایا اور عبدالرحمن نے ان سے اپنی بیٹی کا نکاح کروادیا اور اسے ہی دونوں کا مہر قرار دے دیا۔ اس وقت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما خلیفہ تھے انہوں نے مروان کو ایک خط کے ذریعے سے حکم دیا کہ وہ ان دونوں میں تفریق کروائیں۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا کہ یہ وہ شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔[6] معاویہ رضی اللہ عنہ لوگوں کے انفرادی، معاشرتی اور خاندانی الغرض تمام معاملات میں اقامت سنت کی نگرانی کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔[7]

۲۔ حلم وحوصلہ اور عفوودرگزر:

امیر المومنین معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما حلم وحوصلہ کے حوالے سے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ غصہ ضبط کرنے اور لوگوں سے عفوودرگزر کرنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ آپ کے حلم وحوصلہ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ کسی شخص نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بدکلامی کا مظاہرہ کیا تو ان سے کہا گیا: آپ اس کی گرفت کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے جواب دیا: مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ اپنی رعیت کے کسی آدمی کے گناہ کی وجہ سے میرے حلم وحوصلہ کا دائرہ تنگ ہو جائے۔ اصمعی رحمہ اللہ ثوری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ کسی کا گناہ میرے حلم وحوصلہ سے بڑا ہو، میرے حلم سے جہالت بڑی ہو یا میں کسی کی پردہ داری نہ کروں۔ ایک دفعہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بنوامیہ! حوصلہ مندی کی وجہ سے قریش سے ممتاز رہے، اللہ کی قسم! میں زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی سے ملاقات کرتا وہ مجھے جی بھر کر گالی گلوچ کرتا اور میں اس کے لیے جی بھر کر حلم وحوصلہ کا مظاہرہ کرتا اور جب میں واپس لوٹتا تو وہ میرا دوست بن چکا ہوتا، پھر اگر میں اس سے مدد کا خواستگار ہوتا تو وہ میری مدد کرتا، میں اس کے ساتھ مل کر کسی پر حملہ آور ہونا چاہتا تو وہ میرے ساتھ ہوتا، نہ صرف یہ کہ حلم وحوصلہ شریف انسان کی شرافت میں کمی نہیں لاتا بلکہ اس سے اس کی عزت وتوقیر میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ انہیں کا قول ہے: آدمی اس وقت تک صاحب رائے قرار نہیں پاتا جب تک اس کا حلم اس کی جہالت پر اور اس کا صبر اس کی شہوت پر غالب نہ آجائے، آدمی اس مقام پر صرف حلم کی قوت سے ہی پہنچ سکتا ہے۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا: سب سے بڑا سردار کون ہوتا ہے؟ فرمایا: وہ کہ جب اس سے سوال کیا جائے تو سب سے بڑھ کر سخی ہو، مجالس ومحافل میں سب سے زیادہ بااخلاق ہو اور جہالت کے مقابلہ میں حلم وحوصلہ کا مظاہر کرنے والا ہو۔[2] معاویہ رضی اللہ عنہ اکثر یہ شعر گنگنایا کرتے تھے:

۱۔ فماقتل السفاہۃ مثل حلم یعود بہ علی الجھل الحلیم

۲۔ فلاتسفه وان ملئت غیظاً علی احد فان الفحش لُؤم

۳۔ ولاتقطع اخالک عند ذنب فان الذنب یغفرہ الکریم [3]

۱۔ "سفاہت وحماقت کو ختم کرنے کے لیے حلم وحوصلہ جیسی کوئی چیز نہیں ہے، حلیم الطبع انسان اس کے ساتھ ہی اس کا علاج کیا کرتا ہے۔"

۲۔ "تجھے جس قدر بھی غصہ دلایا جائے کسی کے خلاف بھی حماقت کا مظاہرہ نہ کرنا اس لیے کہ فحش گوئی لائق ملامت ہوتی ہے۔"

۳۔ "گناہ کی وجہ سے اپنے بھائی سے قطع تعلقی نہ کرنا، کریم لوگ گناہوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔" معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے نائب زیاد کو لکھا: سب لوگوں کے ساتھ ایک ہی جیسا رویہ اپنانا مناسب نہیں ہے۔ اگر ان کے ساتھ نرمی ہی برتی جائے تو اکڑ جاتے ہیں اور اگر سختی ہی کی جائے تو یہ بھی نقصان دہ ہے، تم شدت، سختی اور ترش روئی پر مبنی رویہ اختیار کرو جبکہ میں نرمی، رحمت اور الفت پر مبنی طرز عمل اختیار کرتا ہوں تاکہ اگر کوئی خوف محسوس کرے تو اسے کوئی ایسا دروازہ مل جائے جس سے وہ داخل ہو سکے۔[4]

ذہانت وفطانت اور حیلہ گری:

وہ اوصاف حمیدہ جن میں معاویہ رضی اللہ عنہ امتیازی شان کے حامل ہیں ان میں سر فہرست ان کا رعب ودبدبہ ذہانت وفطانت اور حیلہ گری ہے۔ آپ کی انتظامی صلاحیتوں اور حسن تدبیر کے حوالے سے منقول ہے کہ ان کے زمانہ میں مسلمانوں نے ایک جنگ میں شرکت کی تو ان کے بعض ساتھیوں کو قیدی بنالیا گیا، جب انہیں شاہ روم کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے ان میں سے کسی قیدی کے ساتھ بات چیت کی۔ اس وقت شاہ روم کے سامنے ایک پادری کھڑا تھا وہ آگے بڑھا اور اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا، جس قیدی کو تھپڑ مارا گیا وہ قریشی تھا، اس سے یہ توہین برداشت نہ ہو سکی اور وہ وہیں کھڑے کھڑے پکار اٹھا: ہائے اسلام! معاویہ تم کہاں ہو؟ تم نے ہمیں بے یار ومددگار چھوڑ دیا، ہماری سرحدوں کو ضائع کر دیا اور ہمارے دشمن کو ہمارے خون اور عزتوں کے بارے فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا۔ جب یہ خبر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملی تو اس سے انہیں اس قدر شدید دکھ پہنچا کہ لذیذ خوراک لینے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ لوگوں سے میل جول ترک کر دیا مگر کسی کو اس واقعہ سے مطلع نہ کیا اور پھر حیلہ گری سے کام لیتے ہوئے اسے اور اس کے دیگر قیدی ساتھیوں کو فدیہ دے کر رومیوں سے رہا کروالیا، رہائی کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے پاس بلایا، اس کی جی بھر کر خدمت کی اور فرمایا: ہم نے نہ تو تجھے ضائع کیا اور نہ تیرے خون اور تیری عزت کو کسی کے لیے مباح قرار دیا، اسی دوران وہ رومیوں کے ہاتھوں اپنے ایک مسلمان مجاہد کی بے عزتی کا انتقام لینے کے بارے میں مختلف پہلوؤں پر سوچ وبچار کرنے میں مصروف رہے۔ آخر کار انہوں نے ساحل دمشق سے بحری جنگوں کے حوالے سے ایک تجربہ کار شخص کو اپنے پاس بلایا اور اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے اسے بڑے محتاط انداز میں کامیاب بنانے کے لیے کہا۔ پھر دونوں کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ وہ بھاری رقوم خرچ کر کے مختلف قسم کی عمدہ اشیاء خورد ونوش، خوشبو اور جواہرات خریدے گا اور پھر ان کے ذریعے سے بادشاہ تک رسائی حاصل کرے گا، اس مقصد کے لیے اس نے بڑی عمدہ اور تیز رفتار کشتی بھی تیار کروائی۔ وہ آدمی یہاں سے روانہ ہو کر قبرص پہنچا اور اس کے رئیس سے رابطہ کر کے اسے بتایا کہ وہ تجارت کی غرض سے قسطنطنیہ جانا چاہتا ہے اور بادشاہ اور اس کے خواص سے ملاقات کا ارادہ رکھتا

ہے۔ جب بادشاہ کو اس کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے اسے ملاقات کی اجازت دے دی۔ اس نے بادشاہ سے ملاقات کے موقع پر اسے اور اس کے درباری پادریوں کو قیمتی تحائف دیئے مگر اس قریش کو تھپڑ مارنے والے پادری کی طرف التفات تک نہ کیا اور یہ سب کچھ اسی پروگرام کے مطابق ہوا جو معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے تیار کیا تھا۔ جب وہ شام واپس آنے لگا تو ان پادریوں نے اسے اپنے لیے مختلف قسم کی چیزیں خرید کر لانے کو کہا۔ وہ آدمی شام واپس آیا تو خفیہ طور سے معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملا انہیں اپنے سفر کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور رومی درباریوں کی طلب کردہ اشیاء کے بارے میں بتایا، معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی طلب کردہ اور پسندیدہ چیزیں خرید کر انہیں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اب شام واپسی پر جب تو اس پادری سے ملاقات کرے گا تو وہ تجھ سے تیرے گزشتہ رویے کے بارے میں شکایت کرے گا مگر تو نے اس سے اس پر معذرت کرنا اور اسے تحائف دے کر اپنے سے مانوس کرتے ہوئے شام میں اپنے معاملات کا نگران بنالینا اور پھر دیکھنا کہ وہ تم سے کون سی اشیاء کا مطالبہ کرتا ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ خفیہ سفیر رومی شاہی دربار کے لوگوں کی مطلوبہ اشیاء کے ساتھ جب قسطنطنیہ پہنچا اور ان کی فرمائش کردہ چیزوں سے بھی زیادہ اشیاء انہیں پیش کیں تو اس کی قدر و منزلت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور بادشاہ اور اس کے حاشیہ برداروں تک اس کی رسائی ہو گئی۔ جب وہ ایک دن بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو شاہی دربار میں وہ پادری اس سے کہنے لگا: میں نے تیرا کیا گناہ کیا ہے، تو دوسروں کو تو نوازے چلا جا رہا ہے جب کہ مجھے تو کسی توجہ کا مستحق نہیں سمجھتا؟ اس نے کہا: میں تمہارے ملک میں ایک اجنبی شخص ہوں، مجھے یہ خوف لاحق ہے کہ مسلمانوں کے جاسوس کہیں میرے بارے میں دوسرے مسلمانوں کو آگاہ نہ کر دیں اگر ایسا ہوا تو میری موت یقینی ہے۔ اب جبکہ مجھے اپنی طرف تیرے میلان کا علم ہو چکا ہے تو میں چاہوں گا کہ یہاں تو ہی میرے تمام امور کی نگرانی کرے اور بادشاہ کے پاس بھی تو ہی میرے جملہ معاملات نمٹائے، تجھے سرزمین اسلام سے جس چیز کی بھی ضرورت ہو اگر تو مجھے حکم دے تو میں وہ سب چیزیں تجھے مہیا کر سکتا ہوں، پھر اس نے پادری کو خوشبو، ہیرے جواہرات اور قیمتی ملبوسات تحائف کی صورت میں پیش کیے، جس سے اس نے اس کا دل جیت لیا، وہ بار بار روم سے حضرت معاویہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے روم آتا جاتا رہا اور ہر بار اس پادری کو گراں قدر تحائف پیش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اس کا پورا پورا اعتماد حاصل کر لیا، پھر ایک دن لوگوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ وہ زنجیروں میں جکڑا معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کھڑا تھا۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس قریشی کو لایا جائے، جب اسے ان کی خدمت میں حاضر کیا گیا تو اس وقت ان کے مقربین بھی ان کے پاس اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے جب مجلس بھر گئی تو آپ نے قریشی سے فرمایا اٹھو اور اس پادری سے بدلہ لے لو جس نے شاہ روم کے بھرے دربار میں تمہارے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ ہم نے نہ تو تمہیں ضائع کیا اور نہ تمہاری عزت اور خون کو کسی کے لیے مباح قرار دیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے قریشی نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا، پھر وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا، جس نے تجھے رئیس بنایا اس نے تیرا اچھا فیصلہ کیا۔ تم بے مثل حکمران ہو، اپنی چراگاہ کی حفاظت کرنا اور اپنی رعیت کی پاسداری کرنا جانتے ہو، پھر انہوں نے پادری کو اس کے لیے اور اس کے بادشاہ کے لیے کئی تحائف دے کر واپس روانہ کر دیا۔ اس طرح معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی عقل و فکر کا بھرپور انداز میں استعمال کرتے ہوئے اپنی فوج کے ایک سپاہی کی بے عزتی کا انتقام لے کر اسے خوش کر دیا، مگر پادری کو بھی صرف اس کے کیے کی سزا دی اور اس پر کسی قسم کی زیادتی کا ارتکاب نہ کیا۔ دوسری طرف جب وہ پادری نادر اور قیمتی تحائف کے ساتھ شاہ روم کے پاس پہنچا تو بادشاہ اور اس کے مقربین نے اسے مسلمانوں سے رہائی پر مبارک باد دی اور پھر کہنے لگا، یہ عربوں کا بارعب اور بڑا سمجھ دار حکمران ہے اگر وہ تجھے بھی گرفتار کرنا چاہتا تو اس کا یہ حیلہ بھی کامیاب ہوتا۔[1]

یہ واقعہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی فہم و بصیرت، حسن سیاست، رعایا کے امور کو اہمیت دینے اور اس کے ہر فرد کے حقوق اور اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنے کی اہم دلیل ہے۔

۴۔ عقل و دانش اور معاملہ فہمی کی قدرت:

معاویہ رضی اللہ عنہ بڑی گہری عقل و فکر کے مالک تھے، معاملات کی گہرائی تک رسائی میں خصوصی قدرت رکھتے تھے۔ پیش آمدہ احداث و واقعات سے بھرپور استفادہ کرتے اور اس امر سے بخوبی آگاہ ہوتے کہ ان سے بچاؤ کیسے کرنا ہے اور اگر وہ سر پر آن پڑیں تو ان سے بچ نکلنے میں کیسے کامیاب ہونا ہے۔ آپ شام پر بیس سال تک امیر اور پھر بیس سال تک منصب خلافت پر فائز رہے۔[2] چالیس سال پر محیط اس طویل عرصہ میں وہ فوجی مناصب پر بھی فائز رہے اور شہری ولایت پر بھی۔ جس نے انہیں ملکی سیاست میں بڑا وسیع تجربہ حاصل کرنے اور پیش آمدہ ہر طرح کے حالات و واقعات سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا، یہاں تک کہ ان کی حکومت کے آخری بیس سالوں میں ان سے جھگڑا کرنے والا کوئی ایک فرد بھی باقی نہ رہا۔[3] شیخ خضری فرماتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ کو سیاست میں گہرا اثر و نفوذ حاصل تھا، آپ عرب کے ذہن ساز تھے اور حلم و حوصلہ میں کوئی شخص بھی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔[4] یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کامیاب سیاست کا دار و مدار قہر و غضب کے وقت ضبط نفس پر قدرت اور مشکلات کا سامنا کرنے کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ جبکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس سے وافر حصہ میسر آیا تھا، اور ان کی یہ سیاست عوام و خواص کے ساتھ ایک جیسی تھی، بادشاہوں کے ساتھ بھی ان کی سیاسی روش وہی تھی جو اپنے ماتحت لوگوں کے ساتھ، اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

ا:... مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور ان کا معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض:

عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ وہ ایک وفد کی صورت میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے میری ضرورت پوری کر دی، پھر مجھے علیحدگی میں بلا کر کہنے لگے: مسور! تم ائمہ پر لعن طعن کیا کرتے تھے اب اس کا کیا بنا؟ انہوں نے جواب دیا: ہمارے بارے میں درگزر سے کام لیں اور ہم سے جو کچھ ہوا اسے جانے دیں۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، اللہ کی قسم، تمہیں میرے عیوب و نقائص کے بارے میں بتانا ہو گا۔ مسور کہتے ہیں ان کے اصرار پر میں نے وہ تمام عیوب ان کے سامنے گنوا دیئے جو میں ان پر لگایا کرتا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: گناہ سے تو کوئی بھی بری نہیں ہے مگر کیا تم میرے وہ اصلاحی اقدامات بھی گنوا سکتے ہو جو میں نے عوام الناس کے لیے سرانجام دیئے اس لیے کہ نیکی کا اجر دس گنا ملتا ہے؟ یا تو میرے گناہ ہی گنتا رہے گا اور نیکیوں کو طاق نسیان پر رکھ دے گا؟ مسور کہنے لگے: ہم صرف انہی گناہوں کا ذکر کرتے ہیں جنہیں تم بھی دیکھ رہے ہو۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اللہ کے سامنے اپنے ہر گناہ کا اعتراف کرتے ہیں مگر کیا تم نے بھی کوئی ایسا گناہ کیا ہے کہ اگر اللہ نے تمہیں وہ گناہ معاف نہ کیا تو وہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا؟ مسور نے اس کا جواب اثبات میں دیا تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں کون سی چیز نے اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ تم مجھ سے زیادہ مغفرت کی امید کرتے ہو؟ اللہ کی قسم! تم مجھ سے زیادہ اصلاحی امور سرانجام نہیں دیتے ہو۔ اللہ کی قسم! میں نے ہمیشہ اللہ کو اس کے علاوہ ہر چیز پر پسند کیا اور میں اس دین کا پیروکار ہوں جس میں اللہ تعالیٰ عمل کو پسند کرتا ہے، حسنات کا بدلہ دیتا ہے اور گناہوں کی سزا دیتا ہے مگر جسے چاہے اسے معاف بھی فرما دیا کرتا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے

امید رکھتا ہوں کہ وہ ہر نیکی کا بدلہ کئی گنا دے گا، بحمد اللہ میں اللہ کے لیے ایسے بڑے بڑے امور سر انجام دیتا ہوں جنہیں نہ تو تم شمار کر سکتے ہو اور نہ ہی وہ میرے شمار میں ہیں۔ مثلاً اقامت صلاۃ کا اہتمام کرنا، فی سبیل اللہ جہاد کرنا، بما انزل اللہ کے مطابق فیصلے کرنا اور علاوہ ازیں متعدد امور۔ مسور نے کہا: مجھے معلوم ہو گیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے میرے پاس ان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ حضرت عروہ فرماتے ہیں: اس کے بعد مسور نے جب بھی معاویہ رضی اللہ عنہ کو یاد کیا ان کے لیے بخشش کی دعا کی۔[1] اس خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ لوگوں کو مطمئن کرنے اور مخالفین کے غصے کو فرو کرنے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسور بن مخرمہ کو اپنی سیاسی حکمت عملی کو قبول کرنے پر نہ صرف یہ کہہ کر آمادہ کر لیا بلکہ وہ اس سے مطمئن بھی ہو گئے اور اگر پہلے وہ ان پر جارحانہ انداز میں تنقید کیا کرتے تھے تو اب نہ صرف یہ کہ ان کی مدح وستائش کرنے لگ گئے بلکہ ان کے لیے دعائیں بھی کرنے لگ گئے۔ اس خبر میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے جس تربیتی پہلو کی طرف توجہ دلائی وہ یہ ہے کہ بندہ مسلم کے لیے عادلانہ رویہ یہی ہے کہ جہاں وہ حکمرانوں کی برائیوں اور خطاؤں پر نظر رکھتا ہے وہاں ان کی نیکیوں اور اچھائیوں کو بھی پیش نظر رکھا کرے اور پھر ان دونوں پہلوؤں میں موازنہ کرے، ہو سکتا ہے کہ جن حکمرانوں پر وہ تنقید کے تیر برساتے رہتا ہے انہوں نے اتنے بڑے بڑے نیک اعمال کیے ہوں جن کے مقابلہ میں ان کے گناہ نہ ہونے کے برابر ہوں۔[1]

ب:... ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ:

ثابت بن قیس بن خطیم رضی اللہ عنہ بڑے خوددار شخص تھے۔ انہوں نے علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہ کر ابتلا و آزمائش کے دن بسر کیے۔ پھر انہوں نے انہیں مدائن کا عامل مقرر فرمایا اور وہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے کوفہ آنے تک اس منصب پر فائز رہے۔ ایک دن ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اپنے گھر گئے تو دیکھا کہ انصار بنو ظفر کی مسجد میں جمع ہو کر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے حقوق کے بارے میں خط لکھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے ان سے دریافت کیا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہم معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھنا چاہتے ہیں۔ فرمایا: ان کے نام ایک جماعت کے خط لکھنے سے تمہیں کیا حاصل ہو گا؟ انہیں ہم میں سے ایک آدمی خط لکھے اس لیے کہ اگر تم میں سے کسی ایک کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم سب کے ساتھ کچھ ہو اور تمہارے نام بھی ان کے پاس چلے جائیں۔ وہ کہنے لگے: ہمارے لیے یہ قربانی کون دے گا؟ ثابت نے کہا: اس کے لیے میں حاضر ہوں۔ انہوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا اور اپنی ذات سے آغاز کرتے ہوئے کئی باتوں کا تذکرہ کیا، مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اور آگے چل کر لکھا: آپ نے ہمارے حقوق روک کر رکھے ہیں، ہم پر سرکشی اور زیادتی کی جبکہ ہمارا گناہ صرف یہی ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و معاونت کی۔ جب یہ خط معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملا تو انہوں نے اسے یزید کے حوالے کر دیا، اس نے وہ خط پڑھا اور پھر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا: اسے اس کے گھر کے دروازے کے سامنے سولی پر چڑھا دیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے شامی اکابرین سے اس بارے مشورہ کیا تو وہ کہنے لگے: اسے پیغام بھیج کر یہاں بلائیں اور اسے اپنے حواریوں اور معززین کے سامنے کھڑا کریں تاکہ وہ اسے اچھی طرح دیکھ لیں اور پھر اسے سولی پر چڑھا دیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی اور تجویز بھی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر انہوں نے ثابت رضی اللہ عنہ کے نام یہ خط لکھا: میں نے تمہارے خط کا مفہوم سمجھ لیا ہے۔ آپ مجھے تین دن کی مہلت دیں جب یہ خط ثابت کو ملا تو انہوں نے اسے پڑھ کر اپنی قوم کو سنایا۔ ابھی چوتھے دن کی صبح ہی ہوئی تھی کہ ان کی

طرف سے ارسال کردہ عطیہ ان کے ہاتھوں میں تھا۔[2] اس خبر سے معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمت و سیاست کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب انہوں نے اپنے بیٹے یزید اور شام کے بعض سر کردہ لوگوں سے مشورہ کیا اور ان سے ان کی رائے مانگی تو آپ کو ان کی رائے پسند نہ آئی اور ان کے اس موقف کو تسلیم نہ کیا کہ لوگوں کے ساتھ سختی سے نمٹ جائے اور ان پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالا جائے۔ اس کے برعکس آپ نے فوراً انصار مدینہ کے پاس ان کے لیے عطیات بھجوائے اور خط میں اختیار کردہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے سخت لہجہ پر ان کا کوئی مواخذہ نہ کیا۔ اس حکیمانہ تصرف اور سیاست رشیدہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کا کچھ نہیں بگاڑا تھا، بلکہ انہوں نے فیاضی پر مبنی رویہ اختیار کر کے انصار کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ ان سب لوگوں کی خوشنودی بھی حاصل کر لی جو اس خبر سے مطلع ہوئے اگر وہ سادہ لوح شدت پسندوں کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ پر سختی کرتے تو انصار مدینہ ان کے خلاف بھڑک اٹھتے اور اسلام میں ان کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے دوسرے کئی مسلمان ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔[1]

د:... ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ:

ابن عبد البر الاستیعاب میں اپنی سند[1] سے ذکر کرتے ہیں کہ جب معاویہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ آئے تو ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے ان سے ملاقات کی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: ابو قتادہ، سب لوگ مجھ سے ملاقات کے لیے آتے ہیں مگر تم انصار نہیں آتے ہو، تمہیں ایسا کرنے سے کس چیز نے روک رکھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہمارے پاس سواریاں نہیں ہیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: تمہارے اونٹ کہاں ہیں؟ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہم نے انہیں جنگ بدر کے دن آپ کے اور آپ کے باپ کی تلاش میں کاٹ دیا تھا۔ انہوں نے کہا: ہاں ابو قتادہ، پھر ابو قتادہ کہنے لگے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا تھا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ترجیح دیکھیں گے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کیا کرنے کا حکم دیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: صبر کرنے کا۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: پھر تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات تک صبر کرو۔[2]

۵۔ تواضع اور پرہیز گاری:

معاویہ رضی اللہ عنہ جن صفات میں بڑی شہرت رکھتے ہیں ان میں سے ایک اہم صفت انکسار و تواضع ہے، وہ اپنے عام خطبات میں اس امر کا اعتراف کرتے تھے کہ لوگوں میں ان سے بہت بہتر اور افضل لوگ بھی موجود ہیں، حالانکہ اس وقت وہ مسلمانوں کی امارت کے منصب پر فائز تھے لوگوں کا ان پر اتفاق ہو چکا تھا اور وہ ان کے غیر متنازع امیر قرار پائے تھے، انہوں نے ایک دفعہ فرمایا: لوگو! میں تم سے بہتر نہیں ہوں، تم میں مجھ سے بہت بہتر لوگ بھی موجود ہیں جیسا کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ متعدد فضلیٰ کرام، مگر شاید میں ولایت کے حوالے سے تمہارے لیے زیادہ مفید، دشمن کے لیے ضرب کاری اور تمہاری منفعت کا زیادہ ادراک کرنے والا ثابت ہوں گا۔[3] امام احمد اپنی سند کے ساتھ ابو علی بن ابو حملہ سے روایت کی ہے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو دمشق میں منبر پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا اس وقت انہوں نے پیوند لگی قمیص زیب تن کر رکھی تھی۔[4] ان کی پرہیز گاری کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ اپنی

کسی لونڈی کو شہوت کی نظر سے دیکھا مگر انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اس سے جنسی تعلقات قائم کرنے سے قاصر ہیں، جو شخص اسے آپ کے پاس لے کر آیا تھا آپ نے اس سے فرمایا: اسے یزید بن معاویہ کے پاس لے جائیں، پھر کہنے لگے: نہیں، بلکہ میرے پاس ربیعہ بن عمرو جرشی کو لے کر آئیں۔ ربیعہ ایک فقیہ عالم دین تھے جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان سے فرمایا: جب اس لونڈی کو میرے سامنے پیش کیا گیا تو اس وقت یہ بے لباس تھی اور اس کے جسم کے فلاں فلاں حصے پر میری نظر پڑ گئی، لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ اسے یزید کے پاس بھیج دوں۔ اس پر ربیعہ کہنے لگے: امیر المومنین ایسا نہ کریں اس لیے کہ یہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے بہت اچھی رائے دی، پھر آپ نے وہ لونڈی عبد اللہ بن مسور فزاری کو ہبہ کر دی۔ یہ سیاہ فام تھے اور سیّدہ فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ نے اس سے فرمایا: اس سے سفید اولاد حاصل کریں۔[1] اس اثر کی تعلیق میں ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی فقہ اور ان کے محتاط رویہ کا نتیجہ ہے اس لیے کہ انہوں نے لونڈی کو شہوت کی نظر سے دیکھا تھا جس کی بنا پر اسے اپنے بیٹے یزید کو ہبہ کرنے میں حرج محسوس کیا اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (النساء: ۲۲)

"اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے آباء نے نکاح کیا ہو۔"

اور پھر ربیعہ بن عمرو جرشی دمشقی نے ان کے اس موقف کی تائید کر دی۔[2]

۶۔ اللہ کے ڈر سے رونا:

ایک دفعہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ مرفوع حدیث بیان کی گئی کہ قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے سب سے پہلے جن لوگوں کے ساتھ جہنم کی آگ کو بھڑکایا جائے گا وہ ہیں: دکھلاوا کرنے والا قاری، دکھلاوے کے لیے خرچ کرنے والا اور دکھلاوا کرنے والا مجاہد۔ اس حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں میں فیصلہ کرنے کے لیے ان میں نزول فرمائے گا اس وقت ہر امت نے گھٹنے ٹیک رکھے ہوں گے، سب سے پہلے ان لوگوں کو بلایا جائے گا: قرآن کا عالم، شہید فی سبیل اللہ اور متمول انسان۔ اللہ تعالیٰ عالم و قاری سے فرمائے گا: کیا میں نے تجھے ان چیزوں کا علم نہیں دیا تھا جنہیں میں نے اپنے رسولوں پر نازل کیا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں میرے پروردگار، اللہ فرمائے گا: تو نے جو کچھ سیکھا اس پر کیا عمل کیا؟ وہ جواب دے گا: میں شب و روز اس پر عمل کیا کرتا تھا۔ اللہ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے اور فرشتے بھی کہیں گے: تو جھوٹ بولتا ہے۔ تیرا مقصد یہ تھا کہ لوگ تجھے قاری کہیں اور یقیناً ایسا کہا گیا۔ پھر مال دار شخص کو لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: کیا میں نے تجھے اتنا زیادہ مال نہیں دیا تھا کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا؟ وہ جواب دے گا: میرے پروردگار! ایسا ہی ہوا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے میرے عطا کردہ مال کے ساتھ کیا کیا؟ وہ جواب دے گا: میں صلہ رحمی کرتا رہا اور صدقہ و خیرات کرتا رہا۔ اللہ فرمائے گا: تو کذب بیانی سے کام لے رہا ہے۔ فرشتے بھی کہیں گے: تو کذب بیانی سے کام لے رہا ہے، پھر اللہ فرمائے گا: بلکہ تیرا ارادہ یہ تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں اور یقیناً ایسا کہا گیا، پھر اس شخص کو لایا جائے گا جسے اللہ کی راہ میں شہید کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: تجھے قتل کیوں کیا گیا؟ وہ جواب دے گا: تو نے

اپنے راستے میں جہاد کرنے کا حکم دیا تھا، لہٰذا میں نے تیرے حکم کی وجہ سے جہاد کیا یہاں تک کہ مجھے قتل کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: تو جھوٹ بول رہا ہے، فرشتے کہیں گے: تو جھوٹ بول رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بلکہ تو نے اس لیے قتال کیا کہ لوگ تجھے دلیر کہیں اور یقیناً تجھے دلیر کہا گیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ٹخنوں پر مارتے ہوئے فرمایا: ابوہریرہ! اللہ کی مخلوق سے یہ تین وہ پہلے لوگ ہوں گے جن کے ساتھ قیامت کے دن جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنی تو فرمانے لگے: جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تو پھر باقی لوگوں کے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟ پھر وہ اس قدر زیادہ روئے کہ ان کے آس پاس کے لوگوں کو خیال ہوا کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے، پھر جب انہیں کچھ افاقہ ہوا تو اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہنے لگے: اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ o اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ o﴾ (ہود: ۱۵۔۱۶)[1]

"جو شخص دنیا کی زندگی اور اس کی زینت پر فریفتہ ہوا چاہتا ہو تو ہم ان کو ان کے اعمال کا بدلہ یہیں بھرپور انداز میں دے دیتے ہیں اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں اور جو انہوں نے یہاں کیا ہو گا سب ضائع ہے اور جو ان کے اعمال تھے سب ضائع ہونے والے ہیں۔"

(۳)... علماء کی طرف سے معاویہ رضی اللہ عنہ کی تعریف وتوصیف اور اُموی دَور کا "خیر القرون" میں شامل ہونا

۱۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "تم قیصر وکسریٰ اور ان کے رعب ودبدبہ کی بات کرتے ہو جبکہ تمہارے پاس معاویہ رضی اللہ عنہ موجود ہیں۔"[2]

ابو محمد اموی فرماتے ہیں: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شام کی طرف روانہ ہوئے تو دیکھا کہ معاویہ ایک مجمع کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے آرہے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: معاویہ! تم صبح بھی مجمع میں کرتے ہو اور اس جیسے مجمع میں شام بھی، اور مجھے یہ خبر ملی ہے کہ ضرورت مند تمہارے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا: امیر المومنین! دشمن ہم سے بہت قریب ہے، اور اس کے جاسوس ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔

امیر المومنین! میں چاہتا ہوں کہ وہ اسلام کی عزت اور شان وشوکت کا مشاہدہ کریں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ ایک دانا شخص کی تدبیر ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: امیر المومنین! آپ مجھے جو بھی حکم دیں گے میں اس کی تعمیل کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

معاویہ! میں نے جب بھی کسی مسئلہ میں آپ پر اعتراض کیا آپ نے مجھے اس حالت میں لا کھڑا کیا کہ مجھے یہ نہیں پتا چلتا کہ آپ کو اس کا حکم دوں یا اس سے منع کروں۔[1]

۲۔ علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کو ناپسند نہ کرو، اللہ کی قسم! اگر تم نے انھیں گم پایا تو تم ایسے سر دیکھو گے جو کندھوں سے اندرائن کی طرح گر رہے ہوں گے۔[2] اس اثر میں امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اپنے اصحاب کو تلقین کرتے نظر آتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کو کراہت کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔

۳۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی کو سردار نہیں دیکھا۔ میں نے کہا: عمر رضی اللہ عنہ کو بھی نہیں؟ انہوں نے فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ ان سے بہتر تھے جبکہ معاویہ رضی اللہ عنہ ان سے بڑے سردار تھے۔[3] دوسری روایت میں ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑا سردار نہیں دیکھا۔ ان سے دریافت کیا گیا: ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بھی نہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم ان سے بہتر تھے مگر وہ سردار ان سے بڑے تھے۔[4]

۴۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی کو بادشاہت کے لائق نہیں دیکھا۔[5] صحیح بخاری میں ہے: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا: امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہما ہمیشہ ایک وتر پڑھتے ہیں اس کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ انہوں نے جواب دیا: معاویہ رضی اللہ عنہ فقیہ شخص ہیں۔[6]

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ابن ہند بھی کیسا خوب آدمی ہے، وہ کس قدر شریف الاصل ہے، اور اس کا مقدر کس قدر محترم ہے۔ اللہ کی قسم! انہوں نے ہمارے اور اپنے اہل کا احترام کرتے ہوئے نہ کبھی ہمیں منبر پر سب وشتم کیا اور نہ زمین پر۔[7]

جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ان الفاظ کے ساتھ تعزیت کی: اللہ تعالیٰ آپ کو بے یار و مددگار نہ

چھوڑے اور نہ حسن رضی اللہ عنہ کی وجہ سے تمہیں غم ناک کرے، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب تک اللہ میرے لیے امیر المومنین کو باقی رکھے گا وہ نہ تو مجھے غم ناک کرے گا اور نہ مجھے بے یار و مددگار چھوڑے گا۔[8]

۵۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ:

ان کا قول ہے: میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اس دروازے والے سے بڑھ کر کسی کو مبنی بر حق فیصلہ کرتے نہیں دیکھا۔[1] یعنی معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر۔

۶۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے بازار میں چلتے ہوئے فرمایا: تمہارے لیے افسوس ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ سے وابستہ ہو جاؤ، میرے اللہ! مجھے بچوں کی امارت سے بچانا۔[2]

۷۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ:

ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کی نماز تمہارے اس امیر (معاویہ رضی اللہ عنہ) کی نماز سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے مشابہت رکھتی ہو۔[3] حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مذکورہ بالا اور ابو درداء رضی اللہ عنہ کا یہ اثر ذکر کرنے کے بعد امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی فقاہت اور دین داری کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گواہی ہے، ان کی فقاہت کی شہادت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما دے رہے ہیں جبکہ حسنِ صلاۃ کے گواہ ابو درداء رضی اللہ عنہ ہیں اور ان دونوں کی شخصیات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس کی تاکید میں بکثرت آثار مروی ہیں۔[4]

۸۔ سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ:

امام زہری فرماتے ہیں: میں نے سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: زہری میری بات توجہ سے سنیں: "جو شخص خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے محبت کرتے ہوئے، عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کے لیے جنت کی گواہی دیتے ہوئے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے رحمت کی دعائیں کرتے کرتے مر گیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ اس سے کرید کرید کر حساب نہ لے۔"[5]

۹۔ عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ:

جب عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی ناک میں پڑنے والا غبار عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے بہتر اور افضل ہے۔[6]

۱۰۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ:

ابراہیم بن میسرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے کبھی بھی عمر بن عبد العزیز کو کسی انسان کو مارتے نہیں دیکھا۔ بجز اس شخص کے جس نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو سب وشتم کیا اسے انہوں نے کئی کوڑوں کی سزا دی۔[1]

۱۱۔ محمد بن عبد اللہ بن عمار موصلی و دیگر ان کے اقوال:

معافی بن عمران سے پوچھا گیا: معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ؟ تو وہ ناراض ہو کر سائل سے کہنے لگے: کیا تو صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تابعی کے برابر قرار دینا چاہتا ہے؟ معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، سسرالی رشتے دار، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب اور وحی الٰہی کے امین ہیں۔[2]

۱۲۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا: آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے جو یہ کہتا ہے کہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کو کاتب وحی اور خال المومنین نہیں مانتا اس لیے کہ انہوں نے امارت تلوار کے زور پر غصب کی۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: یہ بہت بری اور گھٹیا بات ہے، ایسے لوگوں سے الگ رہا جائے، ان کے ساتھ نشست وبرخاست نہ کی جائے اور انہیں لوگوں کے سامنے ننگا کیا جائے۔

۱۳۔ ربیع بن نافع حلبی رحمہ اللہ:

ان کا قول ہے: معاویہ رضی اللہ عنہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پردہ ہیں، جب کوئی آدمی پردہ ہٹاتا ہے تو وہ پس پردہ چیز پر دلیر ہو جاتا ہے۔[3] **۱۴۔ ابن ابو العز حنفی رحمہ اللہ:** آپ کا قول ہے: مسلمانوں کے پہلے بادشاہ معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ ان کے بہترین بادشاہ ہیں۔[4]

۱۵۔ قاضی ابن العربی المالکی رحمہ اللہ:

ابن العربی معاویہ رضی اللہ عنہ کی خصال حمیدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: انہوں نے سرحدوں کو محفوظ بنایا۔ فوج کی اصلاح کی، دشمن پر غالب رہے اور مخلوق کی منفعت کے لیے کوشاں رہے۔[5] دوسری جگہ فرماتے ہیں: "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں منصب ولایت پر فائز کیا، اور عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں اس منصب پر برقرار رکھا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انہیں ابو بکر رضی اللہ عنہ نے والی مقرر کیا تھا، اس لیے کہ انہوں نے ان کے بھائی یزید (بن ابو سفیان) کو والی مقرر فرمایا اور یزید نے اسے اپنا جانشین مقرر کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس عہدہ پر برقرار رکھا اور پھر عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کچھ کیا۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ سلسلہ کس قدر ٹھوس اور پائیدار ہے۔"[6] اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے انہیں اپنا کاتب مقرر فرمایا تھا... پھر نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ صلح کرتے ہوئے ان کی خلافت کا اقرار کر لیا۔[7]

[1]البداية و النهاية: ۱۱/۴۵۱. [2] البداية و النهاية: ۱۱/۴۵۰. [3] ایضاً: ۱۱/۴۵۰. [4] شرح العقيدة الطحاوية، ص: ۷۲۲. [5] العواصم من القواصم، ص: ۲۱۰، ۲۱۱. [6] العواصم من القواصم، ص: ۸۲. [7] سيرة عثمان بن عفان، صلابی، ص: ۳۰۰۔ المدينة المنورة، فجر الاسلام: ۲/۲۱۶.

۱۹۔ابن خلدون:

ابن خلدون فرماتے ہیں: مناسب یہی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت اور اس کے اخبار و واقعات کے ساتھ ملحق کیا جائے، اس لیے کہ وہ عدل و انصاف، فضل و شرف اور حجت میں ان کے ہم پلہ ہیں اور حق تو یہ ہے کہ

۱۶۔امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اس امت کے افضل ترین بادشاہ ہیں، اس لیے کہ ان سے قبل کے خلفاء اربعہ خلفاء نبوت تھے، جبکہ معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے بادشاہ ہیں اور ان کی بادشاہت رحمت تھی۔[1] مزید فرماتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان سے بہتر کوئی بادشاہ نہیں تھا۔[2] ابن تیمیہ رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں کہ جب اعمش کے سامنے امیر المومنین عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ، کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: اگر تم معاویہ رضی اللہ عنہ کو پا لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ انہوں نے کہا: ان کے حلم کے بارے میں؟ فرمایا: نہیں، اللہ کی قسم! ان کے عدل کے بارے میں۔

۱۷۔امام ذہبی رحمہ اللہ:

امام ذہبی معاویہ رحمہ اللہ کو امیر المومنین اور شاہ اسلام[3]

بتاتے ہیں، مزید فرماتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان بہترین بادشاہوں میں ہوتا ہے جن کا عدل ان کے ظلم پر غالب تھا، مگر وہ کمزوریوں سے مبرا نہیں تھے، اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمائے۔[4]

ان کے لیے یہی بات کافی ہے کہ پہلے عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک صوبے کا گورنر بنایا اور پھر عثمان رضی اللہ عنہ نے، اور انہوں نے یہ ذمہ داری خوب نبھائی، لوگ ان کی جود و سخا اور حلم و حوصلہ سے ہمیشہ خوش رہے۔ اس شخص نے لوگوں کی سیادت و قیادت کی اور اپنی عقل و فکر، حلم و حوصلہ، وسیع الظرفی اور صائب رائے کو کام میں لاتے ہوئے بڑی خوبی کے ساتھ ایک دنیا کا نظام چلایا۔[5]

۱۸۔ابن کثیر رحمہ اللہ:

۴۱ھ میں ان کی بیعت پر رعایا کا اجماع ہو گیا۔ آپ جس سال فوت ہوئے اس سال وہ فیصلے کرنے میں آزاد تھے، دشمن کے علاقوں میں جہاد کا سلسلہ قائم تھا، اللہ کا کلمہ سربلند تھا، زمین کے دور دراز علاقوں سے مال غنیمت کی آمد کا سلسلہ جاری تھا مسلمان آرام وراحت کے ساتھ رہ رہے تھے اور ان کی طرف سے عفو و درگزر کا التزام کیا جارہا تھا۔[6] مزید فرماتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے حلیم الطبع اور باوقار رئیس اور سردار تھے، منصف مزاج اور بڑی شان و شوکت کے حامل تھے۔[7] انہی کا قول ہے: معاویہ رضی اللہ عنہ عمدہ سیرت و کردار کے مالک، عفو و درگزر کے پیکر اور پردہ پوشی کرنے والے عظیم انسان تھے۔[8]

۱۹۔ابن خلدون:

ابن خلدون فرماتے ہیں: مناسب یہی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت اور اس کے اخبار وواقعات کے ساتھ ملحق کیا جائے، اس لیے کہ وہ عدل و انصاف، فضل و شرف اور حجت میں ان کے ہم پلہ ہیں اور حق تو یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار خلفائے راشدین میں ہی ہوتا ہے۔ مؤرخین نے صرف دو باتوں کی وجہ سے معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان سے مؤخر رکھا ہے:

۱۔ ان کی خلافت ان کے زمانہ میں سر اٹھانے والی عصبیت، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے، کی وجہ سے دوسری قوتوں پر غلبہ حاصل کرنے والی خلافت تھی، جبکہ قبل ازیں وہ اختیار اور اجتماع سے عبارت تھی۔ مؤرخین نے اس حوالے سے ان دونوں حالتوں میں فرق کو ملحوظ رکھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ مغالبہ اور عصبیت کے خلفاء میں سے پہلے خلیفہ تھے جنہیں اہل ہواء لوگ بادشاہ کے نام سے تعبیر کرتے اور انہیں ایک دوسرے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مگر حاشا اللہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کے بعد آنے والے خلفاء کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جاسکتی، وہ خلفائے راشدین میں سے ہیں، دین اور فضل و شرف میں ان جیسے مروانی خلفاء نیز ان کے ہم مرتبہ عباسی خلفاء کا شمار بھی خلفاء راشدین میں ہوتا ہے۔ یہ کہنا ناروا ہے کہ بادشاہت کا رتبہ خلافت کے رتبہ سے کم تر ہے، لہٰذا بادشاہ خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات آپ کے علم میں رہنی چاہیے کہ جو بادشاہت خلافت کے مخالف بلکہ اس کی ضد ہے وہ جابرانہ بادشاہت ہے جسے کسرویت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس وقت ناپسند کیا تھا جب انہوں نے اس پر اس کے بعض مظاہر کا مشاہدہ کیا تھا، رہی وہ بادشاہت جو عصبیت اور قوت و شوکت کے ساتھ غلبہ و قہر سے عبارت ہے تو وہ نہ خلافت کے منافی ہے اور نہ نبوت کے۔ سلیمان علیہ السلام اور ان کے والد حضرت داؤد علیہما السلام اللہ کے نبی تھے اور بادشاہ بھی، اور وہ دونوں دینی اور دنیوی ہر دو حوالوں سے استقامت کی انتہاء پر فائز تھے، معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان و شوکت بکثرت دنیا کے حصول کے لیے نہیں تھی بلکہ انہیں (قومی) عصبیت نے اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ یہاں لا کھڑا کیا تھا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمان ساری حکومت پر قابض ہو گئے اور وہ ان کے خلیفہ قرار پائے تو انہوں نے بھی اپنی قوم کو اسی بات کی طرف بلایا جس کی طرف بادشاہ اپنی اپنی قوموں کو بلایا کرتے ہیں۔

۲۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی تعریف و توصیف میں یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور بعد ازاں کے علمائے امت کے بعض اقوال ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے پہلے بادشاہ ہیں اور ان کا شمار ان بہترین شاہانِ اسلام میں ہوتا ہے جن کا عدل ان کے ظلم پر غالب تھا۔ جبکہ وہ بشری کمزوریوں سے بری نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمائیں گے جیسا کہ انہوں نے خود کہا وہ اس دین کے پیروکار تھے جس میں اللہ تعالیٰ اعمال کو قبول فرماتا، حسنات کا بدلہ دیتا اور گناہوں کی سزا دیتا ہے الا یہ کہ وہ جسے چاہے معاف فرما دے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی حکومت کو خاص طور سے اور بنو امیہ کی حکومت کو عام طور سے بعض مؤرخین کے زہریلے تیروں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں تو وہ سلطنت مدینہ تھی جبکہ بعض دوسروں کے نزدیک وہ اسلامی نہیں بلکہ عربی دولت تھی، بلکہ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ لادینی حکومت تھی یا اخلاق کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ایسا کذب و افتراء ہے جس کی دینی حقائق بھی تکذیب کرتے ہیں اور تاریخی شواہد بھی۔ جہاں تک دینی حقائق کا تعلق ہے تو اموی دور حکومت کا آغاز ۴۰ھ میں ہوا اور ۱۳۲ھ تک جاری رہا اور یہ طویل دور امت کے تین بہترین ادوار کو شامل ہے، یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار کو۔[1] یہ وہ ادوار ہیں جن کی فضیلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے ثابت ہے، مثلاً ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی یہ مرفوع حدیث: "زمانوں میں سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو اُن کے بعد آئیں گے اور پھر وہ جو اُن کے بعد آئیں گے۔"[2] عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے: "تم میں سے بہترین میرا زمانہ ہے، پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئیں گے اور پھر ان کا جو، ان کے بعد آئیں گے۔"[3] ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ایک زمانہ آئے گا کہ کچھ لوگ جہاد کریں گے تو پوچھا جائے گا: کیا تم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی صحابی بھی موجود ہے؟ اس کا جواب اثبات میں دیا جائے گا تو انہیں فتح سے نوازا جائے گا، پھر ایک اور زمانہ آئے گا ان سے پوچھا جائے گا: کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے اصحاب نبی میں سے کسی کی صحبت اختیار کی ہو؟ اس کا جواب بھی اثبات میں دیا جائے گا تو انہیں فتح سے ہمکنار کر دیا جائے گا۔"[4] مرفوع احادیث میں مذکور تین قرون سے مراد تین زمانے ہیں، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ، تابعین کا زمانہ اور تبع تابعین کا زمانہ۔[5] اس کی یہی تفسیر راجح ہے۔ جن احادیث صحیحہ سے اموی دور حکومت کی فضیلت و منقبت ثابت ہوتی ہے ان میں صحیح بخاری میں خالد بن مہران سے مروی یہ حدیث بھی ہے کہ عمر بن اسود نے اس سے بیان کیا کہ وہ حمص میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت ان کی بیوی ام حرام بھی ان کے ساتھ تھی، عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ام حرام نے ہم سے بیان کیا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: "میری امت کا پہلا لشکر جو سمندر میں جہاد کرے گا اس نے جنت کو واجب کر لیا۔" (یعنی انہوں نے وہ کام کیا جس کی وجہ سے ان کے لیے جنت واجب ہو گئی۔) ام حرام کہتی ہیں: میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ان میں میں بھی شامل ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان میں تو بھی شامل ہے۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: "میری امت سے پہلا لشکر جو قیصر کے شہر میں جہاد کرے گا اس کی مغفرت فرما دی گئی ہے۔" میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ان لوگوں میں میں بھی شامل ہوں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں"۔[6]

قیصر کے شہر سے مراد قسطنطنیہ ہے، جو کہ بیزنطی حکومت کا دار الحکومت تھا۔[7] شارحین حدیث فرماتے ہیں: اس حدیث سے معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سب سے پہلے سمندر میں جہاد انہوں نے کیا اور یہ خلافت عثمانیہ کے دور کی بات ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سمندری جنگ کے لیے مسلسل آمادہ کرتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے ان کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں بحری جنگ کی اجازت دے دی، اسلامی بحری بیڑے کا عہد عثمان رضی اللہ عنہ سے آغاز ہوا اور عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں اس میں مزید توسیع کی گئی۔[1]

اس غزوہ کے دوران ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے وفات پائی جو کہ اس لشکر میں شامل تھے، انہوں نے وصیت کی تھی کہ مجھے قسطنطنیہ کے دروازے کے قریب دفن کیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جس سارے لشکر کی مغفرت فرمادی گئی وہ بنو امیہ کے عہد حکومت کا لشکر تھا، اس لیے کہ یہ جنگ ۵۲ھ میں ہوئی تھی، یعنی معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں۔ جو شخص نواسہ رسول حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہونے کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت کا بنظر انصاف جائزہ لے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اقامت اسلام اور اتباع سنت کے بڑے حریص تھے۔

دوسری بحث:

اُمت اور دولت اسلامیہ کے رئیس کے طور پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے تعلقات

جس طرح امت کے کچھ حقوق ہیں اسی طرح خلیفہ کے بھی کچھ حقوق ہیں اور ان حقوق کے ساتھ ساتھ ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں جن کے لیے وہ جواب دہ ہیں اور جن کے حوالے سے ان کا احتساب بھی ہو گا، اس کی قدرے تفصیل پیش خدمت ہے:

اولاً:... خلیفہ کی ذمہ داریاں:

فقہائے کرام نے خلیفہ پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، ان ذمہ داریوں اور ان کی تعداد کے اظہار و بیان کے لیے علماء کی تعبیرات جس قدر بھی مختلف ہوں ان کے حوالے سے یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ واجبات اپنی حقیقت کے اعتبار سے دینی اور دنیوی مصالح کی پوری پوری حفاظت کرنے سے عبارت ہیں۔ ان واجبات کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے: ۱۔ دین کو غلط ہاتھوں سے بچانے کے لیے مختلف ذرائع اور وسائل کو اپنانا، اس کا تعلق اسلامی عقیدہ کے ساتھ ہو یا کسی اور چیز کے ساتھ۔ اس واجب کے اظہار کے لیے ماوردی کی تعبیر ملاحظہ فرمائیں: دین کی اس کے طے شدہ اصولوں پر حفاظت کرنا اور ان چیزوں کی حفاظت کرنا جن پر علماء سلف کا اجماع ہے، اگر کوئی بدعتی شخص منظر عام پر آتا ہے یا شکوک و شبہات میں مبتلا کوئی شخص انحراف کرتا یا ٹیڑھا پن اختیار کرتا ہے تو خلیفہ اس کے لیے حجت کو واضح کرے گا اور صواب کی تبیین کرے گا اور اس پر جو حقوق اور حدود لازم آتی ہیں ان کے مطابق اس کا مواخذہ کرے گا۔ تاکہ دین خلل سے اور امت غلطی سے محفوظ رہے۔[1] ۲۔ خلیفہ قاضیوں کا تقرر کرے گا تاکہ وہ لوگوں میں اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے کریں تاکہ معاشرے میں زیادتی کرنے والے ایسے لوگوں کا وجود باقی نہ رہے جنہیں کسی سزا کا ڈر نہ ہو اور نہ کوئی ایسا مظلوم باقی رہے جو اس حق تک رسائی کی استطاعت نہیں رکھتا جس کی اس کے لیے شریعت نے ذمہ داری لی ہے۔[2]

۳۔ امت کے تمام افراد کو امن و امان کی فضا مہیا کرنا تاکہ ہر شخص آزادانہ انداز میں روزی کما سکے اور وہ اپنی جان و مال اور اہل عیال کے حوالے سے کوئی خوف و خطرہ محسوس نہ کرے۔

۴۔ حد کو واجب کرنے والے جرم کے مرتکب اشخاص پر شرعی حدود قائم کرنا اور اس کے لیے چھوٹے بڑے میں تفریق روا نہ رکھنا تاکہ محارم شرعیہ کو پامال ہونے اور اللہ کے بندوں کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے۔[1]

۵۔ ملکی سرحدوں کو پوری قوت کے ساتھ محفوظ بنانا، تاکہ دشمنان اسلام کو کوئی ایسا راستہ نہ مل سکے جسے اپنا کر وہ امت کا کوئی نقصان کرنے کی جرأت کر سکیں۔ مملکت کے رئیس اعلیٰ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے تمام وسائل کو بروئے کار لائے جو امت کو اس کے دشمنوں کی شرارتوں سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکیں۔

۶۔ دشمنانِ اسلام اور معاندین اسلام سے جہاد کرنا یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں یا ذمی بن کر رہیں۔

۷۔ اموال مستحقہ کا حصول، ان اموال کا تعلق فرض صدقات کے ساتھ ہو یا وہ مال غنیمت ہو۔ مگر یہ بات یاد رہے کہ یہ سب کچھ شرعی قواعد و ضوابط کے مطابق ہونا چاہیے اور حصول اموال میں کسی نقص یا زیادتی کا ارتکاب نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ زیادتی کی صورت میں زکوٰۃ دینے والوں کا نقصان ہو گا اور نقص کی صورت میں اس کے مستحقین مثلاً فقراء، مساکین اور عاملین وغیرہم کا۔

۸۔ بیت المال سے ضرورت مند لوگوں کو مالی اعانت فراہم کرنا، دفاعی اور سول اداروں کے ملازمین کو تنخواہیں ادا کرنا اور اس کے لیے قواعد و ضوابط تشکیل دینا اور ان پر عمل پیرا ہونا۔

۹۔ قیادت کے عہدوں پر قابل اعتماد، دیندار اور باصلاحیت لوگوں کا انتخاب کرنا، تاکہ اعمال و اختیارات ان امین لوگوں کے ہاتھوں میں رہیں جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہو اور وہ لوگوں کے حقوق پر ڈاکے ڈالنے والے نہ ہوں۔ ۱۰۔ امت کے حوالے سے اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کی نگرانی کرنا، اس لیے کہ بااختیار عمال اور لوگوں کی ہر کوتاہی کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے جس کے لیے اسے اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا، اس لیے کہ امام راعی (نگران) ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد مبارک ہے۔ ۱۱۔ شوریٰ، اس لیے کہ اس کا شمار اسلامی حکومت کے امتیازات میں ہوتا ہے۔[2] ہم ان شاء اللہ آئندہ چل کر دیکھیں گے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد کے اموی خلفاء نے ان فرائض و واجبات کے حوالے سے کس قسم کا طرز عمل اختیار کیا۔

ثانیاً:... خلیفہ کے حقوق:

امت کے ذمے خلیفہ کے بھی کچھ حقوق ہیں جن کی ادائیگی پر ہی خلیفہ اپنی ذمہ داریوں کو باندازِ احسن پورا کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ علماء اسلام نے ان حقوق کی بھی نشان دہی کر دی ہے، جن میں سے اہم تر مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس کے جملہ اوامر و نواہی میں اس کی اطاعت کرنا بشرطیکہ وہ احکام شرعیہ سے متعارض نہ ہوں جب تک وقت تک خلیفہ وقت یا سربراہ مملکت اپنے احکامات و منہیات میں شرعی حدود و قیود کا التزام کرتا رہے گا اور ان سے تجاوز نہیں کرے گا اسے تمام اہل وطن کی طرف سے ولاء کا حق حاصل رہے گا۔ چاہے وہ امت کے رئیس کے طور پر اس کی بیعت کرنے والے اہل حل وعقد ہوں یا اس کے تمام اہل وطن جن پر اس بیعت کے اتمام کے ساتھ ہی اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔

۲۔ بوقت ضرورت اس کی نصرت و حمایت کرنا، خلیفہ جب تک اپنے حکم میں راہ حق پر گامزن رہے گا اس وقت تک باغیوں اور اس کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کے خلاف اس کی مدد کرنا ساری امت پر واجب رہے گی، اس لیے کہ امام حق کی مدد کرنا در حقیقت مسلمانوں کی مدد کرنا ہے، تاکہ دین قائم رہے اور غلط کار لوگوں کو جرائم کے ارتکاب سے روکا جاسکے۔

۳۔ دیگر مراعات کے ساتھ اسے اس قدر مشاہرہ دینا جو اس کے لیے اور اس کے زیر کفالت لوگوں کے لیے کافی ہو، اور یہ اس لیے کہ اس کا سارا وقت ریاستی ذمہ داریاں ادا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے اور اسے اکتسابِ رزق کے لیے کوئی وقت نہیں ملتا، لہٰذا اس کے لیے اس قدر مشاہرہ مقرر کرنا ضروری ہے جو اسے دوسروں سے بے نیاز کر دے اور جو اس کے مقام و منصب کے شایان شان ہو، بایں طور کہ وہ نہ تو اس کی ضرورت سے کم ہو اور نہ اس سے اسراف و تبذیر ہی لازم ہوتا ہو، اور یہ اس لیے کہ حکمرانوں اور قاضیوں کی تنخواہیں مسلمانوں کے مال سے ادا کی جاتی ہیں۔ جسے خرچ کرتے وقت محتاط رہنا چاہیے۔

۴۔ خلیفہ کی طرف سے جن امراء، ولاۃ اور قضاۃ کو ان کے عہدوں پر فائز کیا گیا ہو اگر وہ اپنے اختیارات سے تجاوز کریں یا اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے کوتاہی برتیں تو اس سے خلیفہ کو مطلع کرنا اور یہ اس لیے کہ امام شرعاً اس بات کے لیے مکلف ہے کہ وہ ان لوگوں کے اعمال و افعال کی نگرانی کرے جنہیں اس نے بااختیار عہدوں پر فائز کیا ہے۔ اگر یہ لوگ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی عدم ادائیگی کے مرتکب ہوں گے اور خلیفہ اس حوالے سے اپنی ذمہ داری ادا کرنے سے قاصر رہے گا تو وہ اس کے لیے عند اللہ جواب دہ ہو گا۔ جبکہ افرادِ امت کے تعاون کے بغیر اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ ۵۔ اگر اسے امت کے مفادات کے تحفظ کے لیے معاونت کی ضرورت ہو تو اسے ضروری تعاون فراہم کرنا۔ اس لیے کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ (المائدۃ: ۲)

"نیکی اور تقویٰ کے کاموں کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو۔"

حکمران اور بااختیار سرکاری اہل کار اس تعاون کے سب سے بڑھ کر حق دار ہیں۔[1]

امت اسلامیہ نے عمومی طور سے امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد آنے والے خلفاء کے حقوق کی ادائیگی میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

ثالثاً:...دولت امویہ کا دار الحکومت اور شام کے فضائل میں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم :

شام مشرقی رومی سلطنت "بیزنطیہ" کا ایک اہم صوبہ تھا، بلکہ بیت المقدس کے قریب ہونے اور اپنی قدیم تاریخ کی وجہ سے اس سلطنت کا بڑا اہم تہذیبی مرکز تھا، عرب قبل از اسلام اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، اس لیے کہ وہ تہذیبی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا خوشحال، سرسبز و شاداب اور کاروباری مرکز تھا۔ سرزمین شام میں دمشق کو پہلا شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جس نے اس علاقہ کی تاریخ میں بڑا اہم کردار ادا کیا، اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے رومانی حاکم نے اسے اپنی حکومت کا مرکز قرار دیا، جب اسلام ملک شام اور خاص طور سے دمشق میں داخل ہوا تو معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی ولایت کے طویل دور میں اسے بڑی اہمیت دیتے رہے، انہوں نے وہاں کے باشندوں کے ساتھ بڑے مضبوط تعلقات قائم کیے۔[1]

چونکہ وہ دمشق اور شام میں مقیم یمنی قبائل کی اہمیت سے آگاہ تھے، لہٰذا انہوں نے وہاں کے قبیلے بنو کلب میں شادی کر لی جس سے تعلق رکھنے والی ان کی بیوی نے ان کے بیٹے یزید کو جنم دیا۔ بنو کلب نے نہ صرف ان کے ساتھ بلکہ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں کے ساتھ خوب وفاداری کا ثبوت دیا،

اس لیے کہ عرب قبائل ماموں کے رشتے کا بڑا پاس کیا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے نزدیک دامادی کا رشتہ سیاسی معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے۔[2] معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام اور دمشق میں مقیم یمنی قبائل پر اعتماد کر کے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔[3] دولت امویہ قائم ہونے کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ دولت اسلامیہ وسعت اختیار کرتے ہوئے شرقاً غرباً بہت دور تک پھیل گئی ہے، لہٰذا انہیں اموی خلافت کے دار الحکومت کے لیے دمشق سے بہتر کوئی جگہ نظر نہ آئی، اس لیے کہ یہ شہر عالم اسلام کے دو حصوں کے درمیان میں واقع تھا، ایک اس کا مشرقی حصہ جو کہ عراق اور فارس پر مشتمل تھا اور دوسرا مغربی حصہ جو کہ مصر اور مغرب پر مشتمل تھا، علاوہ ازیں ان سے مربوط ان کے حامی قبائل نے ان کی تائید کرتے ہوئے ان کے موقف کو تقویت دی اور اس طرح وہ ان کی حکومت کے استحکام کے لیے ان کے دست راست بن گئے، دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ قبائل ان کی فوجی اور سیاسی قوت کے طور سے سامنے آئے جن پر حکومت اور دولت امویہ کا دار و مدار تھا۔ مزید برآں اس شہر کے باشندوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا انہیں اپنی تجربہ کاری اور اداراتی عملہ کی خدمات بھی پیش کیں۔[4]

رابعاً:...عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں اہل حل وعقد:

خلفائے راشدین کے زمانے میں اسلامی معاشرہ بڑی سرعت کے ساتھ تبدیل ہو رہا تھا بایں طور کہ اس سے ان کی حکومت کے اساسی امتیازات متاثر ہونے لگے جو کہ باہم محبت و یگانگت، خلیفہ و رعایا کے ایک دوسرے کے لیے احساس اور آپسی تعلقات میں خوف باری تعالیٰ سے عبارت تھے۔ اس تبدیلی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مدینہ منورہ میں مقیم اہل حل وعقد کا کردار محدود ہو گیا جس کی وجہ ان میں سے زیادہ تر کی وفات یا دوسرے شہروں میں بکھر جانا تھا۔ ان شہروں کو مرکز خلافت سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور یہ اس لیے کہ بعد میں مسلمان ہونے والے قبائل کا کردار بڑھ گیا تھا، ان لوگوں نے بڑی بڑی اسلامی فتوحات کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ اس قدر خوش حال ہو گیا جس کی قبل ازیں کوئی نظیر نہیں ملتی تھی اور جس کی وجہ سے اخلاقیات کے پیمانے بھی تبدیل ہو گئے تھے۔[1] اور پھر آہستہ آہستہ بعض مفاہیم میں بھی

تبدیلی آنا شروع ہوگئی جیسا کہ اہل حل وعقد کا مفہوم۔ اب اس سے مراد اہل بدر یا مدینہ منورہ میں سابقین الی الاسلام کی جماعت مراد نہیں لی جاتی تھی جن کی مرور زمانہ کے ساتھ تعداد کم ہوگئی تھی۔ تاثیر اور فاعلیت کے میدان میں مختلف شہروں کے زعماء کا ظہور ہو گیا تھا جن میں زعماء شام بھی شامل تھے، اگر ہم احداث تاریخ سے فیصلہ چاہیں تو وہ اس بات کو موکد کرتے ہیں کہ مختلف شہروں کے لوگ سیاسی فیصلے کرنے کی طاقت رکھتے تھے جبکہ اہل مدینہ اس سے بے بس ہو کر رہ گئے تھے تاریخی واقعات کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل شام کو اطاعت، اجتماعی وحدت، حکومتی نظام کی پاس داری، ادارتی اسالیب اور تہذیبی طور طریقوں سے وافر حصہ میسر آیا تھا، اہل شام اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے عراق اور دیگر تمام اسلامی شہروں پر اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلی، انہوں نے اپنی انہی اہلیتوں کی بنیاد پر نوے سال سے زائد عرصہ تک اپنا اقتدار قائم رکھا جو کہ دولت امویہ کی کل عمر ہے۔ اس سے اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ شامی قائدین سیاسی امر واقع کے اعتبار سے اسلامی معاشرہ میں اہل حل وعقد قرار پائے۔ جنہیں خلیفہ منتخب کرنے کی قدرت بھی حاصل تھی اور وہ اس انتخاب سے دوسرے شہروں کو مطمئن بھی کر سکتے تھے، وہ ایسا صلح وصفائی سے کرتے یا سینہ زوری سے، اور یہ وہ معاشرہ تھا جس پر مختلف گروہ حکومت کرتے تھے اور ان کی اپنی اپنی رغبتیں اور ترجیحات تھیں۔[2]

ا۔ اہل حل وعقد کے مفہوم ومعنی کے بارے میں فقہاء کی آراء:

اہل حل وعقد کے مفہوم ومعنی کے بارے میں علمائے واسلام کے متعدد اقوال ہیں۔ جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں: **الف:** اولوالامر:... یہ شرعی اصطلاح ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اور اپنے میں سے اولوالامر کی۔" اولوالامر سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس بارے میں علماء کے کئی اقوال ہیں، جن میں سے مشہور اقوال یہ ہیں:

ا۔ امراء وحکام:... اسے امام طبری نے ترجیح دی ہے۔[3] امام نووی فرماتے ہیں: یہ جمہور سلف وخلف کا قول ہے۔[4]

۲۔ علماء وفقہاء:... یہ بعض سلف کا قول ہے، جن میں جابر بن عبداللہ، حسن بصری اور نخعی وغیرہم بھی شامل ہیں۔

۳۔ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔

۴۔ ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما مراد ہیں۔

۵۔ امراء وحکام اور علماء وفقہاء:... امام ابن کثیر[1]، ابن قیم[2] اور شوکانی[3] وغیرہم کا اسی طرح رجحان ہے۔

٦۔ علماء، امراء، زعماء اور ہر متبوع:... یہ امام ابن تیمیہ[4] اور محمد عبدہ[5] کی رائے ہے۔ شیخ محمد عبدہ فرماتے ہیں: "یہ لوگ اہل حل وعقد ہیں۔"[6] شاید پانچواں اور چھٹا قول اقرب الی الصواب ہے اور ان میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔[7]

ب: علماء:... ان سے مراد علمائے شریعت ہیں اور یہ قرآنی لفظ ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر: ۲۸) "اللہ سے اس کے بندوں سے علم رکھنے والے ہی ڈرتے ہیں۔"

اسے (اولوا العلم) کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ (آل عمران: ۱۸)

"اللہ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

یہ اصطلاح متعدد احادیث میں بھی وارد ہے۔ مثلاً اس مشہور حدیث میں: ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهٗ مِنَ النَّاسِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعُلَمَاءَ)) [8] "اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح ختم نہیں کرے گا کہ اسے لوگوں سے چھین لے بلکہ علم کا خاتمہ علماء کی وفات کی وجہ سے ہو گا۔"

ج: ارباب اختیار:... یہ وہ لوگ ہیں جنہیں امام کے اختیارات تفویض کیے جاتے ہیں، بعض علماء کے نزدیک یہ لوگ اہل حل و عقد ہیں۔[9] یہ اجتہادی اصطلاح ہے اور بعض اہل علم کی وضع کردہ ہے۔[10]

د: اہل اجتہاد:... اس سے مراد وہ علماء ہیں جو شریعت اسلامیہ میں اجتہاد کے مقام و مرتبہ پر فائز ہیں اور اہم امور کی سرانجام دہی کی صلاحیت سے بہرہ مند ہیں، مثلاً امامت کبریٰ، قضاء، فتویٰ اور ان جیسے دیگر امور، یہ اصطلاح بغدادی[11] اور قرطبی[12] کی وضع کردہ ہے۔

ہ: اہل شوریٰ:... یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں کے امور کے بارے میں اس آیت کریمہ کے مطابق مشاورت کی جاتی ہے۔ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) "اور ان سے کام کا مشورہ کیا کریں۔" نیز ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (الشوری: ۳۶) "اور ان کا ہر کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے۔"

و: بااثر لوگ:... اس سے مراد لوگوں میں اثر و نفوذ رکھنے والے طاقت ور لوگ ہیں۔ یہ اصطلاح امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی وضع کردہ ہے۔[1]

ز: اہل رائے اور مدبرین:... اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ٹھوس عقل و فکر کے حامل ہوں اور معاملات کو صحیح انداز میں حل کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ یہ اصطلاح ابن عابدین کی اختیار کردہ ہے۔[2]

خلاصہ کلام کے طور سے اہل حل و عقد وہ لوگ ہوتے ہیں جو مسلمانوں کے سیاسی، انتظامی، تشریعی، قضائی اور دیگر معاملات کا نظام وضع کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں اور حالات کے مطابق ان میں کمی بیشی کرنے کی صلاحیت سے متصف ہوں۔[3]

معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں امراء وولاۃ، مختلف قبائل کے زعماء، فوجی قائدین اور ان جیسے دوسرے لوگ اہل حل و عقد ہوا کرتے تھے اور عملاً قوت و شوکت اہل شام میں مرتکز ہو کر رہ گئی تھی، اس لیے کہ ان لوگوں کو اپنے ارادوں کی تکمیل اور اپنے مخالفین پر اپنی مرضی تھوپنے کی پوری قدرت حاصل تھی، اہل شام کے تاریخی دور میں یہی کچھ ہوا، لیکن اگر ہم زیادہ انصاف سے کام لیں تو یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ارباب حل و عقد کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہونا چاہیے تھا تاکہ زعماء شام کے ساتھ عراق، مصر، حجاز اور دیگر اسلامی علاقوں میں مقیم زعماء بھی اس میں شامل ہو جاتے اور ان لوگوں کے ساتھ ساتھ امت کے علماء اور اس کے دین دار لوگوں پر مشتمل اصحاب رائے کو بھی اس حوالے سے اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جاتا اور ان لوگوں کو بھی خلیفہ کے انتخاب اور اس کی معزولی کے فیصلہ میں شامل کیا جاتا اور امت کو لاحق مسائل کے حل میں ان کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا۔ اگر اموی دور حکومت میں ایسا ہو پاتا تو امت اسلامیہ اختلاف اور خون ریزی سے بچ سکتی تھی، مگر عملاً جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ اس دور میں اہل شام ہی خلیفہ کا انتخاب کرتے رہے اور وہ بھی صرف اموی خاندان کے افراد سے۔

اس کا آغاز معاویہ رضی اللہ عنہ کے ولی عہد کے طور پر یزید بن معاویہ کی بیعت سے ہوا اور پھر کئی قسم کی مشکلات اور مصائب کے بعد اموی خانوادے سے ہی خلفاء کا تسلسل ایک امر واقع بن کر رہ گیا اور اس بات کی کوئی پروانہ کی گئی کہ دیگر امصار اسلامیہ اسے پسند کرتے ہیں یا اس کی مزاحمت۔4 ولایت عہد کی بحث آگے چل کر اپنے وقت پر آئے گی۔ إنْ شَاءَ اللّٰہُ۔

[1]منهاج السنة: ۱/۵۵۰. [2] حاشیه ابن عابدین: ۴/۲۶۳. [3] اہل الحل و العقد، ص: ۱۵.

خامساً: ...شوریٰ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں:

جب بنو امیہ کو خلافت ملی تو معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما ایسے شخص نہیں تھے جو شوریٰ کے فوائد سے ناآشنائی اور اسے اپنانے سے قاصر رہے ہوں۔ وہ جو بھی اہم کام کرنا چاہتے اس کے لیے مشورہ ضرور کرتے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اصحاب رائے امراء وولاۃ، سرکردہ لوگوں، اہل علم اور معززین قوم سے مشورہ کیا کرتے تھے ان کے بعد آنے والے خلفاء بنی امیہ نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بڑے مشیروں میں عمرو بن العاص اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما سرفہرست تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے پاس آنے والے مختلف وفود سے بھی مشاورت کیا کرتے تھے۔[1] دوران مشاورت لوگ ان سے آزادانہ انداز میں گفتگو کرتے اور اپنی آراء کا اظہار کرتے اور خلیفہ انہیں بڑی اہمیت دیتے، ان سے مناقشہ کرتے اور جن آراء پر عمل کرنا ممکن ہوتا ان پر عمل پیرا ہوتے، انہیں عملی شکل دینے والے ذمہ دار عہدے داروں کو آزادانہ مواقع دیتے۔ ان پر مکمل اعتماد کرتے اور انہیں حکومتی قوت سے نوازتے۔ خلیفہ کی ذات حکومت کا مرکز نہیں تھی، اس لیے کہ اس کی حکومت بڑی وسیع و عریض تھی اور تن تنہا اس کے جملہ امور کی انجام دہی تنہا خلیفہ کے بس کا روگ نہیں تھا، وہ مختلف علاقوں پر ولاۃ وامراء کا تقرر کرتا اور انہیں پوری آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیتا، وہ منصب ولایت پر اپنے قابل اعتماد لوگوں کا ہی تقرر کرتا اور صرف انہی لوگوں کو اختیارات تفویض کرتا جن سے اسے کوئی

خوف و خطرہ محسوس نہ ہوتا۔[2] وہ اپنے ولاۃ و امراء سے معینہ حدود میں رہ کر ہی مشاورت کرتا، جہاں تک امر خلافت کا تعلق ہے تو وہ بنو امیہ میں ہی محصور اور اموی خانوادے کے ساتھ ہی خاص تھا، اموی خلفاء حکمران کے انتخاب کے لیے غالباً اموی جماعت پر مشتمل شوریٰ ہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔[3] بنابریں کہا جاسکتا ہے کہ بنو امیہ کے دور حکومت میں دو قسم کی شوریٰ تھی، ایک شوریٰ کا تعلق مصالح عامہ کے ساتھ تھا جو قوم کے اصحاب رائے، معززین اور امراء و ولاۃ پر مشتمل تھی جس سے اموی خلفاء مشاورت کیا کرتے تھے اور دوسری شوریٰ خاص طور سے سلطان وقت سے متعلق تھی جو ان کے خانوادے پر مشتمل تھی اور جو خلافت کے معاملات نمٹایا کرتی تھی۔[4]

معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت خالصتاً شخصی حکومت نہیں تھی۔ افراد معاشرہ اور حکومت میں اسلام کا وجود از روئے سلوک اور نظام حکومت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود اور خلفاء راشدین کے زمانے میں شخصی قیادت اور اس کی برائیوں کے مظاہر سے مبرا تھا۔ جبکہ سیاست، قیادت، ادارہ اور رعایت مصالح جیسے حوالوں میں شوریٰ کا رنگ نمایاں تھا۔[5] خلافت راشدہ کی موروثی بادشاہت میں تبدیلی ایسی کامل تبدیلی نہیں تھی کہ جس میں خلفاء راشدین کی شوریٰ سے انحراف یا اوامر اسلام اور اس کے حکومتی منہج سے ارتداد اختیار کیا گیا ہو اور جو تبدیلی آئی تھی اس کا بھی سیاسی اور اجتماعی ارتقاء کا جواز موجود تھا اور جیسا کہ ابن خلدون کا موقف ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ اور اموی عہد حکومت میں خلافت کی حقیقت اس طرح سے موجود تھی کہ دین اور موقف دین کی جستجو کی جاتی تھی اور مواقف حق کا التزام کیا جاتا تھا۔ تبدیلی صرف یہ آئی کہ دین (قومی) عصبیت اور تلوار میں تبدیل ہو گیا، معاویہ، مروان، عبد الملک بن مروان اور عباسی خلفاء کے آغاز سے رشید اور اس کے بعض بیٹوں کے ادوار حکومت میں یہی صورت حال برقرار رہی۔ پھر اس کے بعد مفہوم خلافت کا یکسر اختتام ہو گیا اور وہ صرف نام کی حد تک باقی رہ گئی۔[1] ابن خلدون کا یہ موقف مطلقاً قابل تسلیم نہیں ہے، اس لیے کہ دولت عثمانیہ کے عہد کے دوران محمد الفاتح کے زمانہ میں اسلامی فتوحات، دعوت اسلام، عدل و انصاف اور اعزاز اسلام جیسے خلافت کے بعض معانی و مقاصد نے نئے سرے سے انگڑائی لی تھی۔ شرع عصبیت یا بادشاہت کی اس صورت میں قطعاً مذمت نہیں کرتی جب اس سے مقصود اقامت دین اور اظہار حق ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی:

﴿رَبِّ اغْفِرْلِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي﴾ (ص: ۳۵)

"میرے پروردگار! مجھے ایسی بادشاہت عطا فرما جو میرے بعد کسی ایک کے لیے بھی درست نہ ہو۔"

اور یہ اس لیے کہ انہیں اپنے بارے میں معلوم تھا کہ وہ نبوت اور بادشاہت کے دوران باطل سے الگ تھلگ رہیں گے۔[2] اسی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ جو بادشاہت خلافت کے مخالف بلکہ اس کے منافی ہے وہ جبر و قہر ہے۔[3] جس سے مقصود بغیر حق لوگوں پر تسلط جمانا ہو۔ جبکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنی خلافت کے دوران یہ رویہ ہرگز نہیں تھا۔ خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقاصد اور خلفاء راشدین کی خلافت کے مقاصد میں اس شدید قرب کو ہمارے بعض فقہاء اور مؤرخین نے بخوبی محسوس کیا اور پھر اس کا اظہار بھی کیا، مثلاً ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اس امر کا متقاضی ہے کہ ہماری شریعت میں خلافت کی بادشاہت کے ساتھ آمیزش جائز ہے اگرچہ خالص خلافت افضل ہے۔[4] اگر ہم یہ کہیں تو حقیقت سے دور نہیں جائیں گے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور بعض اموی خلفاء خلفائے راشدین کی سیرت کاملہ پر گامزن رہنے کی شدید خواہش رکھتے تھے مگر وہ اپنی رعایا اور زمانے کے

احوال وظروف کی وجہ سے اس پر قادر نہ ہوں گے۔ خلفائے راشدین نے اسلامی اور انسانی سیاست میں جو رفیع الشان مثالیں قائم کیں ان کی پر کشش تاثیر بعض خلفاء اور رعیت کے نزدیک کارگر تھی مگر اسے اپنانا ان کی ہمت وقدرت میں نہیں تھا، وہ اسے متحقق کرنے کے لیے اپنے آپ کو کھپا دیتے مگر پھر اس کوشش اور تجربہ کی صعوبت کا اعتراف کرتے ہوئے امر واقع کی کشش کی طرف واپس لوٹ آتے۔[5]

ایک دن معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے اور ولی عہد یزید سے دریافت کیا کہ وہ خلیفہ بننے کے بعد کس طرح کام کرے گا؟ تو اس نے جواب دیا میں لوگوں میں عمر بن خطاب جیسا کردار ادا کروں گا۔ یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ مسکرائے اور پھر کہنے لگے: اللہ کی قسم! میں نے پوری کوشش کی کہ عثمان رضی اللہ عنہ جیسا ہی کردار ادا کر سکوں مگر میں ایسا کرنے سے قاصر رہا، اور کیا تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسا کردار ادا کرلے گا؟[1] اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ خلفائے راشدین کے زمانے کی صاف زندگی کی طرف لوٹنا امر محال ہے، ایسا ممکن ہے مگر یہ اکیلے حاکم کے بس کا روگ نہیں ہے اگرچہ اس کی نیت بھی صاف اور اس کا عزم بھی پختہ ہو، بلکہ اس کے لیے راعی اور رعایا کے درمیان توافق و مطابقت از حد ضروری ہے۔ اس کا راستہ طویل بھی ہے اور کٹھن بھی، اس کے لیے ایسے دعاۃ اور حکام کی ضرورت ہے جو رعیت کی کمال ایمان پر تربیت کے لیے بھرپور کوششی کریں اور ان کے سامنے اپنے آپ کو نمونے اور مثال کے طور پر پیش کریں، اس کے لیے اپنا پورا پورا وقت بھی دیں اور تمام مساعی کو بھی بروئے کار لائیں۔[2] ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے میں جب حاکم کسی معاشرہ میں برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو ایسا راعی اور رعیت میں ایک ساتھ کسی نقص کی وجہ سے ہوتا ہے۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ اور اموی دور حکومت کے دور میں شوریٰ کا وہ معیار نہیں رہا تھا جو خلافت راشدہ کے دور میں تھا، معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس کے بعض پہلو ہی باقی تھے۔

[1] البداية و النهاية نقلاً عن الدولة الاموية، ص: ۲۷۶. [2] الدولة الاموية، ص: ۲۷۷. [3] مجموع الفتاوى: ۳۵/۲۰۔ الدولة الاموية، ص: ۲۷۷.

سادساً: ... عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں آزادئ رائے:

پر امن معارضہ:... معاویہ رضی اللہ عنہ پر امن معارضہ اور مسلح معارضہ میں فرق کو ملحوظ خاطر رکھا کرتے تھے۔ آپ کے دور میں لوگوں کو مکمل طور سے آزادئ رائے حاصل تھی بشرطیکہ وہ اپنی حدود میں رہیں، مگر جب بات اس سے آگے بڑھ کر ہتھیار اٹھانے اور تلوار لہرانے تک پہنچ جاتی تو پھر اس صورت حال کا سامنا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ پاتے۔ خوارج کے ساتھ آپ کے طرز عمل کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ سے ان کا یہ قول مروی ہے: میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان حائل نہیں ہوتا بشرطیکہ وہ ہمارے اور ہماری حکومت کے درمیان حائل نہ ہوں۔[4] عراق پر ان کے عامل زیاد بن ابیہ نے بھی اہل بصرہ کو خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔[5]

کتب تاریخ میں متعدد ایسی مثالیں موجود ہیں جو اسی دور میں لوگوں کو حاصل حریت تعبیر اور آزادی اظہار رائے پر دلالت کرتی ہیں اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی نشان دہی کرتی ہیں۔ نیز جن سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ آپ اس قسم کی تنقید کا کس طرح سامنا کرتے تھے۔

سیرتِ امیر معاویۃ رضی اللہ عنہ

۱۔ابو مسلم خولانی:

ابو مسلم رحمہ اللہ کا شمار ربانی علماء میں ہوتا تھا۔ آپ حق گوئی کے بارے میں مداہنت سے کام لینے کے عادی نہیں تھے۔ ایک دفعہ آپ معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور انہیں پند ونصیحت کرتے ہوئے فرمایا: عربوں کے کسی خاص قبیلہ کی طرف رجحان رکھنے سے بچیں۔ آپ کی طرف سے روا رکھا جانے والا یہ ظلم آپ کے عدل کو ختم کر دے گی۔[1] ابو مسلم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی رعیت کے سامنے ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے اور فرائض کی ادائیگی کی تلقین فرماتے، ایک دن وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہنے لگے: اَلسَّلاَ مُ عَلَیْکَ اَیُّھَالاْ جِیْرُ (مزدور)۔ لوگوں نے کہا: یوں نہیں بلکہ یوں کہیں: اَلسَّلاَ مُ عَلَیْکَ اَیُّھَالاْ مِیْرُ ۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابو مسلم کو کچھ نہ کہیں۔ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے بہتر جانتے ہیں۔ ابو مسلم کہنے لگے: آپ کی مثال اس آدمی کی سی ہے جس نے کسی کو اجرت پر حاصل کیا اور اپنے مویشی اس شرط پر اس کے حوالے کر دیئے کہ اگر وہ انہیں اچھی طرح چرائے گا ان کے گوشت اور دودھ میں اضافہ کرے گا تو اجرت کا حق دار ہو گا۔ اب اگر اس نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے جانوروں کو اچھی طرح چرایا اور انہیں خوب موٹا تازہ کر دیا تو مالک خوش ہو کر اسے اس کی مزدوری کے علاوہ اپنی طرف سے کچھ اور بھی دے گا اور اگر وہ اس میں کوتاہی کرتے ہوئے جانوروں کو پہلے سے بھی کمزور کر دے گا تو مالک اس پر غضب ناک ہو گا۔ یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: مَاسَلِمَ اللّٰہُ۔[2]

آپ نے دیکھا کہ کس طرح ابو مسلم خولانی نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو رعیت کے معاملات میں دلچسپی لینے اور ان کے مسائل حل کرنے کی ترغیب دلائی اور ان کے امور کی اصلاح میں سستی برتنے یا کوتاہی کرنے سے خبردار کیا، اور اس کے لیے انہوں نے ایک ضرب المثل سے کام لیا۔[3] اسی طرح جب ایک دفعہ معاویہ رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما ہوئے اس وقت انہوں نے لوگوں کے عطیات روک رکھے تھے تو ابو مسلم کھڑے ہو کر کہنے لگے: معاویہ! آپ نے نے لوگوں کے عطیات کیوں روک رکھے ہیں؟ یہ آپ کی، آپ کے باپ اور آپ کی ماں کی کدو کاوش کا نتیجہ نہیں ہیں کہ آپ انہیں اپنی مرضی سے روک لیں۔ یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ شدید طور پر غضب ناک ہو گئے، منبر سے نیچے اترے اور لوگوں سے کہا: تم لوگ اپنی اپنی جگہ پر موجود رہو اور پھر خود تھوڑی دیر کے لیے ان کی آنکھوں سے غائب ہو گئے، پھر جب واپس لوٹے تو کہنے لگے: ابو مسلم کی بات نے مجھے غضب ناک کر دیا تھا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: "غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے، لہٰذا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وہ غسل کر لیا کرے۔"[4] میں اندر گیا اور غسل کر لیا۔ ابو مسلم کا یہ کہنا درست ہے کہ یہ مال میری اور میرے باپ کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔ اپنے عطیات وصول کرنے کے لیے آؤ۔[5]

۲۔ فرزدق معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے:

فرزدق کا چچا حتات بن یزید مجاشعی ایک وفد کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے دوسروں کے مقابلہ میں اسے کم انعام دیا، پھر جب وہ راستے میں ہی مر گیا تو انہوں نے وہ انعام اس سے واپس لے کر بیت المال میں جمع کرا دیا اس پر فرزدق نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی مذمت کرتے ہوئے اور اپنے نسب اور آباء واجداد پر فخر کرتے ہوئے کہا:

فلو کان ہذا الامر فی جاہلیة علمت من المرء قلیل جلائبه

و لو کان ہذا الامر فی غیر ملککم لابدیته او غص بالماء شاربه

و کم من اب لی یا معاوی لم یکن ابوک الذی من عبد شمس یقاربه

" اگر یہ کام زمانہ جاہلیت میں ہوتا تو مجھے معلوم ہوتا کہ اس آدمی کے پاس وسائل کی کمی ہے۔

اور اگر یہ کام تمہاری بادشاہت کے علاوہ کہیں اور ہوتا تو میں اسے ظاہر کر دیتا حتیٰ کہ پانی پینے والے کو اچھو لگ جاتا۔ اے معاویہ! میرے کتنے ہی آباء ایسے ہیں کہ عبد شمس سے تمہارا باپ ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔" یہ اشعار سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اور تو کچھ نہ کیا البتہ الحتات کا انعام اس کے گھر والوں کو بھجوا دیا۔[1]

معاویہ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیٹوں میں سے سرکردہ حضرات کی بڑی قدر و منزلت کیا کرتے تھے اور یہ اس امر کے باوجود تھا کہ ان میں سے بعض ان پر کڑی تنقید کیا کرتے تھے، وہ اکثر فرمایا کرتے: میں اپنے آپ کو اس سے بچا کر رکھتا ہوں کہ کوئی گناہ میرے عفو و کرم سے بڑا نہ ہو جائے۔ کوئی جہالت میرے حلم و حوصلہ سے بڑھ نہ جائے، کوئی باپردہ چیز ایسی نہ ہو جس کی میں پردہ پوشی نہ کروں، اور کوئی برائی میرے احسان سے زیادہ نہ ہو۔[2]

[1] الدولة الاموية المفترى عليها، ص: ۳۰۴۔ تاریخ طبری: ۶/۱۵۹. [2] ایضاً، ص: ۳۰۴.

۳۔ ام سنان بنت خیثمہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں:

اس خاتون کا شمار علی رضی اللہ عنہ کے انصار و معاونین میں ہوتا تھا، یہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد امارت میں دمشق آئیں، اس نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اجازت طلب کی تو اسے اجازت دے دی گئی، اس نے امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنا تعارف کروایا تو آپ نے اسے پہچان لیا اور اسے بیٹھنے کا حکم دیا۔ جب وہ بیٹھ گئی تو اس سے فرمایا: بنت خیثمہ! ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں، ہماری زمین میں کیسے آنا ہوا، مجھے معلوم ہے کہ تو میری قوم سے نفرت کیا کرتی تھی اور میرے دشمن کو میرے خلاف بھڑکایا کرتی تھی؟ وہ کہنے لگی: امیر المومنین! بنو عبد مناف پاکیزہ اخلاق، امتیازی نشانات اور بڑے حلم و حوصلہ کے مالک ہیں، وہ علم کے بعد جہالت کا مظاہرہ نہیں کرتے، حلم کے بعد سفاہت کے مرتکب نہیں ہوتے اور عفو و درگزر کے بعد تعاقب نہیں کرتے اور اپنے آباء و اجداد کے طور طریقوں کی اتباع میں آپ سب لوگوں کے بڑھ کر حق دار ہیں۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ام سنان! تم نے درست کہا۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے ماحول پر خاموشی چھا گئی جسے انہوں نے ام سنان سے سوال کر کے توڑا جس میں انہوں نے اسے اس کے وہ شعر یاد دلائے جن کے ذریعے وہ لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکایا کرتی تھی، اس دوران معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: تیرے یہ اشعار کیسے ہیں؟

عزب الرقاد فمقلتی ما ترقد و اللیل یصدر بالهموم و یورد

یا آل مذحج لا مقام فشمّروا إن العدو لا أحمد یقصد

هذا علی کالهلال تحُفّه وسط السماء من الکواکب اسعد

ما زال مذ شهد الحروب مظفرا و النصر فوق لوائه ما یُفقد

" سونے والے دور چلے گئے جبکہ میری آنکھ نہیں سوتی۔ رات آتی بھی غموں کے ساتھ ہے اور جاتی بھی غموں کے ساتھ۔ یہ مجھ پر چاند کی طرح ہے جسے آسمان کے وسط میں باسعادت ستاروں نے گھیر رکھا ہے۔

اس نے جب سے جنگوں میں شریک ہونا شروع کیا ہے کامیاب رہا ہے اس کے پرچم سے نصرت کبھی مفقود نہیں ہوتی۔" جب معاویہ رضی اللہ عنہ ام سنان کو اس کے یہ اشعار سنا رہے تھے اس وقت وہ انہیں توجہ سے سنتی رہی اور پھر ان سے کہنے لگی: امیر المومنین! ایسا ہی ہوا تھا، اب ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ان باتوں کو بھول جائیں گے، آپ جیسے لوگ ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔

قبل اس کے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کوئی بات کرتے ان کے ہم نشینوں میں سے ایک آدمی کہنے لگا: امیر المومنین! مجھے اس کے وہ اشعار یاد ہیں جو اس بات کے خلاف ہیں جو یہ اس وقت آپ سے کہہ رہی ہے، یہ اشعار اسی کے ہیں:

اما هلکت ابا الحسین فلم تزل بالحق تعرف هادیا مهدیا

فاذهب علیک صلاة ربک ما دعت فوق الغصون حمامة قمریا

فالیوم لا خلف یؤمل بعده هیهات نمدح بعده انسیا[1]

"ابو الحسین اگر تم ہلاک ہو گئے ہو تو کیا ہوا، تم ہمیشہ حق کے ساتھ ہادی و مہدی پہچانے گئے۔

جاؤ تم پر تمہارے رب کی رحمت ہو جب تک قمری ٹہنیوں پر پکارتی رہے۔

آج کے بعد کوئی دن ایسا نہیں آئے گا جس کی امید کی جا سکے، بہت مشکل ہے کہ ہم اس کے بعد کسی انسان کی تعریف کریں۔"

یہ اشعار سن کر ام سنان کہنے لگی: امیر المومنین! زبان سے نکلنے والا یہ قول صداقت پر مبنی ہے، جو کچھ ہم نے سمجھا اگر وہ آپ میں موجود ہے تو پھر آپ کا حصہ سب سے بڑھ کر ہے۔ پھر اس نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعض شرکاء مجلس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ان جیسے لوگوں نے ہی مسلمانوں

کے دلوں میں تم سے نفرت وبغض پیدا کیا ہے، لہذا ان کی باتوں پر نہ جائیں اور انہیں ان کے عہدوں سے ہٹادیں، اگر آپ یہ کام کر گزریں تو آپ اللہ تعالیٰ سے مزید قریب ہو جائیں گے اور مسلمان آپ سے زیادہ محبت کرنے لگیں گے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کی باتوں پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس سے سلسلہ کلام یہ کہتے ہوئے منقطع کر دیا کہ: ام سنان! تو بھی یہ باتیں کہتی ہے؟ وہ بولی: سبحان اللہ! امیر المومنین! اللہ کی قسم! تم جیسے لوگوں کی نہ تو باطل کے ساتھ تعریف کی جاسکتی ہے اور نہ ان کے سامنے جھوٹ کے ساتھ معذرت کی جاسکتی ہے۔ آپ ہماری رائے سے بخوبی آگاہ ہیں اور ہمارے دلوں کی آواز سے بخوبی آشنا۔ واللہ! جب تک علی رضی اللہ عنہ زندہ تھے وہ ہمیں تم سے زیادہ پسند تھے اور جب تک آپ زندہ رہیں گے ان کے علاوہ دوسروں سے زیادہ پسند رہیں گے۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے سوال کیا: میں جب تک زندہ رہوں گا تجھے کن لوگوں سے زیادہ پسند رہوں گا؟ اس نے جواب دیا: امیر المومنین! آپ ہمیں مروان بن حکم اور سعید بن العاص سے زیادہ پسند ہیں، پھر انہوں نے پوچھا: میں ان پر اس کا استحقاق کس وجہ سے رکھتا ہوں؟ اس نے بتایا: حلم وحوصلہ اور عفو وکرم کی وجہ سے۔[1] بات چیت ختم ہو گئی تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: میں اس وقت تمھاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ اس نے کہا کہ مدینہ میں گرفتار میرے پوتے کو رہا کر دیا جائے۔ انہوں نے اس کی درخواست کو قبول کر لیا، پھر اس کا اکرام اور صلہ رحمی کرتے ہوئے اسے واپس مدینہ بجھوا دیا۔ بعد ازاں وہ ہمیشہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے دعائیں کرتی رہی۔[2] یہ ہے عصر تابعین کی ایک خاتون ام سنان جو حق گوئی اور صاف دلی سے متصف تھی اور اسے ایسی حکمت وبلاغت سے نوازا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔[3]

ام سنان ایسی اکیلی عورت نہیں تھی جو آزادانہ انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتی اور کھل کر اپنے اعتقادات بیان کیا کرتی تھی بلکہ اس جیسی اور بھی بہت ساری خواتین اپنے اندر یہ حوصلہ پاتی تھیں۔ جن میں سے زرقاء بنت عدی[4] اور ام الخیر بنت حریش[5] سر فہرست ہیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ لوگوں کو کھل کر اپنی آراء کے اظہار کا موقع دیتے اور تنقید کرنے اور پر امن معارضہ کے حق کو استعمال کرنے پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔

تیسری فصل

معاویہ رضی اللہ عنہ کی داخلی سیاست

داخلی سیاست

۴۱ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر امت اسلامیہ کا اجماع ہوا تو انہوں نے عالم اسلام کے گوشے گوشے میں امن وامان قائم کرنے اور استقرار واستحکام کی بنیادوں کو پختہ کرنے کے لیے اپنی تمام تر ذہانت وفطانت کو کام میں لانا شروع کر دیا۔ اس کے لیے انہوں نے داخلی سیاست کا جو منہج اپنایا وہ متعدد امور پر قائم تھا:

.....

پہلی بحث:

شیوخ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، ان کے بیٹوں اور خاص طور سے بنو ہاشم کی بڑی شخصیات کے ساتھ احسان پر مبنی رویہ

معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے بعد اہل حجاز میں خطبہ دیتے ہوئے ان سے اس بارے میں معذرت کی کہ وہ خلفائے راشدین کا طریقہ اپنانے سے قاصر رہے۔ آپ نے فرمایا: ان جیسے لوگ اب کہاں ملیں گے؟ اور ان جیسے اعمال بجالانے کی اب کس میں قدرت ہے۔ ان کے بعد کسی کے لیے بھی ان جیسے فضل واحسان کا حصول ممکن نہیں ہے۔ البتہ میں نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس میں میری بھی منفعت ہے اور تمہاری بھی، اس طریقہ میں تمہارے لیے خورد ونوش کا اچھا سامان موجود ہے جب تک سیرت وکردار درست رہے اور اطاعت گزاری خوب رہے، اگر تم مجھے اپنے سے بہتر نہیں پاتے تو میں تمہارے لیے بہت بہتر ہوں، اللہ کی قسم! میں اس کے خلاف تلوار نہیں اٹھاؤں گا جس کے پاس تلوار نہیں ہے۔ گزشتہ ایام میں جو کچھ بھی ہوا اسے میں نے بھلا دیا، اگر میں تمہارے تمام حقوق ادا نہیں کر سکا تو جس قدر ادا کر سکا ہوں اس پر راضی رہو، فتنہ سے کنارہ کش رہو اور اس کا ارادہ بھی نہ کرو اس لیے کہ فتنہ معیشت کو تباہ کرتا، نعمتوں کو بے مزہ بناتا اور تباہی کو جنم دیتا ہے۔ میں اپنے لیے اور تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوں۔[1] خلیفۃ المسلمین معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس جیسی سیرت اپنائی تو انصار ومہاجرین کی اولاد اور وہ سب لوگ آپ کے تابع فرمان ہو گئے جو انہیں اپنے سے زیادہ خلافت کا حق دار سمجھتے تھے، وہ لوگوں کے دل جیتنے اور ان کے ساتھ احسان کرنے کا بڑا اہتمام کرتے اور لوگوں کی تنقیص سے بچنے کے لیے بہت زیادہ محتاط رہتے۔ معاشرے میں قائدانہ کردار ادا کرنے والی کبار شخصیات پر بلا حساب خرچ کرتے اور یہ سمجھتے کہ ان کی رعایا کی طرف سے ان پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، لہٰذا انہیں ان کی ضروریات کی تکمیل اور ان کی مشکلات کے حل کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہنا چاہیے اور غالباً بنو ہاشم کے اشراف ورؤساء کو سب سے زیادہ مال وزر سے نوازا کرتے اور اس میں کوئی انوکھا پن بھی نہیں تھا اس لیے کہ وہ گروہی قیادت کے حوالے سے جماہیر امت کی نمائندگی کرتے تھے اور افراد امت کو امراء وولاۃ سے زیادہ ان کی ضرورت رہتی تھی۔ یہ قیادتیں نہ تو حکومت میں شامل تھیں اور نہ انہیں اس میں کوئی دلچسپی ہی تھی۔[1]

اولًا:... صلح کے بعد حسن رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے تعلقات

حضرت حسن رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران ان کے پاس جایا کرتے تھے، جب وہ ایک بار ان کے پاس گئے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں ایسا انعام دینا چاہتا ہوں جو میں نے آپ سے پہلے کسی کو دیا اور نہ بعد میں دوں گا، چنانچہ انہوں نے انہیں چار لاکھ درہم دیئے جنہیں حسن رضی اللہ عنہ نے قبول کر لیا۔[2] دوسری روایت میں ہے: حسن بن علی رضی اللہ عنہما ہر سال معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے جاتے اور وہ انہیں ایک لاکھ درہم دیا کرتے، ایک سال وہ نہ جا سکے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس کوئی چیز نہ بھیجی، حسن رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھنے کے لیے دوات منگوائی تو انہیں خط لکھنے سے پہلے نیند آ گئی، انہوں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو یوں

لگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہوں: ''حسن! کیا تو اپنی ضرورت کے لیے مخلوق کو خط لکھتا ہے اور اپنے رب سے سوال نہیں کرتا؟ حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں کیا کروں جبکہ میرا قرضہ بہت زیادہ ہو چکا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دعا کیا کر: ''یا اللہ! میں تجھ سے ہر اس چیز کا سوال کرتا ہوں جس سے میری قوت اور حیلہ کمزور ہے اور جس تک میری رغبت نہیں پہنچی، اس کا میرے دل میں خیال نہیں آیا، اس تک میری امید نہیں پہنچی اور میری زبان پر وہ یقین جاری نہیں ہوا جسے تو نے پہلی مخلوق میں سے کسی کو دیا، مہاجرین اور دوسروں کو دیا مگر تو مجھ کو اس سے نواز دے، یا ارحم الراحمین۔'' حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں بیدار ہوا تو یہ دعا مجھے یاد ہو چکی تھی، میں یہ دعا کرتا رہا، تھوڑی ہی دیر بعد معاویہ رضی اللہ عنہ نے میرا تذکرہ کیا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ اس سال نہیں آئے۔ جس پر انہوں نے میرے لیے دو لاکھ درہم کا حکم دے دیا۔[3] دوسری روایت میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن رضی اللہ عنہ کو خواب میں یہ دعا سکھائی تھی: ''میرے اللہ! میرے دل میں اپنی امید پیدا کر دے اور اپنے سے علاوہ لوگوں سے میری امید منقطع کر دے کہ میں تیرے علاوہ کسی سے امید نہ رکھوں، یا اللہ! جس چیز سے میری قوت کمزور پڑ گئی، میرا عمل اس سے قاصر رہا۔ اس تک میری رغبت نہ پہنچی، اس تک میرا سوال نہ پہنچا اور میری زبان پر وہ جاری ہوا جو یقین تو نے اگلوں اور پچھلوں میں سے کسی ایک کو دیا، تو یا رب العالمین مجھے وہ بھی عطا فرما۔'' حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم، میں نے یہ دعا ہفتہ بھر بھی نہیں کی ہو گی کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے مجھے ڈیڑھ لاکھ درہم بھجوا دیئے۔ میں نے کہا: سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو اپنا ذکر کرنے والوں کو نہیں بھولتا اور اپنے سے دعا کرنے والوں کو ناکام نہیں لوٹاتا۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حسن تم کیسے ہو؟'' میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں خیریت سے ہوں، اور میں نے آپ کو اپنا واقعہ سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بیٹے! جو لوگ خالق سے امید رکھتے اور مخلوق سے نہیں رکھتے ان کی امیدیں اسی طرح پوری ہوتی ہیں۔''[1] زہری روایت کرتے ہیں: ... جب علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اگر تمہیں یزید پر بجز اس کے اور کوئی فضیلت حاصل نہ ہوتی کہ تمہاری ماں قریشی خاتون ہے جبکہ اس کی ماں بنو کلب سے ہے تو تمہیں پھر بھی اس پر فضیلت ہوتی، مگر اس پر تمہاری فضیلت کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے اس لیے کہ تمہاری ماں فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔[2]

ثانیا:... معاویہ رضی اللہ عنہ کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تعلقات

جعفر بن محمد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما معاویہ رضی اللہ عنہ سے عطیات قبول کیا کرتے تھے۔[3] ایک دفعہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے لیے ایک لاکھ درہم بھیجے تو وہ اپنے پاس موجود لوگوں سے کہنے لگے: اس میں سے جو شخص کچھ لے لے وہ اس کا ہوا۔ انہوں نے حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے لیے ایک لاکھ درہم بھجوائے تو ان کے پاس دس لوگ بیٹھے تھے انہوں نے وہ درہم دس دس ہزار کر کے ان میں تقسیم کر دیئے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو ایک لاکھ درہم دینے کا حکم دیا۔[4] معاویہ رضی اللہ عنہ کی حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوتی تو فرماتے: نواسہ رسول! اہلا و سہلا مرحبا۔ پھر ان کے لیے تین لاکھ درہم کا حکم دیتے۔ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے ملاقات کرتے تو فرماتے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی اور ان کے حواری کے بیٹے! میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں اور پھر انہیں ایک لاکھ درہم دینے کا حکم دیتے۔[5] عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد انہیں اچھے الفاظ سے یاد

کیا کرتے تھے۔ ہشام بن عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے نماز پڑھی اور پھر نماز ادا کرنے کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموش رہے اور پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: ابن ہند دور نہ ہو ان میں کچھ ایسی گنجائش موجود ہیں جو ہمیں ان کے بعد کسی میں نظر نہیں آتیں۔ اللہ کی قسم! ہم انہیں خوفزدہ کرتے تھے مگر وہ تو شیر سے بھی زیادہ دلیر تھے۔ وہ ہم سے کیسے خوفزدہ ہو سکتے تھے، ہم انہیں دھوکہ دینا چاہتے مگر وہ بڑے دانا اور بارعب تھے وہ ہمارے دھوکے میں آنے والے نہیں تھے۔ واللہ! میں چاہتا ہوں کہ جب تک اس (جبل ابو قبیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں ایک پتھر بھی موجود رہے ہم ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔[1] عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا یہ قول اس وقت کا ہے جب عبد الملک بن مروان کے عہد میں انہیں حصار میں لے لیا گیا تھا۔[2]

ثالثاً:... عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ

معاویہ رضی اللہ عنہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بڑا احترام کیا کرتے تھے، ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کے پاس جاتے تو وہ ان کی تعظیم و توقیر کرتے انہیں اپنے پاس بٹھاتے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ ان سے بڑے مشکل اور پیچیدہ قسم کے سوالات کرتے اور وہ فوراً ان کا جواب دیتے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر کسی کو حاضر جواب نہیں دیکھا، جب معاویہ رضی اللہ عنہ کو حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی وفات کی خبر ملی تو اتفاق سے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی ان کے پاس موجود تھے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے حسن رضی اللہ عنہ کی وفات پر بڑے اچھے انداز سے تعزیت کی اور انہوں نے اس کا بہت خوبصورت جواب دیا۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو تعزیت کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بھیجا تو اس نے ان کے سامنے بیٹھ کر ان سے بڑی مختصر اور فصیح عبارت میں تعزیت کی جس کے لیے انہوں نے یزید کا شکریہ ادا کیا۔[4] حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تعزیت کرتے ہوئے کہا تھا: اللہ تعالیٰ تمہیں حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی وجہ سے غم ناک نہ کرے۔ اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان سے کہا: جب تک امیر المومنین زندہ ہیں اللہ تعالیٰ مجھے غم ناک نہیں کرے گا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہزاروں درہم نقد اور کئی اشیاء عطیہ کے طور پر ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فرمایا: انہیں اپنے اہل و عیال میں تقسیم کر دینا۔[5] حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا شمار اسلامی معاشرے کے سادات اور اس کے بڑے قائدین میں ہوتا تھا اور معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے سماجی اور علمی مقام و مرتبہ کا اعتراف کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو علمی معاملات میں خلیفہ کے مشیر کا اعزاز حاصل تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بنو امیہ پر بنو ہاشم کی فضیلت کا بھی اعتراف تھا۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا تم افضل ہو یا بنو ہاشم؟ تو انہوں نے کہا: کبھی ان کا اور کبھی ہمارا پلڑا بھاری ہوتا رہا یہاں تک کہ اگلوں اور پچھلوں میں بے مثل اور بے مثال محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمیشہ کے لیے سربلند کر دیا۔[6] معاویہ رضی اللہ عنہ بنو امیہ کو آل علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ بد سلوکی کرنے سے یہ کہہ کر خبردار کیا کرتے تھے: جنگ کا آغاز سرگوشی، اس کا درمیان شکایت اور آخر بلویٰ ہوا کرتا ہے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقربین سے ان کے اوصاف اور ان کے عمدہ اعمال و اطوار کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے۔[7]

رابعاً:... کیا معاویہ رضی اللہ عنہ نے منبروں پر امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی کھلی اجازت دے رکھی تھی؟

کتب تاریخ بتاتی ہیں کہ بنو امیہ کے ولاۃ و امراء عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کیا کرتے تھے۔ لوط بن یحییٰ سے ابن سعد کا روایت کردہ یہ اثر صحیح نہیں ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے قبل بنو امیہ کے امراء حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کیا کرتے تھے مگر عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے اس سے روک دیا۔[1] اس اثر کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ایک راوی علی بن محمد مدائنی ضعیف ہے اور اس کا شیخ لوط بن یحییٰ بھی بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اسے یحییٰ بن معین غیر ثقہ جبکہ ابو حاتم متروک الحدیث قرار دیتے ہیں۔ دار قطنی بھی اسے ضعیف اخباری بتاتے ہیں۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اسے غیر ثقہ قرار دیا ہے۔[2] اس نے زیادہ روایات ضعفاء اور مستور الحال لوگوں سے اخذ کی ہیں[3] اور وہ خود بھی روایات گھڑ لیا کرتا تھا۔ روافض نے معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت لگائی ہے کہ وہ لوگوں کو مساجد کے منبروں پر علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم اور لعن طعن کرنے پر اکسایا کرتے تھے۔ مگر ان کا یہ دعویٰ باطل ہے اور اس کی کوئی صحیح اساس نہیں ہے۔ تباہ کن بات تو یہ ہے کہ محققین نے اس کذب و افتراء کو نقد و تعدیل کے اصولوں پر پرکھے بغیر ہی قبول کر لیا یہاں تک کہ متاخرین کے نزدیک اس نے ایسی مسلمہ حقیقت کا روپ دھار لیا جس کے مناقشہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ جبکہ نہ تو یہ بات کسی صحیح روایت سے ثابت ہے اور نہ وہ روایات قابل اعتماد ہیں جنہیں دمیری یعقوبی اور ابو الفرج اصفہانی نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ صحیح تاریخ ان لوگوں کی مرویات کے خلاف کا اثبات کرتی ہے۔[4] وہ یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت کا احترام کرتے اور انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بنو امیہ کے منبروں پر علی رضی اللہ عنہ کو لعن طعن کرنا نہ تو حوادث و واقعات کی منطق سے ہم آہنگ ہے اور نہ متحارب فریقین کے مزاج و طبائع سے۔ اگر ہم بنو امیہ کی معاصر کتب تاریخ کا مطالعہ کریں تو ان میں ہمیں ایسی کوئی بھی چیز نہیں ملتی۔ یہ حکایات ان متاخرین کی کتب میں نظر آتی ہیں جنہوں نے بنو عباس کے دورِ حکومت میں تاریخ کو مدوّن کیا اور جن کے پیش نظر جمہور مسلمانوں کی نظر میں بنو امیہ کی شہرت کو نقصان پہنچانا تھا۔ یہ بے سر و پا باتیں مسعودی نے مروج الذہب میں اور اس کے علاوہ دیگر شیعہ مورخین نے لکھیں اور وہاں سے اہل سنت کی کتب تاریخ میں داخل ہو گئیں۔ جبکہ ان میں سے کوئی روایت بھی صریح اور صحیح نہیں ہے۔[5] اس دعویٰ کے اثبات کے لیے جرح سے محفوظ سند اور اعتراض سے محفوظ متن کی ضرورت ہے۔ محققین اور باحثین کے نزدیک اس دعویٰ کا وزن سبھی کے علم میں ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ ان جیسی تہمتوں سے بہت دور اور مبرا ہیں۔ دین میں ان کی فضیلت ثابت شدہ حقیقت ہے۔ افراد امت میں ان کی سیرت قابل تعریف تھی۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خیار تابعین علیہا السلام نے ان کی تعریف و توصیف اور ان کے لیے دین، علم، عدل، حلم اور تمام خصائل خیر کی شہادت دی۔[1] یہ سب کچھ معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں ثابت ہے۔ اس قسم کی سیرت و کردار کے حامل شخص کے لیے ناممکن و محال ہے کہ وہ لوگوں کو منبروں پر کھڑے ہو کر علی رضی اللہ عنہ کو لعن طعن کرنے پر اکسائے جب کہ وہ عزو فضل میں اپنی مثال آپ ہو۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت، ان کے حلم و حوصلہ، عفو و درگزر اور حسن سیاست سے آگاہ شخص پر یہ بات عیاں ہے کہ اس قسم کی باتیں ان پر محض کذب و افتراء ہیں، معاویہ رضی اللہ عنہ کا حلم ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ نسلوں کے لیے اسوہ و قدوہ ہے۔ صحیح مسلم میں عامر بن سعد بن ابی وقاص اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما نے سعد رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تجھے ابو تراب رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرنے سے کس نے روکا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جب تک مجھے وہ تین باتیں

یاد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے فرمائی تھیں میں انہیں سب و شتم نہیں کروں گا۔ اگر مجھے ان میں سے ایک بھی مل جائے تو یہ مجھے سرخ رنگ کے اونٹوں سے بھی زیادہ پسند ہو گی۔[2]

روافض کا اس روایت سے اپنے کذب و افتراء کے لیے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ ان کے زعم باطل پر دلالت نہیں کرتی۔ امام نووی فرماتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس قول میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ انہوں نے سعد کو علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دینے کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے سعد سے صرف اس سبب کے بارے میں پوچھا تھا جو ان کے لیے علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرنے سے مانع تھا، گویا کہ وہ ان سے پوچھ رہے تھے کہ تم یہ کام ورع و پرہیز گاری کی وجہ سے نہیں کرتے، کسی خوف کی وجہ سے نہیں کرتے یا اس کی کوئی اور وجہ ہے؟ اگر تو انہیں سب و شتم نہ دینے کی وجہ تورّع یا ان کا احترام ہے تو پھر تمہارا یہ رویہ بہت خوب ہے اور شاید سعد رضی اللہ عنہ کسی ایسی جماعت میں موجود ہوں جو انہیں سب و شتم کا نشانہ بناتی ہو مگر وہ ان کے ساتھ یہ کام نہ کرتے ہوں اور انہیں اس سے روک بھی نہ سکتے ہوں۔ اس کی ایک دوسری تاویل بھی کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ اس کا معنی یہ کیا جائے: تمہیں اس چیز سے کس نے روکا کہ تم علی رضی اللہ عنہ کی رائے اور اجتہاد کو غلط بتاؤ اور لوگوں کے سامنے ہماری رائے اور اجتہاد کے حسن کو واضح کرو۔[3] ایک دفعہ جب ضرار انہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف و توصیف کی جسے سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ رونے لگے اور ضرار کی باتوں کی تصدیق کی تو ابو العباس قرطبی نے اس کی تعلیق میں لکھا: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور ان کے مقام و مرتبہ سے بخوبی آگاہ تھے۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر ان کی طرف سے علی رضی اللہ عنہ کو صراحتاً سبّ و شتم کرنے کے حوالے سے ان کے بارے میں جو کچھ مروی ہے اس کا زیادہ تر حصہ جھوٹ اور غیر صحیح ہے۔ اس میں سے سب سے زیادہ صحیح ان کا سعد بن ابی وقاص سے ان کا مذکورہ بالا ارشاد ہے۔ مگر وہ سب و شتم کے لیے صریح نہیں ہے۔ وہ اس بارے میں محض ایک سوال تھا کہ ان کے لیے علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم دینے سے کون سی چیز مانع ہے؟ پھر جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کا جواب سنا تو پر سکون ہو کر اپنا سر جھکا لیا اور سمجھ گئے کہ حق حق دار کو ملا ہے۔[1] ڈاکٹر الزحیلی اپنی کتاب "الصحبۃ والآل" میں رقمطراز ہیں: اس سے جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ سے یہ بات خوش طبعی کے انداز میں کی تھی جس سے مقصود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض فضائل سے آگاہی حاصل کرنا تھا۔ اس لیے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے ذہین و فطین شخص تھے آپ لوگوں سے ان کے اندر کی باتیں معلوم کرنے کو پسند کرتے تھے، جب انہوں نے سعد رضی اللہ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کا موقف معلوم کرنا چاہا تو ان سے اس انداز میں سوال کرنا مناسب سمجھا۔ ان کا یہ سوال ان کے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سوال جیسا ہے کہ کیا آپ علی رضی اللہ عنہ کی ملت پر ہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: میں نہ علی رضی اللہ عنہ کی ملت پر ہوں اور نہ عثمان رضی اللہ عنہ کی ملت پر۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت پر ہوں۔[2] ظاہر ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ سوال خوش طبعی کے انداز میں تھا، اسی طرح حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ان کا یہ قول بھی خوش طبعی کی قبیل سے تھا۔ رہا روافض کا یہ دعویٰ کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ وہ علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کیا کریں تو ان سے اس جیسی بات کا صدور ہرگز نہیں ہو سکتا۔[3] اس کے مانع کئی امور ہیں:

۱۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نہ تو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرتے تھے اور نہ انہوں نے اس کا کسی اور کو حکم دیا، بلکہ وہ ان کی تعظیم کیا کرتے اور ان کی فضیلت اور سابق الاسلام ہونے کا اعتراف کیا کرتے تھے جس طرح کہ ان کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابو

مسلم خولانی اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا: کیا آپ علی رضی اللہ عنہ سے تنازع کرتے ہیں یا آپ ان جیسے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: اللہ کی قسم! مجھے بخوبی علم ہے کہ علی رضی اللہ عنہ مجھ سے بہت بہتر اور افضل ہیں اور مجھ سے زیادہ حکومت کے حق دار ہیں۔[4] مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو وہ رونے لگے، ان کی بیوی کہنے لگی: آپ انہیں رو رہے ہیں جن سے قتال کرتے رہے؟ انہوں نے جواب دیا: تو نہیں جانتی کہ لوگ کس قدر فضل و شرف، علم اور فقہ سے محروم ہو گئے۔[5] کیا عقل و دین کے حوالے سے اس امر کا کوئی جواز پیدا ہو سکتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کر سکتے ہیں یا انہیں سب و شتم کرنے کا کسی دوسرے کو حکم دے سکتے ہیں جبکہ وہ علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قسم کا اعتقاد بھی رکھتے ہوں۔[6]

۲۔ کسی صحیح دلیل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کے دوران بھی انہیں کبھی سب و شتم کیا ہو تو کیا یہ بات معقول ہے کہ وہ ان کے ساتھ جنگ کے اختتام اور ان کی وفات کے بعد انہیں گالی دیں گے۔ یہ بات اہل عقل و دانش کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ جب وہ خود ایسا نہیں کر سکتے تو دوسروں کو اس کے لیے کیسے پابند کر سکتے ہیں؟

۳۔ معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے دانا شخص تھے اور وہ عقل و فکر میں بڑی شہرت کے حامل تھے۔ اگر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دینے کے لیے لوگوں کو اُکسانا چاہتے تو کیا وہ اس کام کے لیے سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ جیسے انسان سے مطالبہ کرتے جبکہ ان کی شجاعت و دلیری، فضیلت و پرہیز گاری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اور پھر وہ فتنہ میں سرے سے داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ ایسا کام تو کوئی احمق شخص بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ معاویہ رضی اللہ عنہ جیسا انسان یہ کچھ کرنے لگے۔

۴۔ معاویہ رضی اللہ عنہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی خلافت سے دست برداری کے بعد خلافت کے ساتھ منفرد تھے۔ سب لوگوں نے ان پر اتفاق کر لیا تھا اور تمام شہر ان کے ماتحت تھے۔ ایسے حالات میں علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرنا انہیں کیا فائدہ دے سکتا تھا؟ بلکہ حکمت و دانائی اور حسن سیاست تو اس کے برعکس کی متقاضی تھی تاکہ انسانی نفوس کو اطمینان ملتا اور امور مملکت میں ٹھہراؤ آتا۔ یہ باتیں معاویہ رضی اللہ عنہ سے مخفی رہنے والی نہیں تھیں۔ ۵۔ استقلال خلافت کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹوں کے درمیان قربت و الفت پیدا ہو چکی تھی جیسا کہ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مشہور ہے۔[1] مثلاً حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما وفد کی صورت میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے دو لاکھ درہم ہدیہ کی صورت میں ان کے حوالے کیے اور پھر فرمایا: اتنا گراں قدر ہدیہ مجھ سے پہلے آپ کی خدمت میں کسی نے پیش نہیں کیا۔ اس پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے ہم سے افضل کسی شخص کو بھی تو کبھی عطیہ نہیں دیا۔[2] ایک دفعہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش آمدید کہتے ہیں، پھر انہیں تین لاکھ درہم عطیہ دینے کا حکم جاری فرمایا۔[3] اس سے اس جھوٹ کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرنے کے لیے لوگوں کو اُکسایا کرتے تھے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور اولاد علی رضی اللہ عنہ کے درمیان اس طرح کی الفت و مودت بھی ہو اور وہ ایک دوسرے کی تعظیم و توقیر بھی کریں اور پھر معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے والد گرامی کو سب و شتم بھی کریں۔ اس سے اس مسئلہ کے بارے میں حق عیاں ہو جاتا ہے اور اصل حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔[4] مزید برآں چونکہ وہ معاشرہ عمومی

طور سے احکام شریعت کا پابند اور نفاذ شریعت کے لیے بڑا حریص تھا، لہٰذا وہ لوگ لعن طعن اور فحش گوئی سے کوسوں دور تھے۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مشرک مُردوں کو سب و شتم کرنے سے منع فرمایا ہے اور اولیاء اللہ کو گالی گلوچ کرنے کی کس طرح اجازت دے سکتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے کہ: "مُردوں کو گالیاں مت دو اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ آگے بھیجا اس تک پہنچ چکے ہیں۔"[2]

خامساً:... معاویہ رضی اللہ عنہ، اور حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو زہر دیا جانا

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا اور اس کا الزام ان کی بیوی جعدہ بنت اشعث بن قیس پر عائد کیا گیا، اس زہر کی وجہ سے حسن رضی اللہ عنہ شدید بیمار ہو گئے۔ جس کی وجہ سے آپ کے نیچے ایک تھال رکھا جاتا اور دوسرا اٹھالیا جاتا اور یہ سلسلہ چالیس روز تک جاری رہا۔[3] مگر اس روایت کی سند صحیح نہیں ہے۔[4] بعض مورخین اور رواۃ نے سر توڑ کوشش کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یزید کی بیعت اور حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت کے درمیان تعلق پیدا کیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ یزید بن معاویہ نے جعدہ بنت قیس کی طرف پیغام بھیجا کہ اگر تو حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دے دے تو میں تجھ سے شادی کر لوں گا، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ ان کی وفات کے بعد جعدہ نے یزید سے ایفاء عہد کی درخواست کی تو اس نے کہا: ہم نے تجھے حسن رضی اللہ عنہ کے لیے پسند نہیں کیا تھا تو کیا اب اپنے لیے کر لیں؟[5] اس روایت کی سند میں ایک راوی یزید بن عیاض بن جعدیہ ہے جسے مالک وغیرہ نے کذاب بتایا ہے۔[6] اس قسم کی روایات بلا تحقیق اہل سنت کی کتابوں میں داخل ہو گئیں۔ جبکہ ان روایات کی اسانید ضعیف ہیں۔[7]

۱۔ ابن العربی رقمطراز ہیں: "یزید کی طرف سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دینے کی سازش تیار کرنا دو طرح سے محال ہے، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یزید کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے کہ وہ خلافت سے دست بردار ہو چکے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ایک غیبی امر ہے جسے اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، تم بغیر کسی معتبر دلیل کے یہ الزام کسی معین شخص پر کس طرح عائد کر سکتے ہو جبکہ اس پر ایک طویل عرصہ بھی بیت چکا ہو اور ہم کسی نقل کی توثیق بھی نہ کر سکتے ہوں، پھر وہ دور بھی خواہش پرستی کا ہو، حالات فتنہ و عصبیت کے ہوں اور ہر کوئی دوسرے کی طرف ناروا باتیں منسوب کر رہا ہو، ایسے حالات میں تو صرف صاف بات ہی تسلیم کی جا سکتی ہے اور صرف عدل و انصاف پر مبنی بات ہی سنی جا سکتی ہے۔"[8]

۲۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض لوگ ذکر کرتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دیا تھا۔ مگر یہ الزام کسی شرعی دلیل معتبر قول یا قابل اعتماد نقل سے ثابت نہیں ہوتا اور یہ ایسی صورت حال ہے کہ جس سے علم کا حصول ممکن نہیں ہوتا، اس بنا پر یہ بات کرنا بدون علم بات کرنا ہے۔[1] بعض لوگوں کی طرف سے معاویہ رضی اللہ عنہ پر حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دینے کی تہمت لگائی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اشعث بن قیس کو یہ مجرمانہ فعل سر انجام دینے کا حکم دیا تھا اور یہ وہ شخص ہے جس کی بیٹی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھی۔ اس اتہام کی تردید کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر یہ کہا جائے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کے باپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا تھا تو یہ محض گمان ہے اور گمان کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: گمان سے بچو اس لیے کہ بعض گمان سب سے بڑا جھوٹ ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جعدہ کا باپ اشعث بن قیس ۴۰ھ یا ۴۱ھ کو فوت ہو گیا تھا یہی وجہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن

رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والی صلح میں اس کا کہیں نام نہیں آتا، اگر وہ موجود ہوتا تو اس کا ذکر ضرور ہوتا، جب وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے دس سال قبل فوت ہو گیا تھا تو اس نے اپنی بیٹی کو ایسا کرنے کا حکم کس طرح دیا؟[2] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہ تبصرہ تاریخی روایات پر ان کی ماہرانہ علمی تنقید پر قدرت کی دلیل ہے۔

۳۔ امام ذہبی فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے آخر اس کی اطلاع کیسے ہوئی؟''[3]

۴۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''بعض لوگ روایت کرتے ہیں کہ یزید بن معاویہ نے جعدہ بنت اشعث کی طرف پیغام بھیجا کہ اگر تو حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دے دے تو میں ان کے بعد تجھ سے شادی کر لوں گا، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، پھر جب ان کی وفات ہو گئی تو اس نے یزید کو اس کا وعدہ یاد دلایا تو اس نے جواب دیا: اللہ کی قسم! ہم تو تجھے حسن رضی اللہ عنہ کے لیے پسند نہیں کرتے تھے کیا اب ہم تجھے اپنے لیے پسند کر لیں؟ جبکہ میرے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے، اور اس کے باپ معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس کی عدم صحت بطریق اولیٰ اور زیادہ موزوں ہے۔''[4]

۵۔ ابن خلدون فرماتے ہیں: اور یہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن کی بیوی جعدہ بنت اشعث کے ذریعے انہیں زہر دینے کی سازش کی، تو یہ روافض کی اختراع ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا اس سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔[5]

۶۔ ڈاکٹر جمیل مصری اس قضیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ یا یزید کی طرف سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دینے کے قضیہ کے بارے میں بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اسے اس وقت شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی، اس لیے کہ اس کا نہ تو کوئی حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے نوٹس لیا اور نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ہی معاویہ رضی اللہ عنہ پر کوئی عتاب کیا۔[6] جہاں تک حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دیئے جانے کا تعلق ہے تو ہم اس سے انکار نہیں کرتے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ زہر کی وجہ سے فوت ہوئے تھے تو یہ ان کے لیے شہادت اور باعث عزت و کرامت ہے۔[1] مگر اس کی معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے بیٹے یزید پر تہمت لگانا نہ تو سند کے اعتبار سے ثابت ہے اور نہ متن کے اعتبار سے۔ جیسا کہ روایات میں وارد ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیوی جعدہ بنت اشعث کو عزو شرف یا مال وزر کی کوئی ضرورت تھی تا کہ وہ یہ سب کچھ یزید سے حاصل کر سکے اور پھر اس کی بیوی بن جائے۔ کیا جعدہ کے لیے یہ بات کافی نہیں تھی کہ اس کا باپ اشعث بن قیس کندہ قبیلے کا سردار ہے؟ پھر کیا حسن بن علی رضی اللہ عنہما عزت و شرف اور مقام و مرتبہ میں سب لوگوں سے بڑھ کر نہیں تھے؟ ان کی ماں فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھیں جبکہ نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جس سے بڑھ کر کوئی بھی چیز قابل فخر نہیں ہے۔ ان کے باپ علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ تھے جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے ایک اور چوتھے خلیفہ راشد تھے۔ آخر وہ کون سی چیز تھی جس کے حصول کے لیے جعدہ نے اس قدر سنگین واردات کا ارتکاب کر ڈالا؟[2] میں کہتا ہوں کہ اس وقت بکثرت ایسے لوگ موجود تھے جو وحدت اسلامیہ کے دشمن تھے اور جن کے غیظ و غضب میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری کی وجہ سے کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا اور جو شدت کے ساتھ اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا وجود مسعود امت اسلامیہ کے امن و استقرار کی ضمانت ہے اور یہ کہ وہ غیر متنازعہ طور سے اس کی الفت و یگانگت کے امام اور اس کی وحدت کے زعیم و قائد ہیں، لہٰذا امت کو دوبارہ اضطرابی کیفیت سے دوچار کرنے اور اس میں دوبارہ فتنہ برپا کرنے کے لیے انہیں راستے سے ہٹانا اور

ان کا صفایا کرنا ضروری ہے۔ میری نظر میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دینے کا الزام سب سے پہلے ابن سبا کے پیروکاروں پر عائد ہوتا ہے جن کے تمام مذموم مقاصد کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں ان کی دست برداری سے شدید نقصان پہنچا تھا اور پھر اس کی تہمت ان خوارج کے سر آتی ہے جنہوں نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور حسن رضی اللہ عنہ کی ران میں نیزہ مارا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جنگ نہروان اور دوسرے معرکوں میں اپنے مقتولین کا انتقام لینے کے لیے اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہو۔[3]

سادساً:... قاتلین عثمان کے بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ اہل مدینہ، اہل حجاز اور اہل عراق سے کسی بھی شخص سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کریں گے،[4] لہٰذا انہوں نے اسی وقت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ ترک کر دیا۔[5] اسی طرح اس بات پر بھی اتفاق ہوا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت میں جو کچھ بھی ہوا اس کا کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ اصول بڑی اہمیت کا حامل تھا جس کا مقصد ماضی کو بھلا کر تاریخ کا نیا باب رقم کرتے ہوئے حاضر اور مستقبل پر ارتکاز کرنا تھا۔[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ صلح کا یہ معاہدہ فریقین کے تمام لوگوں کے لیے عام معافی کی بنیاد پر ہوا، اور پھر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کی مکمل پاس داری کی اور عملاً کسی کو بھی اس کے کسی گزشتہ گناہ کی سزا نہ دی۔ بڑی حد تک ان کے دور حکومت میں ہر طرف امن کا دور دورہ رہا اور خون محفوظ رہے۔[2] ابن قتیبہ کی عیون الاخبار میں وارد ہے کہ جب معاویہ رضی اللہ عنہ صلح و اتفاق کے سال مدینہ منورہ آئے تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے جنہیں دیکھ کر عائشہ بنت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے والد کو آوازیں دیتے ہوئے رونے لگی۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میری بھتیجی! لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے اور ہم نے انہیں امان دے دی ہے۔ ہم نے ان کے سامنے حلم و بردباری کا اظہار کیا جس کے نیچے قہر و غضب ہے اور انہوں نے ہمارے سامنے تابعداری کا اظہار کیا۔ جس کے نیچے کینہ و بغض ہے۔ ہر انسان کے پاس تلوار ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کی جگہ دیکھ رہا ہے۔ اگر ہم ان سے عہد شکنی کریں گے تو یقیناوہ بھی ایسا ہی کریں گے اور ہم نہیں جانتے کہ ایسا کرنا ہمارے خلاف جائے گا یا ہمارے حق میں رہے گا۔ تیرے لیے امیر المومنین کے چچا کی بیٹی بننا عام عورت بننے سے بہتر ہے۔[3] ابن قتیبہ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والی اس صلح کے نتیجے میں جنگ ختم اور خون ریزی بند ہو گئی تھی۔ لوگ پر امن اور پر سکون ماحول میں زندگی گزارنے لگے۔ علاوہ ازیں جنگ جمل، صفین، نہروان اور مصر کی جنگوں نے ان لوگوں کو ختم کر دیا تھا جن کے نام قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی فہرست میں آتے تھے مگر یہ بات یاد رہے کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا مسئلہ اغلباً بنو امیہ کے خلفاء اور ان کے نائبین کے ذہنوں میں موجود رہا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرف دار رہے۔[4]

سابعاً:... حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کا قتل

زیادہ تر مصادر حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، ان میں سے مندرجہ ذیل مصادر سر فہرست ہیں: ابن سعد[5]، خلیفہ بن خیاط[6]، بلاذری[7]، یعقوبی[8]، مسعودی[9]، ابو الفرج الاصفہانی[10]، ابن جوزی[11]، ابن الاثیر[12]، الذہبی[13] اور ابن کثیر

[14]۔ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کی خبر میں طبری مشہور رافضی مورخ ابو مخنف پر اعتماد کرتے ہیں، جو کہ اہل سنت علماء کے نزدیک غیر ثقہ اور ناقابل اعتماد ہے۔ طبری نے اس سے سولہ روایات نقل کی ہیں۔ عمومی طور سے حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر متعدد مصادر میں وارد ہوئی ہے اور اس پر شیعی روایات کی اجارہ داری نہیں ہے۔ لیکن علماء جرح و تعدیل کے نزدیک ساقط الاعتبار ابو مخنف کی روایت اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کرنے اور انہیں سب و شتم کرنے کی وصیت کی، ان کی اس وصیت پر عمل کرتے ہوئے مغیرہ رضی اللہ عنہ کوفہ پر اپنی ولایت کے سارے عرصہ میں خطبہ کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کرتے رہے۔ ان کے جس خطبہ نے حجر بن عدی کو غضب ناک کر دیا وہ ابو مخنف کی وارد کردہ روایت کی رو سے حسب ذیل ہے: یا اللہ! عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر رحم فرما، ان سے درگزر فرما اور ان کے اچھے اعمال کا انہیں صلہ عطا فرما۔ وہ تیری کتاب پر عمل کرتے رہے، تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرتے رہے، انہوں نے ہمیں متحد کیا اور ہمارے خون کو محفوظ بنایا اور انہیں مظلوم قتل کیا گیا۔ یا اللہ! ان کے انصار و معاونین، ان کے دوستوں اور ان سے محبت کرنے والوں اور ان کے خون کا مطالبہ کرنے والوں پر رحم فرما۔ اس دوران وہ ان کے قاتلوں کے لیے بد دعا کیا کرتے تھے۔[1]

جس طرح کہ خطبہ کی نص سے واضح ہے اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت میں ایک لفظ بھی وارد نہیں ہے، الا یہ کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کی یہ تاویل کی جائے کہ یہ ان کی مذمت سے عبارت ہے۔[2] جبکہ قریب و بعید کا ہر شخص اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس کا میں نے عثمان و علی اور حسن رضی اللہ عنہم پر مشتمل اپنی کتابوں میں اثبات کیا ہے۔ صورت حال جو بھی ہو حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کی تحقیق کرنے والا اس بات کو ملاحظہ کرے گا کہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کا موقف دو مراحل سے گزرا:

پہلا مرحلہ:... قومی معارضہ (۵۰-۴۱ھ):

ابو عبد الرحمن، حجر بن عدی کندی شرف صحابیت سے مشرف ہیں، آپ اپنے بھائی ہانی بن ادبر کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہیں کی۔ انہوں نے علی رضی اللہ عنہ اور عمار رضی اللہ عنہ سے سماعت کی۔[3] آپ شریف اور اپنی قوم کے مطاع امیر تھے۔ ان کا شمار علی رضی اللہ عنہ میں ہوتا ہے۔ امیر لشکر کی صورت میں جنگ صفین میں شامل ہوئے۔ آپ بڑے نیک اور عبادت گزار تھے۔[4] عدی بن حجر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صلح کے مخالف تھے۔ یہ مخالف ضرور تھے، مگر یہ مخالفت صرف اقوال تک محدود رہی اور اس دوران عملاً کوئی کارروائی نظر نہیں آتی۔[5] اس بارے میں بلاذری رقمطراز ہیں:

حجر بن عدی رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح پر معترض رہے، وہ اس بارے میں انہیں ملامت کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: تم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ترک قتال کیا حالانکہ تمہارے ساتھ تمہارے دشمن سے جنگ کرنے کے لیے چالیس ہزار مخلص اور تجربہ کار جنگجو موجود تھے، پھر وہ معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتے ہوئے انہیں ظالم قرار دیا کرتے اور وہ ہمیشہ یہی کچھ کرتے رہے۔

دوسرا مرحلہ:... فعلی معارضہ:

اس مرحلہ کا آغاز ۵۱ھ سے ہوا، اس سال ان کے اور والی عراق زیاد بن ابیہ کے تعلقات اچانک کشیدہ ہو گئے جس کے دو اسباب بتائے جاتے ہیں:

۱۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعریف و توصیف کرتے اور ان کے لیے رحمت ایزدی کی دعائیں کرتے جبکہ علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کی مذمت کیا کرتے، اس کے برعکس حجر بن عدی رضی اللہ عنہ علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کی مدح و ستائش کرتے اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی مذمت کرتے، جس پر مغیرہ، حجر بن عدی کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے، پھر جب مغیرہ فوت ہو گئے اور زیاد بن ابیہ نے ولایت سنبھالی تو وہ بھی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چل نکلے۔ ادھر سے جو حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اٹھے اور انہوں نے بھی ان دونوں کے بارے میں مغیرہ رضی اللہ عنہ کی روش اپنائی جس سے حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور زیاد کے درمیان ٹکراؤ کا آغاز ہوا۔[1]

۲۔ زیاد بن ابیہ طویل خطبہ دیتا اور نماز تاخیر سے پڑھاتا جبکہ حجر اس لیے زیاد کو ہدف تنقید بناتے، جس کی وجہ سے بھی ان دونوں میں ٹکراؤ کا آغاز ہوا۔[2] مگر ان اسباب کو مندرجہ ذیل امور مکدر کرتے ہیں: اہل کوفہ کے ساتھ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی سیاست عفو و کرم اور درگزر پر مبنی تھی نہ کہ دشمنی اور کینہ ابھارنے پر، اس کی دلیل بخاری میں مروی جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اپنی وفات کے دن کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا: "اللہ وحدہ لا شریک لہ سے تقویٰ اختیار کرو۔ وقار اور سکینت اپنائے رکھو یہاں تک کہ امیر یہاں پہنچ جائے جو کہ ابھی آنے ہی والے ہیں۔" پھر فرمایا: اپنے موجودہ امیر کے لیے بخشش کی دعا کرو، وہ عفو و درگزر کو پسند کیا کرتے تھے۔[3] پھر فرمایا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: میں اسلام پر آپ سے بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر یہ شرط عائد کی کہ میں ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا۔ میں نے اس شرط پر آپ سے بیعت کر لی۔ اس مسجد کے رب کی قسم! یقینا میں تمہارا خیر خواہ ہوں، پھر انہوں نے استغفار کیا اور منبر سے نیچے اتر آئے۔[4]

۱۔ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کے بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ:

جب حجر اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے زیاد بن ابیہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ ان کا قضیہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اس بارے میں خود فیصلہ کریں اور ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔[4] حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کا ذکر کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر عائد کردہ الزامات کا ذکر کر دیا جائے۔ ان الزامات کی تفصیل ابو مخنف کی روایت میں اس طرح وارد ہے: حجر رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف کئی گروہوں کو منظم کیا، امیر المومنین کے خلاف جنگ کرنے کے لیے لوگوں کو اکسایا اور خلیفہ کو سر عام سب و شتم کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ منصب خلافت کے لیے صرف آل ابو طالب ہی موزوں ہیں۔ مصر پر حملہ آور ہو کر امیر المومنین کے عامل کو شہر سے نکال دیا، علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کا عذر ظاہر کیا، ان کے لیے رحمت ایزدی کی دعا کی، اپنے

دشمنوں اور اپنے اہل حرب سے لاتعلقی اظہار کیا، لوگوں کو بتایا کہ جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ ان کے ساتھیوں کے سرکردہ لوگ ہیں، وہ میرے جیسی رائے کے حامل اور میرے حکم کے پابند ہیں۔[1] جب ان لوگوں کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے انہیں فوراً قتل نہیں کروایا تھا اور نہ ہی ان سے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لاتعلقی اختیار کرنے کا مطالبہ کیا تھا جیسا کہ بعض روایات کا دعویٰ ہے۔[2] بلکہ اس کے لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا۔ اپنے اہلِ مشورہ سے مشاورت کی اور پھر ان کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ ان میں سے بعض کو قتل کر دیا جائے جبکہ بعض دوسروں کو زندہ چھوڑ دیا جائے۔ اس کی دلیل شر حبیل بن مسلم کی یہ روایت ہے کہ جب حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کو عراق سے لا کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے انہیں قتل کرنے کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کیا، اس پر بعض لوگوں نے تو اپنی رائے کا اظہار کیا جبکہ کچھ خاموش رہے، جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ظہر کی نماز ادا کر لی تو خطبہ دینے کے لیے لوگوں میں کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد منبر پر بیٹھے تو اعلان کرنے والے نے اعلان کیا: عمرو بن اسود عنسی کہاں ہیں؟[3] وہ اٹھے اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا: ہم اللہ کی طرف سے جس مضبوط قلعہ میں محفوظ ہیں ہمیں اسے ترک کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اہل عراق کے بارے میں آپ کا فیصلہ ہی معتبر ہو گا، اس لیے کہ آپ راعی ہیں اور ہم رعیت، ان کی بیماری کے بارے میں آپ ہم سے زیادہ آگاہ ہیں اور آپ ہی ان کا بہتر علاج کر سکتے ہیں، ہم تو صرف یہی کہنے کے پابند ہیں: ﴿سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ۝﴾ (البقرۃ: ۲۸۵) "ہم نے سن لیا اور مان لیا، ہمارے پروردگار! تیری معافی مقصود ہے اور تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔" پھر اعلان کیا گیا کہ ابو مسلم خولانی کہاں ہیں؟ وہ اٹھے اور حمد ثنا کے بعد کہنے لگے: امیر المومنین! جب سے ہم نے تم سے پیار کیا ہے تم سے بغض نہیں رکھا، نہ تمہاری اطاعت قبول کرنے کے بعد تمہاری نافرمانی کی ہے۔ تمہارے ساتھ اکٹھے ہونے کے بعد تم سے جدا نہیں ہوئے اور تم سے بیعت کرنے کے بعد اسے توڑا نہیں۔ اگر تم حکم دو گے تو ہم تمہاری اطاعت کریں گے، اگر ہمیں بلاؤ گے تو تمہاری دعوت پر لبیک کہیں گے۔ پھر عبد اللہ بن مخمر شرعبی اٹھے اور اللہ کی حمد و ثنا کرنے کے بعد فرمانے لگے: امیر المومنین! اگر تم اس عراقی گروہ کو سزا دو گے تو درست کرو گے اور اگر معاف کر دو گے تو احسان کرو گے، اس کے بعد عبد اللہ بن اسھر ی کو آواز دی گئی تو انہوں نے اللہ کی حمد و ثنا کرنے کے بعد فرمایا: امیر المومنین! ہم تمہاری رعیت اور تمہارے اطاعت گزار ہیں۔ اگر آپ انہیں سزا دیں گے تو یہ اس کے سزاوار ہیں اور اگر معاف کر دیں گے تو معاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے۔ ہمارے بارے میں کسی ایسے ظالم کی بات نہ ماننا جو رات بھر سویا رہتا ہے اور آخرت کے علم سے اکتایا رہتا ہے۔[4] میں نے شر حبیل سے پوچھا: [5] ان لوگوں کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کیا سلوک کیا؟ اس نے کہا: بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو زندہ رکھا۔ مقتولین میں حجر بن عدی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔[1] حجر رضی اللہ عنہ نے قتل ہونے سے قبل دو رکعت نماز ادا کرنے کی درخواست کی تو انہیں چھوڑ دیا گیا۔ انہوں نے وضو کیا پھر دو رکعت نماز ادا کی اور اسے لمبا کیا۔ ان سے پوچھا گیا: بڑی لمبی نماز پڑھی ہے کیا پریشان ہو گئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: میں نے اس سے ہلکی نماز کبھی نہیں پڑھی اور اگر میں گھبرا بھی گیا ہوں تو اپنی آنکھوں سے سونتی ہوئی تلوار، کھلا کفن اور کھودی گئی قبر دیکھ رہا ہوں۔ مقتولین کے ورثاء ان کے لیے کفن لے کر آئے، ان کی قبریں تیار کیں اور انہیں دفنا دیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب حجر رضی اللہ عنہ کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تو انہوں نے امیر المومنین کہہ کر انہیں سلام کہا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: کیا میں امیر المومنین ہوں؟ ان کی گردن اڑا دو، انہوں نے دو رکعت نماز پڑھی اور اپنے گھر والوں سے فرمایا: میری بیڑیاں نہ کھولنا، میرے جسم سے خون صاف نہ کرنا اس لیے کہ میں معاویہ کو راستے پر ملنے والا ہوں۔[2]

ابن العربی حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کے ضمن میں رقمطراز ہیں: ... انہوں نے فتنہ کھڑا کرنے کے لیے لوگوں کو اکسایا جس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں ان لوگوں میں شمار کیا جو زمین میں فساد برپا کرنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ نے حجر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ فیصلہ کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر اعتماد کیا: "جب تم لوگ کسی ایک آدمی پر متفق ہو اور اس دوران تمہاری جمعیت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کوئی شخص تمہارے پاس آئے تو اسے قتل کر دو۔"[4] آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے: "کچھ سنگین قسم کے واقعات سامنے آئیں گے، جو شخص میری امت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہے وہ جو کوئی بھی ہو اس کی تلوار سے گردن اڑا دو۔"[5] اس جگہ یہ امر پیش نظر رہے کہ اگر حجر بن عدی رضی اللہ عنہ قومی معارضہ تک محدود رہتے تو معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے قتل کا فیصلہ نہ کرتے۔ اس پر مسور بن مخرمہ و دیگر کے گزشتہ واقعات دلالت کرتے ہیں۔[6]

۲۔ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف:

حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے موقف کے بارے میں وارد روایات مبالغہ آمیزی پر مبنی ہیں۔ بعض روایات بتاتی ہیں کہ جب ۵۱ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کے لیے گئے تو انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو سرزنش کی۔ اسی طرح ان کی طرف سے معاویہ رضی اللہ عنہ کو جنگ کی دھمکی کی روایت بھی مبالغہ پر مبنی ہے۔[7] ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے یہ روایات صحیح نہیں ہیں۔ ان کے حقیقی موقف کی عکاسی ابن ابی ملیکہ کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کی اجازت لینے کے لیے آئے تو انہوں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ذکوان نامی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا غلام باہر آیا تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مجھ سے ناراض ہیں مجھے ان کے پاس پہنچا۔ ذکوان نے اس کے لیے ان سے اصرار کیا تو انہوں نے اس کی اجازت دے دی۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہنے لگے: امی جان! اللہ تم پر رحم فرمائے، آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟ انہوں نے فرمایا: اس لیے کہ تم نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کروا ڈالا۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ... جہاں تک حجر اور ان کے ساتھیوں کا تعلق ہے تو مجھے ایک ایسے فتنہ کا خوف دامن گیر ہوا جس میں خون بہائے جاتے اور حرمتیں پامال کی جاتیں۔ آپ اس بات کو جانے دیں اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: واللہ! میں نے تجھے چھوڑا۔ واللہ! میں نے تجھے چھوڑا، واللہ! میں نے تجھے چھوڑا۔[1] دوسری روایت میں ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: کیا تم نے حجر کو قتل کر دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ام المومنین! میں نے لوگوں کی بہتری کے لیے ایک آدمی کے قتل کو ان میں فساد برپا کرنے کے لیے باقی چھوڑنے سے بہتر سمجھا۔[2]

۳۔ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل پر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ندامت:

مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبد الرحمن بن حارث بن ہشام کو حجر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں بات کرنے کے لیے معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ جب عبد الرحمن ان کے پاس پہنچے تو وہ انہیں قتل کر چکے تھے، اس پر عبد الرحمن نے ان سے کہا: تم سے ابو سفیان کا حلم و

حوصلہ کہاں غائب ہو گیا؟ انہوں نے جواب دیا: وہ اس وقت سے غائب ہوا جب سے میری قوم میں سے تم جیسے حلیم الطبع لوگ غائب ہو گئے۔[3] اس روایت کے تحت امام ذہبی فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ حجر رضی اللہ عنہ کے قتل پر نادم ہوئے۔[4] اگرچہ حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے کئی جواز بتائے جاتے اور اس کے لیے کئی عذر پیش کیے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی غلطی تھی۔ انہیں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک صحابی کے لیے وسیع ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ اس غلطی کا انہیں بعد میں شدید احساس ہوا اور وہ اس پر زندگی بھر ندامت کا اظہار کرتے رہے۔[5] مروی ہے کہ انہوں نے اپنی موت کے وقت کہا: ابن ادبر (حجر بن عدی رضی اللہ عنہ) کے حوالے سے میرا دن بڑا طویل ہو گا۔[6]

۴۔ مالک بن ہبیرہ کا موقف:

معاویہ رضی اللہ عنہ نے حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مالک بن ہبیرہ سکونی رضی اللہ عنہ کی سفارش بھی قبول نہیں کی تھی۔ مالک اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لے کر انہیں اور ان کے ساتھیوں کو رہائی دلانے کے لیے روانہ ہوئے تو ان کی حجر رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے ملاقات ہو گئی۔ مالک رضی اللہ عنہ نے ان سے اس بارے میں پوچھا، تو انہوں نے بتایا کہ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ پھر اس خبر کی ان کے باپ عدی سے بھی تصدیق ہو گئی۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی آمد سے مطلع کیا گیا تو انہوں نے کہا: یہ ایک تپش ہے جو وہ اپنے جی میں پاتے ہیں اور گویا کہ میں اسے ٹھنڈا کر چکا ہوں، پھر انہوں نے مالک کے پاس ایک لاکھ درہم بھجوائے اور ساتھ ہی یہ پیغام بھیجا کہ مجھے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ حجر لوگوں کو دوبارہ جنگ میں جھونک دیں گے جس کی وجہ سے مسلمانوں پر ان کے قتل سے بھی بھاری مصیبت ٹوٹتی، جس سے وہ مطمئن ہو گئے۔[1] مالک بن ہبیرہ سکونی رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے جنہیں معاویہ رضی اللہ عنہ نے حمص کا والی مقرر کیا تھا۔ آپ مالک کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں نے مالک بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی کو مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں دیکھا۔[2] حجر بن عدی اور ان کے رفقاء کے قضیہ کے علاوہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ اپنی پر امن حکمت عملی کی نگہداشت کی جو کہ رعایا کے حوالے سے حلم و حوصلہ اور وسیع ظرفی پر مبنی تھی۔ وہ اپنی اس حکمت عملی کا چند جملوں میں اس طرح اظہار کرتے ہیں: جس جگہ کوڑا کافی ہو میں وہاں تلوار استعمال نہیں کرتا، اور جہاں میری زبان کام دے جائے میں وہاں کوڑا استعمال نہیں کرتا۔ اگر میرے اور لوگوں کے درمیان تعلقات کا ایک بال بھی باقی رہ جائے تو وہ ٹوٹ نہیں پائے گا، اگر وہ اسے کھینچیں گے تو میں اسے ڈھیلا کر دوں گا اور جب وہ اسے ڈھیلا کریں گے تو میں اسے کھینچ لوں گا۔[3]

یہ ایک حکیمانہ اور دانش مندانہ سیاست ہے جس میں حدود کے اندر رہ کر بات کرنے کی کھلی آزادی ہوتی ہے۔ جب زبان کی جگہ مال کفایت کرتا تو معاویہ رضی اللہ عنہ اس پر اعتماد کرتے۔ جس جگہ زبان سے کام نکلتا وہ اس جگہ کوڑا استعمال نہ کرتے اور جہاں کوڑا کام نکال سکتا وہاں تلوار استعمال نہ کرتے۔[4]

ایک دفعہ زیاد کا آزاد کردہ غلام سلیم معاویہ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں زیاد پر فخر کرنے لگا تو انہوں نے فرمایا: خاموش ہو جا تیرا مرحب (زیاد) تلوار سے بھی وہ چیز حاصل نہیں کر سکتا جس سے کہیں زیادہ میں زبان سے حاصل کر لیتا ہوں۔[5]

دوسری بحث:

معاویہ رضی اللہ عنہ کا امور مملکت کی براہ راست نگرانی کرنا اور استحکام امن کے لیے کوشاں رہنا

اولاً:... معاویہ رضی اللہ عنہ کا امور مملکت کی براہ راست نگرانی کرنا

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی داخلی سیاست جن بنیادوں پر قائم تھی ان میں ایک یہ تھی کہ آپ مختلف امور مملکت کی بنفس نفیس نگرانی کیا کرتے اور مملکت میں رونما ہونے والی ہر چھوٹی بڑی بات سے آگاہ رہتے تھے۔ اگرچہ انہیں اس زمانے کے بڑے بڑے ماہرین کا تعاون حاصل تھا مگر وہ ان پر انحصار نہیں کرتے تھے، بلکہ انہوں نے اپنا سارا وقت اور تمام صلاحیتیں مسلمانوں کی مصالح کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔[1]

ا۔ روزانہ مجلس:

معاویہ رضی اللہ عنہ ہر روز پانچ دفعہ منظر عام پر آتے صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد قصہ گو لوگوں کے پاس بیٹھتے ان سے فارغ ہو کر اندر جاتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے، پھر گھر جاتے، امر و نہی کا فریضہ سر انجام دیتے، پھر چار رکعت نماز ادا کرتے اور اس کے بعد اپنی مجلس میں تشریف لے آتے۔ اپنے مقربین کو اپنے پاس بلاتے اور ان سے ضروری بات چیت کرتے، اس دوران ان کے وزراء ان سے ملاقات کے لیے آتے اور دن بھر کے معاملات کے بارے میں ان سے گفتگو کرتے، پھر ناشتہ کرتے اور بعد ازاں دیر تک بات چیت کا سلسلہ جاری رکھتے، پھر جب چاہتے گھر جاتے اور جب باہر آتے تو اپنے غلام کو کرسی لانے کا حکم دیتے اور مقصورہ کی طرف کمر کر کے بیٹھ جاتے ان کے پہرے دار اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاتے، ضرورت مند عورتیں، بچے، بوڑھے اور اعرابی آپ کے سامنے پیش ہو کر اپنے اپنے مسائل اور مشکلات بیان کرتے اور آپ ان کی دادرسی کے لیے الگ الگ احکام جاری کرتے، جب تمام سائلین واپس چلے جاتے تو بااثر لوگوں کو ملاقات کے لیے بلاتے، وہ انہیں سلام کہتے ہوئے اندر آتے اور آپ ان کے سلام کا جواب دیتے، پھر جب وہ مجلس میں بیٹھ جاتے تو فرماتے: تمہیں شرفاء اس لیے کہا جاتا ہے کہ تم لوگوں کو دوسروں سے ہٹ کر اس مجلس میں شرکت کا شرف بخشا گیا ہے، جو لوگ ہم تک نہیں پہنچ سکتے ان کے مسائل سے ہمیں آگاہ کیا کرو، اس پر ایک آدمی اٹھ کر کہتا کہ فلاں شخص شہید ہو گیا ہے۔ آپ فرماتے کہ اس کے بچوں کا وظیفہ مقرر کر دو۔ دوسرا بتاتا کہ فلاں شخص اپنے اہل و عیال سے بہت دور ہے۔ آپ فرماتے ان کی ضروریات پوری کرو اور ان کی خدمت کرو... پھر کھانا لایا جاتا اور ادھر سے ان کا کاتب بھی آ جاتا، لوگ آتے جاتے، کھانا تناول کرتے اور امیر المومنین کے سامنے اپنی اپنی درخواستیں پیش کرتے، کاتب انہیں پڑھتا اور معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی دادرسی کے لیے موقع پر احکام جاری کرتے جاتے یہاں تک کہ وہ سب لوگوں سے فارغ ہو جاتے، اس دوران کئی کئی لوگ آپ کے دستر خوان سے سیر شکم ہو کر کھانا کھاتے اور پھر واپس لوٹ جاتے۔ پھر آپ گھر تشریف لے جاتے، ظہر کی اذان ہونے پر باہر آتے، نماز ادا کرتے اور پھر خاص الخاص لوگوں کو ملاقات کی اجازت دیتے اور موسم کے مطابق ماکولات و مشروبات سے ان کی تواضع کرتے، اس دوران وزراء بھی ملاقات کرتے اور باقی ماندہ دن کی ضروریات کے لیے ان سے مشاورت کرتے اور یہ سلسلہ نماز عصر تک جاری رہتا، عصر کی نماز کے بعد گھر تشریف لے جاتے، غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے باہر آتے، پھر اپنے تخت پر بیٹھ جاتے اور لوگوں کو ان کے

مراتب کے مطابق ملاقات کی اجازت دیتے۔ پھر رات کا کھانا لایا جاتا جس سے نماز مغرب تک فارغ ہو جاتے۔ پھر نماز مغرب ادا کرنے کے بعد چار رکعت نوافل ادا کرتے جن میں سے ہر رکعت میں پچاس آیات کی تلاوت کرتے، پھر گھر تشریف لے جاتے یہاں تک کہ عشاء کی اذان دی جاتی۔ اذان کے بعد باہر آتے، نماز عشاء ادا کرتے اور پھر اپنے مقربین، وزراء اور حاشیہ برداروں سے ملاقات کی غرض سے بیٹھ جاتے۔ وزراء آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آغاز شب کے ضروری امور کے لیے آپ سے مشورہ کرتے۔ آپ ایک تہائی رات تک عرب و عجم کے اخبار و ایام، ان کے حالات و واقعات، ان کے بادشاہوں، ان کی سیاست، مختلف اقوام کے عادات و اطوار، رعایا کے بارے میں ان کی سیاسی حکمت عملی اور ان کی جنگوں کے بارے گفتگو کرتے، پھر ان کے اہل خانہ کی طرف سے ان کے پاس حلوہ وغیرہ پر مشتمل ہلکے پھلکے کھانے بھجوائے جاتے اور پھر سونے کے لیے گھر تشریف لے جاتے۔ رات کے دوسرے ثلث تک نیند لیتے اور پھر رات کے آخری ثلث میں مختلف بادشاہوں کی سیرت و کردار، ان کی جنگوں اور ان کی قومی اور ملکی خدمات و سیاست پر مشتمل کتابیں انہیں پڑھ کر سنائی جاتیں۔ انہوں نے اس کے لیے کچھ غلاموں کا تقرر کر رکھا تھا جو اس قسم کا مواد پڑھتے، اسے یاد کرتے اور پھر انہیں سنایا کرتے تھے، اس طرح ہر رات انہیں اخبار و سیر اور آثار امم پر مشتمل مواد سننے کو ملتا۔ صبح کی نماز کا وقت ہوتا تو نماز ادا کرتے اور پھر گزشتہ دن کی طرح یہ دن بھی گزار دیتے۔ اگرچہ ان کے بعد عبد الملک بن مروان وغیرہ نے ان کے اس طریقہ کار کی پیروی کی مگر وہ ان جیسے حلم و حوصلہ، اتقان سیاست اور معاملات تک رسائی جیسے اوصاف سے عاری تھے، وہ لوگوں کے حسب مراتب ان کی خاطر و مدارات کرنے اور شفقت و رحمت سے کام لینے کی خوبیوں سے بھی تہی دامن تھے۔[1]

[1] اشهب اللامعة فی السیاسة النافعة، ص: ۳۰۹. الشهب اللامعة، ص: ۳۱۰، ۳۱۱۔ مروج الذہب: ۳/۲۲۰، ۲۲۲

۲۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت مرکزی دواوین:

ا: دیوان رسائل:... یہ ادارہ خلیفہ کے خطوط، احکام، عہود، وصایا اور دیگر سرکاری دستاویزات کی نگرانی کا فریضہ سر انجام دیتا تھا جو اقالیم اسلامیہ میں ان کے ملازمین اور عہدے داروں اور ان بیرونی شہروں سے متعلق ہوتے جن کا مملکت اسلامیہ کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں دیوان رسائل کے مشہور نگرانوں اور کاتبوں میں عبد اللہ بن اوس غسانی اور زمل بن عمرو عذری کے نام سر فہرست ہیں۔ یہ دونوں کاتب یزید اوّل کی حکومت کے دوران بھی کتابت کا فریضہ سر انجام دیتے رہے۔[2] یہ دیوان امراء، فوجی کمانڈروں، قاضیوں اور ان قبائل کے زعماء سے رابطہ کا موثر ذریعہ تھا جو معاویہ رضی اللہ عنہ کے تابع تھے اور ان کی براہ راست نگرانی میں مختلف امور سر انجام دیا کرتے تھے۔

ثانیاً:... معاویہ کا اپنی خلافت کے ایام میں امن و امان کے استحکام پر حریص ہونا

معاویہ رضی اللہ عنہ کی داخلی سیاست کا اہم ترین اصول عالم اسلامی کے گوشے گوشے میں امن و امان کی صورت حال کو مستحکم کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے متعدد وسائل اختیار کیے جن کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے: ا۔ پہرے دار:... ظہورِ اسلام کے بعد معاویہ بن ابو سفیان

رضی اللہ عنہما نے سب سے پہلے ذاتی پہرے دار مقرر کیے جس سے مقصود زیادتی کی کوششوں سے بچنا تھا۔[5] اس تاریخی دور میں ان کے بعض شاہانہ مظاہر بھی اس کا جواز فراہم کرتے تھے۔ اس بارے میں ابن خلدون فرماتے ہیں: ریاست میں پہرے داری اور لوگوں سے پردے میں رہنے کی رسم کا آغاز ہوا، اس لیے کہ خلفاء کو خوارج وغیرہم کے اچانک حملوں کا خوف لاحق رہتا تھا۔ جیسا کہ عمر، علی، معاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم وغیرہم کے ساتھ ہوا، لہٰذا انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے کچھ لوگوں کا تقرر کیا اور انہیں حاجب کے نام سے موسوم کیا۔[6] پھر اسی مقصد کے تحت مقصورات بنانے، رات کے وقت حفاظتی ذمہ داریاں دینے والے چوکیدار بھرتی کرنے اور ایسی پولیس قائم کرنے کا حکم دیا جو نماز پڑھتے وقت ان کے پاس موجود رہے۔[7] مزید برآں چونکہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنو امیہ کے لوگ اپنے رومی دشمنوں سے قریب شام میں رہتے تھے، دوسری طرف ملک کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے روافض اور خوارج بھی ان کے دشمن تھے، لہٰذا جس دولت اسلامیہ کے تین خلفاء کو ان جیسے لوگوں کی وجہ سے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے اس میں امن وامان کی صورت حال کو قائم رکھنے کے لیے اس قسم کے حفاظتی انتظامات کی اشد ضرورت تھی۔[1]

مورخین نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے حاجب کی ذمہ داریاں ادا کرنے والے ان لوگوں کے نام گنوائے ہیں: سعد، ابو ایوب اور صفوان۔[2] حاجب کی تقرری کے لیے شرط یہ تھی کہ وہ لوگوں کے سماجی مقام ومرتبہ، ان کے خاندان اور طبقات سے بخوبی آگاہ ہو، تاکہ اسے معلوم ہو کہ اس نے کس آدمی کو ان سے ملاقات کی اجازت دینا ہے اور کسے نہیں، اس بات کی تائید بہت ساری روایات سے ہوتی ہے۔ جب شریک حارثی معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اس سے پوچھا: تو کون ہے؟ اس پر شریک کہنے لگا: امیر المومنین! میں نے آج سے پہلے آپ کو ایسا کرتے نہیں دیکھا، کیا آپ جیسا آدمی اپنی رعیت میں مجھ جیسے آدمی کے لیے اجنبیت کا اظہار کر سکتا ہے۔ یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تیری پہچان متفرق ہے۔ میں چہروں میں تیرے چہرے اور ناموں میں تیرے نام کو پہچانتا ہوں لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ کیا اس چہرے کا وہی نام ہے جو مجھے بتایا گیا ہے۔[3] جب کوئی شخص خلیفہ سے ملاقات کے لیے آتا تو حاجب خلیفہ کو اس کی آمد سے مطلع کرتا پھر خلیفہ خود فیصلہ کرتا کہ اسے ملاقات کی اجازت دینا ہے یا نہیں۔ ایک دن احنف بن قیس اور محمد بن اشعث معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لیے دروازے پر کھڑے تھے کہ آپ نے پہلے احنف کو اور پھر محمد بن اشعث کو ملاقات کی اجازت دی۔ مگر ابن الاشعث تیز تیز چلتے ہوئے احنف سے آگے نکل گیا اور اس سے پہلے اندر داخل ہو گیا، جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ صورت حال دیکھی تو پریشان سے ہو گئے، پھر احنف کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: واللہ! میں نے اسے تم سے پہلے ملاقات کی اجازت نہیں دی تھی، ہم تمہارے آداب کی پوری پوری رعایت رکھتے ہیں، یوں تیز چل کر آگے بڑھنے والا اپنے اندر موجود کسی نقص کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔[4] ۲۔ حراست:... معاویہ رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دولتِ اسلامیہ میں حراست وحفاظت کا بندوبست کیا اور ایسا خوارج کے خوف کی وجہ سے کیا گیا جو ان کے قتل کے درپے تھے، چنانچہ انہوں نے جامع مساجد میں مقصورات بنانے کا حکم دیا جن میں ان کے قابل اعتماد اور ان کے محافظ دستے کے لوگ ہی داخل ہو سکتے تھے۔[5] مقصورات کے قیام کا مقصد ان کے حفاظتی انتظامات کو مزید سخت بنانا تھا۔[6] تاریخی کتب میں عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں حفاظتی دستے کے سربراہوں کے نام بھی ذکر کیے گئے ہیں، اور وہ ہیں: مختار[1]، ابو المخارق[2] اور یزید بن حارث عبسی۔[3]

۳۔ پولیس:... اس کا مقصد اندرونِ ملک امن وامان قائم رکھنا، چوروں، جرائم پیشہ لوگوں اور فسادیوں کو گرفتار کرنا اور خلیفہ کا دفاع کرنا تھا، پولیس کسی بھی بیرونی حملے کو روکنے کی ذمہ دار نہیں تھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے پولیس کا ادارہ شام میں منظم کیا اور پھر اسے مزید ترقی بھی دی۔ مؤرخین نے

اس ادارے کے سربراہوں کے مندرجہ ذیل چار نام گنوائے ہیں: قیس بن ہمزہ ہمذانی، زمل بن عمرو عذری، ضحاک بن قیس فہری اور یزید بن حر عنسی۔[4] پولیس کا دائرہ کار صرف دارالخلافہ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اسے دوسری اسلامی ولایات میں بھی متعین کیا گیا تھا، صوبوں میں پولیس مقامی گورنروں کے ماتحت ہوتی تھی، پولیس اہل کاروں کے انتخاب اور تعین کے اختیارات بھی انہی کے پاس تھے۔ پولیس کا وجود حکومت اور معاشرہ دونوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا، حکومت سرکش لوگوں، شورشوں اور بے امنی کے ماحول کو ختم کرنے کے لیے پولیس پر ہی اعتماد کرتی اور اس کی ہی خدمات سے فائدہ اٹھایا کرتی تھی، پولیس معاشرے کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتی تھی اس لیے کہ امن واستقرار کا قیام اس کی اولیں ذمہ داری تھی اور لوگوں کے مال جان اور ان کے دیگر حقوق کے تحفظ کے حوالے سے ساری ذمہ داریاں اسی پر عائد ہوتی تھیں۔ اموی خلفاء پولیس کے سربراہوں کو بلاد شام کے داخل و خارج میں مختلف اعمال کی انجام دہی کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا کرتے تھے۔ مثلاً معاویہ رضی اللہ عنہ نے ضحاک بن قیس کو اس امر کے لیے پابند کیا تھا کہ وہ یزید کے لیے ان کی وصیت لوگوں تک پہنچائیں اور اس کے لیے بیعت لیں۔[5]

۴۔ اعوان و انصار اور رجال کا اچھا انتخاب:... معاویہ رضی اللہ عنہ کو ارباب دانش و بینش اور بارعب لوگوں میں قابل اعتماد اور انتظامی تجربہ رکھنے والے رجال کار کے انتخاب کی صلاحیتوں سے نوازا گیا تھا، ان میں سے چند نام بطور مثال مندرجہ ذیل ہیں: عمرو بن العاص سہمی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی، یزید بن حر عبسی، ضحاک بن قیس فہری، عبداللہ بن عامر بن کریز اور اہم جنگی قائدین میں سے مہلب بن ابو صفرہ، عقبہ بن نافع فہری، مالک بن ہبیرہ اور جنادہ بن امیہ ازدی جیسے لوگ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: میں اچانک پیش آمدہ امور کے لیے، معاویہ رضی اللہ عنہ بردباری اور حوصلہ کے لیے، مغیرہ پیچیدہ امور کے لیے اور زیاد چھوٹے بڑے امور کے لیے ہیں۔[6] مذکورہ صدر لوگوں نے اسلامی فتوحات، دولت اسلامیہ کے انتظامی امور اور اس کے دشمنوں کے تعاقب کے حوالے سے گرانقدر خدمات سرانجام دیں، ان لوگوں نے ملک میں امن و امان کے قیام و استحکام اور اموی خلافت کی پائیداری میں بڑا اہم اور ممتاز کردار ادا کیا تھا۔[1]

۵۔ لوگوں کے دل جیتنے اور اعوان و انصار کی وفاداریوں کو یقینی بنانے کے لیے مال وزر کا استعمال: ... معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار عرب کے بڑے سخی لوگوں میں ہوتا ہے، وہ مال وزر اور عطیات کے ذریعے لوگوں کے دل جیتنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، خاطر و مدارات میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، اگر انہیں کسی آدمی کی طرف سے کوئی غیر پسندیدہ خبر ملتی تو مال کے ساتھ اسے خاموش کروادیتے (اس کی ضرورت پوری کردیتے) [2]

۶۔ حالات وظروف کے مطابق بیک وقت سختی اور نرمی پر مبنی سیاست:... اموی خلافت کو استحکام حاصل ہو جانے کے بعد سیاست کا یہ انداز واضح شکل میں سامنے آیا۔ اس بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد بن آبیہ کو لکھا: ہم دونوں کے لیے ایک ہی انداز میں سیاست کرنا موزوں نہیں ہے۔ اگر ہم دونوں سختی کریں گے تو لوگوں کو تباہی سے دوچار کردیں گے اور اگر دونوں نرمی کا مظاہرہ کریں گے تو وہ اترانے لگیں گے، ہونا یوں چاہیے کہ جب تو نرمی کرے تو میں سختی کروں، اور اگر میں سختی کروں تو تو نرمی کرے۔[3] اس قسم کی سیاست کے بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف یہ اقوال منسوب ہیں: میں اس جگہ کوڑا نہیں رکھتا جس جگہ میری زبان کام دے جائے اور اس جگہ تلوار نہیں رکھتا جس جگہ میرا کوڑا کام دے جائے اور جس جگہ تلوار سے کام لینا ضروری ہو وہاں اس کا استعمال ضرور کرتا ہوں۔[4] ان کا مشہور قول ہے: اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی رشتہ باقی رہ جائے تو وہ ٹوٹ نہیں پائے گا۔ اگر وہ اسے کھینچیں گے تو میں ڈھیلا کردوں گا اور اگر وہ اسے ڈھیلا چھوڑ دیں گے تو میں اسے کھینچ لوں گا۔[5]

۷۔ باہم مفادات پر مبنی سیاست اپنانا:... خلافت راشدہ جیسی سیاست اپنانا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت اسلامیہ میں وسعت آجانے کے بعد مال و دولت کی کثرت نے بہت سارے مسلمانوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ وہ اپنے جی میں دنیوی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش پالنے لگے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کا اظہار کرتے ہوئے واضح طور سے فرمایا: میں نے ایسا طریقہ اپنایا ہے جس میں میرا بھی فائدہ ہے اور تمہارا بھی۔ جب تک سیرت درست رہے گی اور اطاعت اچھی رہے گی ہر ایک کو اچھی اشیاء خورد و نوش میسر آتی رہیں گی۔ اگر میں تم سے اچھا نہیں ہوں تو تمہارے لیے اچھا ضرور ہوں۔[6]

۸۔ اپنی ذات اور اپنی خلافت کی تعریف و توصیف پر مبنی تشہیر اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی اطلاعاتی سیاست اپنانا:... معاویہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: لوگوں کے دلوں میں میری سب سے زیادہ محبت پیدا کرنے والا مجھے سب سے زیادہ پیارا لگتا ہے۔[1] ان کی اس سیاست کو ان کے بعد اموی خلفاء نے بھی اپنائے رکھا۔ انہوں نے دسیوں شعراء کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ان کے لیے تجوریوں کے منہ کھول دیئے جس کے صلے میں انہوں نے ان کی تشہیر کرنے، خلافت پر ان کا حق ثابت کرنے اور ان کی اطاعت و نصرت کے وجوب کے اثبات کے لیے اپنی تمام تر شاعرانہ صلاحیتیں وقف کر ڈالیں۔[2] اسی پس منظر میں مشہور اموی شاعر اخطل کہتا ہے:

تمت جدودہم و اللہ فضلھم و جلّ قوم سواہم خامل نکد

و انتم اہل بیت لا یوازنھم بیت اذا عُلّ ت الاحساب و العدد[3]

"ان کے نصیب پورے ہیں اور اللہ نے انہیں فضیلت عطا فرمائی ہے جبکہ ان کے علاوہ دوسروں کے نصیب بے وقعت و گم نام ہیں، تم وہ گھر والے ہو کہ جب عزو شرف اور تعداد کو شمار کیا جائے تو کوئی بھی گھر اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔" معاویہ رضی اللہ عنہ نے اعلام و اطلاع کے اس فن کو بڑی اہمیت دی اور اسے بھرپور انداز میں استعمال کرنے کے لیے اسے اپنے حامی چند لوگوں کے سپرد کر دیا۔ آپ شعراء اور مختلف قبائل کے شیوخ کی حمد ردیاں حاصل کرنے کے لیے انہیں عطیات سے نوازتے۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ماتحت امراء اور والیوں کو سیاسی، اعلامی اور مقاصد امن کے حصول کے لیے وسیع اختیارات دے رکھے تھے والی بصرہ زیاد نے بصرہ کے تقریباً پانچ صد سر کردہ لوگوں کی وفاداریاں حاصل کر رکھی تھیں جنہیں وہ تین سو سے لے کر پانچ سو درہم تک ادا کیا کرتا تھا۔[4] اس کے بارے میں حارثہ بن بدر غدانی کہتا ہے:

ألا من مبلغ عنی زیادا فنعم اخو الخلیفۃ و الامیر

فانت إمام معدلۃ و قصد و حزم حین تحضرک الامور

اخوک خلیفۃ اللہ بن حرب و أنت وزیرہ نعم الوزیر[5]

"میری طرف سے زیاد کو یہ پیغام کون پہنچائے گا کہ تو خلیفہ کا بہت اچھا بھائی اور امیر ہے

تو عدل و اعتدال اور حزم و دانائی والا امیر ہے جب تجھے امور کا سامنا کرنا پڑے

تیرا بھائی ابن حرب اللہ کا خلیفہ ہے اور تو اس کا بڑا اچھا وزیر ہے۔"

معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے حلم و حوصلہ اور عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے شعراء کی ناراضی ختم کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے، انہیں عزت دیتے، ان کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے اور ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی روا نہ رکھتے اور اسی طرح وہ انہیں اپنی صف میں شامل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ یاد رہے کہ اس وقت شعراء کی اہمیت عصر حاضر کے ذرائع ابلاغ سے کم نہ تھی۔

۹۔ اطلاعاتی مشینری:... معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں داخلی اور خارجی امن و امان قائم رکھنے کی مشینری بڑی فعال تھی۔ معلومات اکٹھی کرنے کی جس کی صلاحیت ایک مسلمہ امر تھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اس اطلاعاتی مشینری کی بذاتِ خود نگرانی کرتے، انہوں نے حکمرانوں اور رعیت کی نگرانی کے لیے ایک مربوط اور خفیہ نظام وضع کر رکھا تھا۔ ہر علاقہ کے ہر عامل اور امیر لشکر پر ایک جاسوس کو متعین کیا جاتا جو انہیں اس کی حرکات و سکنات سے آگاہ کرتا رہتا، خفیہ سراغ رسانی کا یہ نظام اندرون ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی سرگرم عمل تھا، مثلاً

[1] انساب الاشراف: ۳/۱۵۲۔ مواقف المعارضة، ص: ۱۷۹. [2] ایضاً. [3] ایضاً: ۳/۱۵۲. ایضاً، ص: ۱۷۹. [4] الاخبار الطوال، ص: ۲۲۰.

تیسری بحث:

معاویہ رضی اللہ عنہ کی معاشرتی زندگی اور علمی خدمات

اولاً:... معاویہ رضی اللہ عنہ کی معاشرتی زندگی

معاویہ رضی اللہ عنہ کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلو درج ذیل ہیں:

۱۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ:

ایک دفعہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: کیا میں سب لوگوں سے بڑھ کر تمہارا خیر خواہ نہیں ہوں؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: تمہیں جو کچھ ملا اسی وجہ سے ملا۔[1]

۲۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں جھگڑا:

جویریہ بن اسماء سے مروی ہے کہ بسر بن ابو ارطاۃ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی نازیبا بات کی، اس وقت زید بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، زید نے یہ باتیں سنیں تو لاٹھی اٹھا کر انہیں دے ماری جس سے وہ زخمی ہو گئے۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت زید سے کہا: تم نے اہل شام کے سردار اور قریش کے شیخ کو لاٹھی دے ماری، پھر بسر کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے: تم فاروق اعظم کے بیٹے کی موجودگی میں علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرتے ہو کیا تم سمجھتے تھے کہ وہ اسے برداشت کر لیں گے؟ پھر انہوں نے ان دونوں کو راضی کر لیا۔[2]

۳۔ میں اس کا تم سے زیادہ حق دار ہوں:

ایک دفعہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے زرخیز زمین میں پرجوش چشمہ سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں ہے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اس سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں ہے کہ میں عرب کی پردہ نشیں عقل مند دلہن کے ساتھ رات گزاروں۔ وردان مولیٰ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہنے لگا: مجھے بھائیوں پر مہربان ہونے سے بڑھ کر کوئی چیز پیاری نہیں لگتی۔ یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس کا تم سے زیادہ حق دار ہوں، وردان کہنے لگا: تم جو چاہتے ہو کر گزرو۔[3]

[1] تاریخ طبری: ۶/۲۵۳۔ [2] ایضاً: ۶/۲۵۳۔ [3] ایضاً: ۶/۲۵۴۔

۴۔ اس نے مجھے میری موت کی خبر دی ہے:

مدینہ منورہ پر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عامل جب ان کے پاس ڈاک بھیجنا چاہتا تو وہ اعلان کرواتا کہ جس شخص کو امیر المومنین سے کوئی کام ہو وہ اس کے لیے تحریر لکھ دے۔ زر بن حبیش یا ایمن بن خریم نے ایک لطیف سا (پوشیدہ) خط لکھ کر اسے دوسرے خطوط میں پھینک دیا، اس خط میں یہ اشعار بھی لکھے تھے:

اذا الرجال ولدت اولادہا و اضطربت من کبیر اعضادُہا

و جعلت اسقامہا تعتادہا فہی زروع قد دنا حصادہا

جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ خط پڑھا تو فرمانے لگے: اس نے مجھے میری موت کی خبر دی ہے۔[1]

۵۔بنو امیہ کے شاعر کو معاویہ رضی اللہ عنہ کی نصیحت:

معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبد الرحمن بن حکم بن ابو العاص سے فرمایا: میرے بھتیجے! تو شعر کہا کرتا ہے، عورتوں کے اوصاف و محاسن بیان کرنے سے پرہیز کرنا ورنہ تو شریف خاتون کے ساتھ برا سلوک کرنے کا مرتکب ہو گا، ہجو گوئی سے بچنا ورنہ تو شریف انسان کے ساتھ برائی کا ارتکاب کرے گا اور کمینے انسان کو اس کے خلاف بھڑکائے گا۔ کسی کی مدح وستائش سے اجتناب کرنا اس لیے کہ یہ بد افعال لوگوں کی خوراک ہے، تو اپنی قوم کے کارناموں پر فخر کیا کر، ایسی ضرب الامثال بیان کیا کر جس سے تو اپنے آپ کو سنوارا کرے اور دوسروں کو مودب بنایا کرے۔

۶۔یہ نہ کہہ کہ میرا گھر بصرہ میں ہے بلکہ یہ کہہ کہ بصرہ میرے گھر میں ہے:

ایک آدمی نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے گھر تعمیر کرنے کے لیے بارہ ہزار لکڑیوں کا مطالبہ کیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: تیرا گھر کہاں ہے؟ اس نے کہا: بصرہ میں، آپ نے دریافت کیا: اس کی پیمائش کتنی ہے؟ اس نے جواب دیا: 2×2 فرسخ۔[2]

آپ نے فرمایا: یہ نہ کہہ کہ میرا گھر بصرہ میں ہے بلکہ یہ کہہ کہ بصرہ میرے گھر میں ہے۔[3]

۷۔مجھے معلوم تھا کہ اس کا اس قدر زیادہ کھانا اسے بیمار کر دے گا:

مذکور ہے کہ ایک آدمی اپنے بیٹے کے ساتھ آیا اور پھر وہ دونوں کھانا کھانے کے لیے معاویہ رضی اللہ عنہ کے دستر خوان پر بیٹھے۔ اس کا بیٹا بہت زیادہ تیز کھانا کھانے لگا اور معاویہ رضی اللہ عنہ اسے دیکھتے رہے۔ اس کا باپ اسے ایسا کرنے سے روکنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ اسے سمجھ نہیں رہا تھا، جب وہ باہر نکلے تو اس کے باپ نے اسے ملامت کی اور آئندہ کے لیے ادھر آنے سے منع کر دیا۔

جب وہ اکیلا آیا تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: وہ بڑے بڑے لقمے اٹھانے والا تیرا بیٹا کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا: وہ بیمار ہو گیا ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے معلوم تھا کہ اس قدر زیادہ کھانا اسے بیمار کر دے گا۔[4]

۸۔آپ میرے لقمہ میں بال دیکھ رہے ہیں:

مروی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک اعرابی سے فرمایا: اپنے لقمہ سے بال نکال دے۔ وہ کہنے لگا: آپ میرے لقمہ میں بال دیکھ رہے ہیں، واللہ، میں تمہارے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاؤں گا۔[5]

۹۔ آپ لباس سے نہیں بلکہ اس میں ملبوس شخص سے مخاطب ہیں:

معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے سامنے کھڑے ایک شخص کی طرف دیکھا جو معمولی سا لباس پہنے ان سے مخاطب تھا، انہوں نے اس کے لباس کی وجہ سے اسے حقیر خیال کیا تو وہ کہنے لگا: امیر المومنین! آپ لباس سے نہیں بلکہ اس شخص سے مخاطب ہیں جس نے یہ لباس پہن رکھا ہے۔[1]

۱۰۔ میری بیٹی! یہ تیرا خاوند ہے جسے اللہ نے تیرے لیے حلال قرار دیا ہے:

عبد اللہ بن عامر نے ہند بنت معاویہ رضی اللہ عنہما سے شادی کی، جب اسے اس کے خاوند کے پاس بھیجا گیا اور اس نے اس کے پاس جانا چاہا تو اس نے اس سے انکار کر دیا جس پر ابن عامر نے اسے اس زور سے مارا کہ وہ چلا اٹھی، جب باندیوں نے اس کے چلانے کی آواز سنی تو وہ بھی بلند آواز سے رونے لگیں۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی آواز سنی تو وہ صورت حال معلوم کرنے کے لیے ان کے پاس گئے تو انہوں نے بتایا: جب ہم نے اپنی مالکہ کی آواز سنی تو ہم بھی چلانے لگیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے تو وہ مار پڑنے کی وجہ سے رو رہی تھی۔ اس پر انہوں نے ابن عامر سے فرمایا: بڑے افسوس کی بات ہے، کیا اس جیسی عورت کو اس جیسی رات میں بھی مارا جاتا ہے؟ پھر اس سے فرمایا: تم ذرا باہر جاؤ، پھر وہ بیٹی کے پاس گئے اور فرمایا: میری بیٹی! یہ تیرا خاوند ہے جسے اللہ نے تیرے لیے حلال قرار دیا ہے، کیا تو نے شاعر کا یہ قول نہیں سنا:

من الخضرا[2] البیض اما حرامها فصعب و اما حلّها فذلول

"ان کا شمار شرم و حیا والے لوگوں میں ہوتا ہے جن کے لیے عمل حرام بہت مشکل جبکہ حلال آسان ہے۔" پھر وہ اس کے پاس سے نکلے اور اس کے خاوند سے فرمانے لگے: اب اندر جاؤ، میں نے تمہارے لیے اس کے اخلاق کو درست کر دیا ہے اور اسے آمادہ کر دیا ہے۔ اس پر ابن عامر اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اب وہ سدھر چکی ہے، لہٰذا اس سے اپنی ضرورت پوری کر لی۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ)[3]

[1] البداية و النهاية: ۱۱/۴۵۳. [2] الخضرات، خضيرة کی جمع ہے اور یہ خضر سے مشتق ہے؛ شدت حیاء. [3] البداية و النهاية: ۱۱/۴۶۴. [4] مرويات خلافة معاوية في تاريخ الطبري، ص: ۸۲. [5] انساب الاشراف: ۴/۲۷۔ مرويات خلافة معاوية، ص: ۸۳. [6] العقد الفريد: ۶/۲۱، ۲۲۔ مرويات خلافة معاوية، ص: ۸۳. [7] مرويات خلافة معاوية، ص: ۸۳.

۱۱۔ کیا معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول صحیح ہے کہ کریم انسان خوشی سے جھوما کرتا ہے:

محمد بن عامر سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن جعفر کی موسیقی پر مذمت کی، پھر وہ اپنے ایک آزاد کردہ غلام بدیح کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اس وقت وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عبد اللہ بدیح سے کہنے لگے: گانا سنائیں، جس پر اس نے گانا شروع کر دیا، اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی ٹانگ کو حرکت دی تو عبد اللہ کہنے لگے: امیر المومنین! رک جائیے۔ یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کریم شخص خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔[4] اس خبر کو بلاذری[5] اور ابن عبد ربہ[6] نے بھی بعض منکر اضافوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔[7]

اس ضعیف روایت کی تردید اس روایت سے ہوتی ہے جسے طبرانی نے حسن سند کے ساتھ کیسان مولیٰ معاویہ کی سند سے روایت کیا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: لوگو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نو چیزوں سے منع فرمایا ہے، ان سے میں بھی تمہیں منع کرتا ہوں: نوحہ کرنا، مصنوعی بال لگانا، زیب وزیبائش کو ظاہر کرنا، تصاویر، درندوں کے چمڑے، گانا بجانا، سونا، شرم گاہ اور ریشم۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ گانا سننے سے منع فرمایا کرتے اور ایسا کرنے والے کو ناپسند کیا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ پر ان کا عامل مروان بن حکم فسق وفجور کے مرتکب لوگوں پر سختی کیا کرتا تھا، وہ اس کی ولایت کے دوران مدینہ سے بھاگ گئے تھے۔[2]

۱۲۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قرضوں کی ادائیگی:

معاویہ رضی اللہ عنہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بڑا خیال رکھتے اور ان کے ذمہ واجب الاداء قرضوں کی ادائیگی کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ سعید بن عبدالعزیز کہتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے اٹھارہ ہزار دینار قرض ادا کیا۔[3] عروہ فرماتے ہیں: ایک دفعہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک لاکھ درہم بھیجے جو انہوں نے شام ہونے سے پہلے پہلے تقسیم کر دیئے۔[4]

۱۳۔ لوگوں کی ضروریات کی تکمیل:

معاویہ رضی اللہ عنہ اس بات سے خائف رہتے کہ ان کا کبھی کبھار مسلمانوں سے الگ رہنا ان کے لیے قابل مواخذہ گناہ نہ بن جائے۔ جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی: "اللہ تعالیٰ جس شخص کو مسلمانوں کے معاملات میں سے کوئی چیز تفویض کرے اور پھر وہ ان کی حاجات و ضروریات اور فقر وفاقہ سے پردے میں رہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت وضرورت اور فقر سے پردہ کرے گا۔" تو انہوں نے لوگوں کے مسائل ان تک پہنچانے کے لیے ایک آدمی کا تقرر کر دیا تاکہ لوگوں کی کوئی بھی حاجت وضرورت ان کے علم میں آنے سے نہ رہے۔[5] مدینہ پر ان کا عامل جب معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس ڈاک بھیجنا چاہتا تو اعلان کرواتا کہ جس شخص کو بھی امیر المومنین سے کوئی کام ہو وہ اس کے لیے خط لکھ دے۔[6]

[1] المعجم الکبیر: ۱۹/۳۷۳۔ اس کی سند حسن ہے۔ [2] الدولۃ والمجتمع فی العصر الاموی، ص: ۹۲. [3] سیر اعلام النبلاء: ۳/۱۵۴. [4] ایضاً. [5] الدولۃ الاموية، ص: ۲۷۳. [6] تاریخ طبری: ۶/۲۵۴.

۱۴۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا صالحین کی موت سے متاثر ہونا:

جب عتبہ بن ابوسفیان کا بیٹا فوت ہوا تو لوگ تعزیت کے لیے معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انہوں نے فرمایا: ابوسفیان کی اولاد سے ایک لڑکے کی موت کوئی ایسی مصیبت نہیں ہے، مصیبت تو ابو مسلم خولانی اور کریب بن سیف انصاری کی موت کی وجہ سے ٹوٹی۔[7]

۱۵۔ مساجد اور چشموں کا اہتمام کرنا:

معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے مسجد حرام کو بڑی اہمیت دی، اس کو وسعت دی اور اس میں چراغ رکھنے اور انہیں روشن کرنے کے لیے بیت المال سے رقوم جاری کیں اور طواف کرنے والوں کے لیے روشنی کا بندوبست کیا۔ انہوں نے مسجد اقصیٰ میں بھی گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کی طرف سے مصر کے امیر مسلمہ بن مخلد نے ۵۳ھ فسطاط کی جامع مسجد کی توسیع کی۔ اس کی دیواروں کو پلستر کیا اور اس کے بلند و بالا چار مینار بنائے اور فرش پر چٹائیاں بچھوائیں، ان کے عہد حکومت میں اہل مصر نے مسجدوں میں مینار تعمیر کروائے اور انہیں رات کی نمازوں کے لیے ایک ہی وقت میں اذان دینے کا حکم دیا گیا۔[1] مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی جامع مسجد کی توسیع کی، پھر زیاد بن ابیہ نے اسے نئے سرے سے تعمیر کیا، اس میں مزید اضافہ کیا اور کنکریوں کا فرش ڈلوایا، وہ کہا کرتا تھا: میں نے کوفہ کی مسجد کے ہر ستون پر اٹھارہ صد درہم خرچ کیے، اس نے مسجد میں ایک مقصورہ بھی تعمیر کروایا جس کی تجدید عراق پر اپنی ولایت کے دوران خالد بن عبداللہ قسری نے کی، بعد ازاں عبیداللہ بن زیاد نے جامع مسجد میں اور اضافہ کیا اور اس میں کنکریوں کا فرش لگوایا۔[2] زیاد بن ابیہ نے بصرہ کی جامع مسجد میں بہت زیادہ اضافہ کیا، اسے اینٹوں اور چونے سے تعمیر کیا، اس کی بلڈنگ میں ستون تعمیر کیے، اس پر ساج کی چھت ڈالی اور مینار پتھروں سے بنائے، مزید براں اس نے بصرہ میں اور بھی بہت ساری مسجدیں تعمیر کروائیں، عبیداللہ بن زیاد آیا تو اس نے جامع مسجد میں مزید اضافہ کیا۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ نے دولت اسلامیہ میں عوام کے لیے متعدد سہولیات کا اہتمام کیا۔ مدینہ منورہ میں پینے کے پانی کا بندوبست کیا، حرم مکی میں پانی کے لیے چشمے جاری کیے[4] اور راستوں پر کنویں کھدوائے اور مملکت اسلامیہ کے مختلف علاقوں کو باہم مربوط کیا۔[5]

۱۶۔ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں گھوڑ دوڑ:

اسلامی تاریخ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان اوّلیں خلفاء میں ہوتا ہے جنہوں نے گھوڑ دوڑ کے مقابلوں کا آغاز کیا، گھوڑ دوڑ کا ایک مقابلہ دمشق میں منعقد ہوتا جس میں ملک کے گوشے گوشے سے گھوڑ سوار شریک ہوتے، وہ اپنے اور اپنے گھوڑوں کے کارناموں پر مشتمل اشعار پڑھتے ہوئے میدان میں اترتے، اس کے اختتام پر خلیفہ کی طرف سے کامیاب ہونے والوں کو قیمتی انعامات سے نوازا جاتا۔[6]

[1] دراسة فی تاریخ الخلفاء الامویین، ص: ۳۴۷. [2] ایضاً، فتوح البلدان، ص: ۳۴۰۳۹۹. [3] فتوح البلدان، ص: ۴۲۶، ۴۲۷۔ دراسة فی تاریخ الخلفاء الامویین، ص: ۳۴۸. [4] اخبار مکه: (۲/۲۲۷۔ دراسة فی تاریخ الخلفاء الامویین، ص: ۳۴۱. [5] الخلافة الاموية، عبدالمنعم ہاشمی، ص: ۲۵. [6] التربية و الثقافة الاسلامية فی الشام و الجزيرة خلال القرون الثلاثة الاولی ہجرة، ماخوذ از مخطوطة تاریخ مدينة دمشق لابن عساکر، ص: ۹۴، الرفق بالحيوان، و سلامة الهر فی، ص: ۴۹.

۱۷۔ حجاج کرام اور روزہ داروں کو کھانا کھلانا:

امیر المومنین معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے مکہ مکرمہ میں کھانا تیار کرنے کے کئی مراکز قائم کیے جن میں حجاج کرام اور ماہ رمضان المبارک میں فقراء روزے داروں کے لیے کھانا تیار کیا جاتا۔[1]

۱۸۔ اللہ کی طاقت:

معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو دیکھا کہ وہ اپنے غلام کو مار رہا ہے۔ اس پر انہوں نے اس سے فرمایا: تجھے علم ہونا چاہیے کہ جتنی قدرت تجھے اس پر حاصل ہے اللہ تعالیٰ کو اس سے کہیں زیادہ قدرت تجھ پر حاصل ہے۔ کیا تو اس شخص کو مارتا ہے جو تجھ سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا؟ اللہ کی قسم! مجھے قدرت نے کینہ پرور لوگوں سے انتقام لینے سے روک رکھا ہے۔ سب سے اچھا معاف کرنے والا وہ ہے جو قدرت حاصل ہونے کے باوجود معاف کر دے۔[2] یہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی اپنے بیٹے کے لیے صحیح اور عمدہ توجیہ ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ قدرت کے باوجود معاف کرنا کریمانہ اخلاق کے زمرے میں آتا ہے اور یہ سیادت و قیادت اور سیاست امت کا اہم ترین عنصر ہے۔ امیر المومنین اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اس لیے یاد کروا رہے ہیں تاکہ وہ احساس برتری کو ختم کرے اور اپنے ماتحت لوگوں کے بارے میں اللہ سے ڈرے۔[3]

ثانیاً:... علمی دلچسپی

معاویہ رضی اللہ عنہ امراء، علماء اور فرزندان امت مسلمہ کو تہذیبی ثقافتی اٹھان کے لیے متحرک ہونے کے لیے حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے ان کے دور حکومت میں تفسیر، علوم القرآن، فقہ اور عقیدہ جیسے علوم کو خوب ترقی ملی اور متعدد ایسے ممتاز علماء پیدا ہوئے جن کے بعد مسلمان آج تک ان کے علوم سے استفادہ کرتے اور ان کے اقوال و اجتہادات سے استشہاد کرتے چلے آئے ہیں، جن میں عبد اللہ بن عباس، ابوہریرہ، عبد اللہ بن عمر وغیرہم رضی اللہ عنہم قابل ذکر ہیں۔ اس دوران قرآن کریم، سنت نبویہ، فقہ اور عربی زبان کو رئیسی علوم کی حیثیت حاصل تھی، معاویہ رضی اللہ عنہ ان علوم کے علاوہ دیگر کئی علوم کا اہتمام کیا کرتے تھے، مثلاً:

۱۔ تاریخ:

معاویہ رضی اللہ عنہ کو سب سے پہلے عربی زبان میں تاریخ مدون کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس جگہ تاریخ سے مغازی نبویہ، قصص الانبیاء، امام العرب اور انساب مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد گزشتہ امتوں کی تاریخ، بادشاہوں کے اطوار و احوال اور سیاست کے مختلف انداز ہیں جن سے آگاہ رہنا بادشاہوں اور حکمرانوں کے لیے ضروری ہے۔[4]

معاویہ رضی اللہ عنہ رات کا ایک تہائی حصہ نیند لیتے پھر بیدار ہو کر بیٹھ جاتے اور پھر بادشاہوں کے احوال و واقعات ان کی سیرت و کردار، جنگوں کے بارے معلومات اور جنگی حربوں پر مشتمل کتب تاریخ انہیں پڑھ کر سنائی جاتیں اور یہ ذمہ داری اس کام کے لیے مقرر کردہ غلام ادا کرتے وہ اس قسم کا مواد یاد کرتے اور ہر رات انہیں سنایا کرتے۔[1] انہوں نے عبیدہ بن شربہ کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی۔ ان کا شمار یمن اور دمشق کے ممتاز علماء تاریخ میں ہوتا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ ان سے گزشتہ لوگوں کے حالات و واقعات اور عرب و عجم کے بادشاہوں کے بارے میں مختلف معلومات حاصل کرتے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے کاتبین کو حکم دیا تھا کہ عبید اللہ بن شربہ انہیں جو کچھ بتائیں اسے لکھ لیا کریں، چنانچہ انہوں نے ان

سے سن کر کتاب الامثال، کتاب الملوک اور اخبار الماضیین[2] نامی کتابیں مدوّن کیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے صرف عبیدہ ہی نہیں بلکہ عرب و عجم سے اور بھی کئی ایسے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے جو گزشتہ اقوام کے حالات و واقعات سے آگاہ ہوتے اور جن سے وہ انہیں مستفید کیا کرتے تھے۔[3] سیاستدانوں، بادشاہوں اور حکمرانوں کے لیے تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے، تاریخ سے بخوبی آگاہ سیاستدان میدان عمل میں دوسروں سے بڑھ کر کامیاب ہوا کرتا ہے، اس لیے کہ تاریخ اور سیاست میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

۲۔ شعر و لغت:

معاویہ رضی اللہ عنہ شعر کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے اور انہوں نے حکومت کے سیاسی ابلاغی مقاصد کے لیے اسے استعمال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کی شعر و شاعری، اس کی معرفت اور شعری ذوق پر تربیت کیا کرتے تھے۔ انہوں نے زیاد کو لکھا کہ اپنے بیٹے کو میرے پاس بھیجیں، جب وہ آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس سے جو سوال بھی کیا اس نے اس کا اطمینان بخش جواب دیا، مگر جب اس سے شعر و شاعری کے بارے سوال کیا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس پر آپ نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا: امیر المومنین! مجھے اپنے سینہ میں کلام الرحمن کے ساتھ شیطانی کلام جمع کرنا ناپسند ہے، یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! جنگ صفین کے دن راہِ فرار اختیار کرنے سے مجھے صرف ابن اطنابہ کے ان اشعار نے روکا تھا:

ابت لی عفتی و ابی بلائی و اخذی الحمد بالثمن الربیح

و اعطائی علی الاعدام مالی و اقدامی علی البطل المشیح

و قولی کلما جشأت و جاشت مکانک تحمدی او تستریحی[4]

نیز معاویہ رضی اللہ عنہ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

[1] مروج الذہب: ۲/۴۱۔ الدولة الاموية، حمدی شاہین، ص: ۴۵۵. [2] ایضاً: ۲/۸۵۔ ایضاً، ص: ۴۵۵۔ التعلیم فی العصر الاموی، انتصار السیتی، ص: ۱۷۷. [3] التاریخ العربی و المؤرخون: ۱/۹۵۔ الدولة الاموية، حمدی شاہین: ۴۵۵. [4] البدایة و النہایة: ۱۱/۴۲۶

ترجمہ:... جہالت و حماقت کو قتل کرنے والی حلم جیسی کوئی چیز نہیں ہے، بردبار انسان اس کے ساتھ جہالت کو ختم کیا کرتا ہے، کسی کے خلاف حماقت نہ کر اگرچہ تو غصے سے بھرا ہوا ہو۔ اس لیے کہ برائی و قباحت قابل ملامت ہوا کرتی ہے، کسی گناہ کی وجہ سے اپنے بھائی سے قطع تعلقی نہ کرنا کریم (معزز) انسان گناہ معاف کر دیا کرتا ہے۔" معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت سارے اشعار زبانی یاد تھے، ایک دن ان کی مجلس میں مشہور عربی شاعر ابن ابو محجن ثقفی حاضر ہوا تو آپ نے اس سے فرمایا: تمہارا باپ وہ ہے جو کہتا ہے:

اذا مت فادفنی إلی جنب کرمة تروی عظامی بعد موتی عروقها

و لا تدفننی بالفلاۃ فإننی اخاف اذا ما مت ان لا اذوقھا

"جب میں مر جاؤں تو مجھے انگور کی بیل کے پہلو میں دفن کرنا اس کی جڑیں میری موت کے بعد میری ہڈیوں کو راحت پہنچائیں گی۔ اور مجھے بیابان میں دفن نہ کرنا اس لیے کہ میں ڈرتا ہوں کہ مرنے کے بعد اسے چکھ نہیں سکوں گا۔" اس پر ابن ابی محجن نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو ان سے اچھے اشعار ذکر کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا: وہ کون سے ہیں؟، اس نے کہا: وہ یہ ہیں:

لا تسئل الناس مالی و کثرتہ و سائل القوم ما حزمی و ما خلقی

القوم اعلم أنی من سراتھم اذا تطیش ید الرعدیدۃ الفرق

قد ارکب الھول مسدولا عساکرہ و اکتم السر فیہ ضربۃ العنق

"لوگوں سے میرے مال اور اس کی کثرت کے بارے میں سوال نہ کر ان سے میری ہوشیاری، دوراندیشی اور میرے اخلاق کے بارے میں سوال کر، میری قوم اچھی طرح جانتی ہے کہ میرا شمار اس کے سرداروں میں ہوتا ہے۔ جب ڈرپوک اور بزدل کا ہاتھ لرزنے لگتا ہے۔ جب ہولناکی ہر طرف اپنے لشکر پھیلا دے تو اس پر سوار ہو جاتا ہوں اور میں وہ راز چھپا لیتا ہوں جس میں گردن کٹ جایا کرتی ہے۔"

شاعر مسکین دارمی کا شمار معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے کے مقربین میں ہوتا تھا، ایک دفعہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں عطارد بن حاجب سے پوچھا: خوبرو اور فصیح اللسان دارمی کا کیا ہوا؟ تو اس نے اسے اچھے الفاظ سے یاد کیا۔ انہوں نے اس سے فرمایا: اسے اس امر سے مطلع کر دے کہ میں نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے علاقہ میں مقیم رہے اور اگر چاہے تو ہمارے پاس چلا آئے۔ اس کا وظیفہ اس کے پاس پہنچتا رہے گا اور اسے یہ بھی خوش خبری دینا کہ میں نے اس کی قوم کے چار ہزار لوگوں کے لیے وظائف مقرر کیے ہیں۔[1]

چوتھی بحث:

خوارج، عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں

خوارج اس نام سے معرکہ صفین میں تحکیم کے بعد معروف ہوئے۔ قبل ازیں ان کا شمار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انصار میں ہوتا تھا، یہ لوگ جنگ جمل اور معرکہ صفین میں ان کے ساتھ تھے، بعد ازاں وہ تحکیم کو مسترد کرتے ہوئے ان کی مخالفت پر اتر آئے، علی رضی اللہ عنہ نے انہیں مطمئن کر کے واپس اپنی جماعت میں لانے کی بڑی کوشش کی مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور پھر انہوں نے انتہا پسندی سے کام لیتے ہوئے زمین میں فساد برپا کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی اور ان میں سے زیادہ تر لوگوں کا جنگ نہروان میں خاتمہ کر دیا۔ وہ اپنے لیے خوارج کے نام کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے کہ انہیں اس نام سے ان کے مخالفین نے موسوم کیا تھا جس کی وجہ ان کا مسلمانوں کے ایام اور ان کی جماعت کے خلاف خروج

کرنا تھا، وہ اپنے آپ کو شراۃ کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے کیوں کہ انہوں نے اس امید سے اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کے لیے فروخت کر دیا تھا کہ انہیں آخرت میں جنت کا داخلہ نصیب ہو گا۔ ان کا اشارہ اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف تھا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (التوبۃ: ۱۱۱)

"یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں اس کے عوض کہ ان کے لیے جنت ہے۔" خوارج کو محکمۃ بھی کہا جاتا ہے، اس لیے کہ انہوں نے ((لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ)) کا نعرہ لگایا تھا۔ نیز ان پر حروریۃ کا بھی اطلاق کیا جاتا ہے، یہ حروراء نامی اسی بستی کی طرف نسبت ہے جو کوفہ کے مضافات میں واقع ہے اور جہاں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے کے بعد پہلی دفعہ جا ٹھہرے تھے۔[1] چونکہ ان کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کا سبب ان کے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان واقعہ تحکیم تھا، لہٰذا انہوں نے خلافت کے بارے میں جو نظریہ اختیار کیا وہ دو عام اصولوں پر قائم تھا جن پر ان کے مختلف گروہوں کا اتفاق ہے۔[2]

پہلا اصول:... خلافت قریش کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جیسا کہ اہل سنت کا مذہب ہے۔[3] بلکہ ہر وہ مسلمان اس کا استحقاق رکھتا ہے جو اس کی اہلیت رکھتا ہو اگرچہ وہ حبشی غلام ہو۔ خلیفہ کا مسلمانوں کے آزادانہ اختیار کے ذریعے منتخب ہونا ضروری ہے، پھر جب اس کا انتخاب پایہ تکمیل کو پہنچ جائے تو پھر نہ تو اس کے لیے اس منصب سے الگ ہونا جائز ہے اور نہ ہی وہ تحکیم کو قبول کر سکتا ہے، اس اصول کی روشنی میں وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کرتے ہیں، عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے نصف اوّل کو تسلیم کرتے جبکہ بعد ازاں کے عہد خلافت سے لاتعلقی کا اظہار کرتے اور انہیں کافر بتاتے ہیں، جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے تو وہ ان کی خلافت کا آغاز سے لے کر تحکیم سے قبل تک اعتراف کرتے ہیں جبکہ تحکیم کے بعد نہ صرف یہ کہ ان کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ انہیں کافر گردانتے ہیں۔[1] اسی طرح وہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنو امیہ کی خلافت کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔[2] اور انہیں کافر بتاتے ہیں۔ خوارج حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ، زبیر، عمرو بن العاص اور ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہم کو بھی کافر کہتے ہیں۔ المختصر وہ مسلمانوں میں سے ہر اس شخص کو کافر گردانتے ہیں جو ان کی رائے سے اختلاف کرتا اور ان کے مذہب کو اختیار نہیں کرتا، اس بنا پر وہ ان کے ملک کو دار الکفر خیال کرتے، ان کے اموال اور خون کو مباح قرار دیتے اور ان کے بچوں تک کے قتل کو جائز تسلیم کرتے ہیں۔[3]

دوسرا اُصول:... دوسرا اصول جس پر نظریہ خوارج قائم ہے وہ یہ ہے کہ ظالم امام کے خلاف خروج کرنا واجب ہے۔[4] خارجی نظریات کا یہ پہلو انتہائی خطرناک ہے، اگر ان کا اختلاف نظری اختلاف تک محدود رہتا یا دلیل و برہان کے ساتھ جدل و جدال سے آگے نہ بڑھتا تو معاملہ بالکل آسان تھا، مگر انہوں نے اپنے مخالفین کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور اس کا آغاز علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ سے کیا اور بزورِ بازو اپنی آراء اور اپنے مذہب کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کی، وہ جس طرح اپنی رائے اور مذہب میں انتہا پسند ثابت ہوئے اسی طرح طاقت اور تشدد کے استعمال میں بھی آخری حد تک جا پہنچے، اسی طرح انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو بلکہ امت کو بھی شدید نقصان پہنچایا اور دولت امویہ کو سنگین صورتِ حال سے دوچار کر دیا جس

کے وہ زبردست مخالف تھے۔[5] خوارج کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں میری کتاب: ''سیرۃ امیر المومنین علی بن ابوطالب شخصیتہ و عصرہ''۔[6]

جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا خوارج کی تحریک کی خطرناکی ان کی شدت پسندی میں پنہاں تھی اور چونکہ وہ اپنے خود ساختہ اصولوں پر سختی کے ساتھ کاربند تھے، لہٰذا انہوں نے اس کے لیے خوشی خوشی اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور دولتِ امویہ کے ساتھ اپنی جنگوں میں شجاعت و دلیری کی عجیب و غریب داستانیں رقم کیں۔ اس دوران وہ خود کش گروہوں کے مماثل نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اکثر اوقات انتہائی کم تعداد میں ہونے کے باوجود بڑے بڑے حکومتی لشکروں کو شکست فاش دے کر اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ اگر شجاعت و دلیری، پیش قدمی اور قربانی کا یہ جذبہ صحیح رخ پر گامزن ہوتا اور وہ اعدائے اسلام کے ساتھ دولتِ امویہ کی جنگی کوششوں کے ساتھ اپنی کوششیں شامل کر دیتے تو انسانی تاریخ کا رُخ بدل جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خوارج نہ تو دنیا کے طالب تھے اور نہ مادہ پرست، وہ جس فکر پر ایمان رکھتے تھے اس کے لیے مخلص تھے اور اسے بروئے کار لانے کے لیے ہمہ وقت اور ہمہ تن کوشاں رہے۔[1] انہوں نے اس کے لیے اپنے آپ کو تباہ کروالیا اور امت کو اس کے وقت، مال اور جانوں کے حوالے سے بڑے بڑے مسائل سے دوچار کر دیا۔ اگر خوارج نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی، ان سے جنگیں لڑیں اور انہیں کافر تک قرار دے ڈالا تو انہوں نے دولت امویہ کے خلاف اس سے بھی سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے اسلحہ سے لیس ہو کر اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے اور ۴۱ھ میں کوفہ چھوڑنے سے قبل معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔[2]

اولاً:... کوفہ میں خوارج کی تحریکیں ا۔ فروہ بن نوفل اشجعی کی تحریک:

۴۱ھ کے واقعات کے ضمن میں طبری رقمطراز ہیں: ''اس سال خوارج نے جوشہ زور میں علی رضی اللہ عنہ سے الگ ہو گئے تھے، معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا۔''[3] عوانہ سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ حسن رضی اللہ عنہ ابھی کوفہ سے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا گزر نخیلہ کے مقام پر ہوا، پانچ صد حروریہ[4]

جو (حضرت علی رضی اللہ عنہ سے) الگ ہو کر فروہ بن نوفل اشجعی کے ساتھ شہرزور کے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے، کہنے لگے: اب ہمارا سابقہ اس شخص سے پڑا ہے جس کے بارے میں ہمیں کوئی شک نہیں ہے، چلو اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جہاد کرو، وہ فروہ بن نوفل کی قیادت میں آگے بڑھے اور کوفہ میں داخل ہو گئے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اہل شام کے شہ سواروں کا دستہ روانہ کیا مگر انہوں نے شامیوں کو منتشر کر دیا۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ سے کہا: اللہ کی قسم! تمہیں میرے پاس امان نہیں ملے گی یہاں تک کہ تم اپنے یہاں کی اس آفت کو دور کر دو۔ یہ سن کر اہل کوفہ خوارج کی طرف نکلے اور ان سے جنگ کرنے لگے۔ خوارج نے ان سے کہا: تم پر افسوس ہو، تم ہم سے کیا چاہتے ہو، معاویہ ہمارا اور تمہارا مشترکہ دشمن ہے، ہمیں اس سے لڑنے دو، اگر ہم کامیاب رہے تو ہم نے تمہیں تمہارے دشمن سے بچا لیا اور اگر وہ کامیاب ہو گئے تو تم ہم سے بچ گئے۔ انہوں نے کہا: واللہ! ہم تم لوگوں سے لڑیں گے۔ وہ کہنے لگے: اللہ ہمارے نہروان والے بھائیوں پر رحم فرمائے۔[5]

پانچویں بحث:

عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں مالی نظام

اولاً:... ذرائع آمدن

ا۔ زکوٰۃ:

زکوٰۃ اسلام کے مالی نظام کا اہم ترین عنصر ہے، زکوٰۃ کی فرضیت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَوٰةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ﴾ (البینۃ: ۵)

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔''

زکوٰۃ ارکان اسلام میں سے اہم رکن ہے اور اس کی فرضیت پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف قتال کرنے پر اتفاق کیا۔[1] لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے اور اسے خرچ کرنے کی ذمہ داری سلطان وقت کو تفویض کی گئی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ جمع بھی فرمایا کرتے اور پھر اسے تقسیم بھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ سلسلہ بر قرار رکھا، پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں اموال کی کثرت ہو گئی تو انہوں نے اموال باطنہ سے متعلقہ امور کو امام کے وکلاء کے حوالے کر دیا جبکہ اموال ظاہرہ مثلاً کھیتیاں اور مویشی وغیرہا کی زکوٰۃ حکومت وصول کرتی اور وہی اسے خرچ بھی کیا کرتی تھی۔[2] حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے بارے میں وارد ہے کہ وہ خود زکوٰۃ وصول کیا کرتے تھے۔[3] پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اس بارے میں اختلاف رونما ہوا کہ مقامی ولاۃ کو زکوٰۃ دی جائے یا نہیں؟[4] یہ اختلاف اموال باطنہ کے بارے میں تھا جہاں تک اموال ظاہرہ کا تعلق ہے تو ان کی زکوٰۃ حکومت ہی وصول کیا کرتی تھی۔ چونکہ اموی دورِ حکومت میں بعض لوگ ولاۃ الامور کو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے، لہٰذا اس کے نتیجہ میں زکوٰۃ کی وصولی میں کمی واقع ہو گئی۔ یاد رہے کہ اس سے عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا دورِ حکومت مستثنیٰ ہے لوگوں نے جب ان کی ولایت کی خبر سنی تو وہ حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے دوڑتے چلے آئے۔[1] اسی طرح ان کے عہد حکومت میں سرکاری محاصل میں زکوٰۃ کا کردار پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا، اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اموی دورِ حکومت کے تمام

عرصے میں زکوٰۃ کے اہم کردار سے چشم پوشی کی گئی تھی، اگرچہ اس کی وصولی میں خاصی کمی واقع ہوئی تھی مگر متعدد دلائل اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ اس طرح کہ زکوٰۃ اموی اقتصاد کے دو مرکزی ذرائع سے وصول کی جاتی تھی اور وہ تھے زراعت اور تجارت۔[2] اس کی اہمیت اس امر سے بھی واضح ہوتی ہے کہ اس کے لیے دیوان صدقات کے نام سے ایک خاص دیوان قائم کیا گیا۔[3] یہ دیوان زکوٰۃ اور صدقات کے امور کی نگرانی کرتا جو مالی طور سے مستحکم لوگوں سے وصول کیے جاتے اور قرآن وسنت کی رو سے اس کے مستحقین پر خرچ کیے جاتے تھے۔[4] بتایا جاتا ہے کہ اس کا آغاز ہشام بن عبدالملک کے دورِ خلافت میں ہوا، یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کے دور میں دیوان صدقات وزکوٰۃ کا نگران اسحاق بن قبیصہ بن ذؤیب تھا۔ زکوٰۃ کی مد سے آمدن کی پوری تفصیل فراہم نہ ہوسکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سرکاری طور سے اس کا اندراج نہیں کیا جاتا تھا بلکہ وہ ساری کی ساری یا اس کا زیادہ حصہ اسی وقت اس کے مستحقین میں تقسیم کر دیا جاتا۔[5] عمومی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اموی عہد حکومت میں نظام زکوٰۃ شرعی اصولوں کے تابع تھا۔ زکوٰۃ کی مد میں ہونے والے محاصل حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دورِ خلافت میں اپنی آخری حدود کو چھونے لگے، چونکہ ان کے دور میں حکومت عملی طور پر نفاذ اسلام کے لیے حریص تھی، لہٰذا لوگ اس پر اعتماد کرتے ہوئے اسے زکوٰۃ ادا کرنے میں جلدی دکھانے لگے اور پھر چونکہ لوگ یہ کام اپنی خوشی سے ازخود کیا کرتے تھے، لہٰذا وصولی زکوٰۃ کے اخراجات میں بھی خاصی کمی واقع ہوگئی۔ یوں اخراجات کی کمی اور محاصل کی کثرت نے زکوٰۃ کی آمدن میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا۔[6]

۲۔ جزیہ:

اہل ذمہ سے وصول کی جانے والی رقم جزیہ کہلاتی ہے۔ یہ ٹیکس حکومت وصول کرتی ہے جو کہ اس کے دفاع کے مقابل ہے۔ جزیہ دولت امویہ کے لیے ثابت شدہ اہم ذریعہ آمدن تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝﴾ (التوبۃ: ۲۹)

"ان لوگوں سے لڑو جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں رکھتے، جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ شے کو حرام نہیں جانتے اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ وہ ذلیل وخوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔" جزیہ سنت سے بھی ثابت ہے، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کے عامل کے ترجمان سے فرمایا تھا: "ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم تم سے قتال کریں یہاں تک کہ تم ایک اللہ کی عبادت کرو یا پھر جزیہ ادا کرو۔[1] اہل ذمہ سے جزیہ کی وصولی اجماع امت سے بھی ثابت ہے۔[2] امویوں نے جزیہ کے نظام میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں جزیہ کا حصول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں رائج نظام کے ہی تابع تھا، اور اس کے مندرجہ ذیل نکات تھے:

ا: کن لوگوں سے جزیہ وصول کیا جائے گا، اس ضمن میں صرف عاقل وبالغ مرد ہی آتے تھے۔[3]

ب: جو لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں، وہ یہ تھے: عورتیں، بچے، پرانے مریض، غلام، دیوانے، اندھے، بوڑھے اور راہب جن کا کوئی ذریعہ آمدن نہ ہو۔[4] جزیہ عائد کرتے وقت لوگوں کی مالی حالت کا بھی خیال رکھا جاتا۔ متمول آدمی پر اڑتالیس درہم سالانہ، متوسط طبقہ کے لوگوں پر فی کس چوبیس درہم سالانہ اور اس سے نچلے طبقہ کے لوگوں پر فی کس بارہ درہم سالانہ، بشرطیکہ وہ برسر روزگار ہو۔[5] جزیہ وصولی کے مندرجہ ذیل دو معیار تھے:

(۱) معیار مسؤلیت:... اس کی رو سے جزیہ کی دو اقسام تھیں:

جزیہ فردیہ:... یہ وہ جزیہ تھا جو اس کی شروط پوری کرنے والے ہر شخص پر محدود مقدار میں عائد کیا جاتا جو اسلام قبول کرنے کی صورت میں ساقط کر دیا جاتا۔ اجتماعی یا مشترکہ جزیہ:... اس کی صورت یہ تھی کہ کسی بستی یا شہر والوں پر کسی معین مقدار میں جزیہ عائد کیا جاتا اور وہ اس رقم کو اپنے افراد پر تقسیم کر لیتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں اس کی مثال یہ ہے کہ آپ نے اہل اذرح کے ساتھ اس شرط پر صلح کی کہ وہ ہر سال ماہ رجب میں سو دینار جزیہ ادا کیا کریں گے۔[6] عصر اموی میں زیادہ تر جزیہ اسی قسم کا تھا۔[7]

(۲) نقدی اور عینی معیار:... اس کی رو سے جزیہ تین اقسام میں منقسم تھا: نقدی جزیہ، عینی جزیہ اور مشترکہ جزیہ۔ عصر اموی میں جزیہ کی ان تمام اقسام پر عمل کیا جاتا تھا، ہمارے سامنے ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اس سے خروج کی طرف اشارہ کرتی ہو، اور خاص طور سے اس وقت جب شریعت اسلامیہ شرائط صلح کے التزام کا تقاضا کرتی ہو۔ مگر یہ اس امر سے مانع نہیں ہے کہ کبھی کبھی بعض ولاۃ وامراء شرعی قواعد وضوابط سے خروج کے بھی مرتکب ہوا کرتے تھے۔[1] جزیرہ میں آنے والے غلے کے حجم اور کل حکومتی آمدن میں اس کے تناسب کی تحدید کرنا دشوار امر ہے۔ البتہ بعض اشارات جزیہ میں آنے والی اشیاء کے بھاری حجم پر دلالت کرتے ہیں۔ اس دور میں دولت امویہ نے بہت سارے شہروں میں اسلام کی نشر واشاعت کرنا اور پھر انہیں فتح کر کے وہاں کے ان شہریوں پر جو اسلام قبول کرنے سے انکاری تھے ان پر جزیہ عائد کرنا جیسے حوالہ جات سے دولت امویہ کا عظیم کردار رہا ہے۔[2]

[1] التطور الاقتصادی فی العصر الاموی، ص: ۶۸۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تاریخ بلاد الشام الاقتصادی فی العصر الاموی، ص: ۲۹۴. [2] التطور الاقتصادی فی العصر الاموی، ص: ۷۱

۳۔ خراج:

حکومت کے ذرائع آمدن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وضع کردہ نظم سے دولت امویہ نے بھرپور استفادہ کیا، حکومت کے زیادہ تر صوبوں میں اسی نظم کی پیروی کی جاتی تھی بجز چند تبدیلیوں کے جن کا آگے چل کر ذکر آئے گا۔[3] خراج کا ایک خاص مفہوم ہے، اور وہ ہے: ان اراضی کی پیداوار جنہیں مسلمانوں نے بزور بازو فتح کیا اور حکمران نے مسلمانوں کی مصالح کی خاطر اسے ہمیشہ کے لیے وقف کر دیا۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق اور شام کی اراضی کے ساتھ کیا تھا۔[4] ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خراج کو اجارہ اور قیمت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، وہ بنفسہ اصل ثابت ہے اسے کسی دوسری چیز پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔[5] دولت امویہ کے لیے خراج بڑی اہمیت کا حامل تھا، بطور مثال عبید اللہ کے زمانے (۶۶-۵۴ھ) میں سواد عراق کے خراج کی آمدن ایک سو پینتیس ملین درہم تھی۔[6] جہاں تک علاقہ جزیرہ اور شام کا تعلق ہے تو ان میں

خراج کا نظام معاویہ ابن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کے وضع کردہ نظام کے مطابق ہی چلتا رہا۔ جنہوں نے جزیہ اور خراج کی دو صورتوں میں مختلف شہروں پر ٹیکس عائد کر رکھا تھا۔ جس کی تفصیل اس طرح سے ہے:

الف: اہل سرین پر دس لاکھ پچاس ہزار درہم۔ (تقریباً)

ب: اردن پر ساٹھ لاکھ درہم تقریباً

ج: اور فلسطین پر تقریباً ساٹھ لاکھ درہم۔[7]

اس دوران خراج کی وصولی میں بعض انحرافات دیکھنے میں آئے جن میں سے اہم تر یہ ہیں: ان اراضی پر بھی خراج عائد کر دیا گیا جو صلح کے معاہدہ کی نص کی رو سے اس سے مستثنیٰ تھیں۔[1] یہ کچھ یزید بن معاویہ کے عہد (۶۴-۶۰ھ) میں ہوا جب اس نے اردن اور فلسطین میں سامرہ[2] کی زمین پر خراج عائد کر دیا۔ بعض صوبوں میں خراج وصول کرنے کے لیے سختی برتی گئی۔ اس سے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا دور مستثنیٰ ہے اور اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔[3]

خراج جمع کرنے کے اخراجات خراج دینے والوں کے ذمہ لگانا۔ ان اخراجات میں اس کاغذ کی قیمت بھی شامل کی جاتی جس پر خراج کی مقدار لکھی جاتی تھی، ان اخراجات میں ان سٹورز کا کرایہ بھی شامل ہوتا جن میں عینی خراج کو محفوظ کیا جاتا تھا حتی کہ خراج وصول کرنے والے کی اجرت بھی ان پر ڈال دی جاتی تھی۔ مزید برآں وصولی خراج کے دیگر کئی اخراجات بھی ان لوگوں پر ڈال دیئے جاتے تھے۔[4] تحصیل محاصل کا یہ غیر منصفانہ انداز خاص طور سے صوبہ عراق میں اپنایا گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی خلافت سے قبل یہی کچھ ہوتا رہا مگر انہوں نے زمام خلافت سنبھالنے کے ساتھ ہی اس کا ابطال کر دیا جبکہ ان کی وفات کے بعد اسی طرز عمل کو دوبارہ بحال کر دیا گیا۔[5] اموی دورِ حکومت میں خراج کے لیے ایک خاص دیوان تھا جو کہ دیوان خراج کے نام سے موسوم تھا جس کی ذمہ داری خراج وصول کرنا، اسے جمع کرنا، اس کا ریکارڈ رکھنا اور اس کی مقدار کا تعین کرنا تھا اور یہ اس لیے کہ خراج حکومتی آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔[6] اموی حکمرانوں نے خراج جمع کرنے کے لیے مسؤلین کا الگ سے تعین کر رکھا تھا۔ مختلف مصادر نے ان لوگوں کے نام گنوائے ہیں جو خراج وصول کرنے اور اسے جمع کرنے کے ذمہ دار تھے اور جو دیوان خراج کی کارکردگی پر نظر رکھتے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کے خراج پر سرجون بن منصور،[7] فلسطین کے خراج پر سلیمان مشجعی[8] اور حمص کے خراج پر ابن اثال نصرانی[9] کو متعین کر رکھا تھا۔ سرجون بن منصور، یزید بن معاویہ کے عہد حکومت نیز معاویہ ثانی، مروان بن حکم اور عبد الملک کے ادوار میں بھی اسی منصب پر کام کرتا رہا آخر عبد الملک نے اپنی حکومت کے آخری دنوں میں اسے معزول کر دیا۔[10]

معاویہ رضی اللہ عنہ نے بعض صوبوں کے والیوں کو وہاں موجود ایسی وسیع و عریض زمینوں کی اصلاح کی ذمہ داری بھی تفویض کی جن کے لیے بکثرت پانی مہیا ہو سکتا تھا جس کے نتیجے میں لوگ خوشحال ہوئے اور ملکی آمدن میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا جس کا اندازہ پانچ لاکھ درہم لگایا گیا ہے۔ معاویہ رضی

اللہ عنہ ہمیشہ اس امر کے لیے کوشاں رہے کہ شہریوں کی اقتصادی حالت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے، انہیں مطمئن رکھا جائے، خراج اور اس کی وصولی کے ذمہ داروں کے حوالے سے ان کے لیے آسانیاں پیدا کی جائیں اور انہیں پر امن زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔[1]

مزید بر آں وہ یہ ٹیکس ادا کرنے والوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنے کے لیے جن عمال کا انتخاب کرتے ان کی کڑی نگرانی کرتے اور ان کی طرف سے کسی زیادتی کو برداشت نہ کرتے، چاہے وہ ان کے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں، انہوں نے اپنے بھانجے عبدالرحمن بن عبداللہ ثقفی کو اسی لیے اس عہدے سے معزول کر دیا کہ اس نے خراج کے بارے میں سختی برتی تھی۔[2] اموی دور حکومت میں بکثرت ایسے اشارے ملتے ہیں کہ وہ خراج میں غیر عرب لوگوں کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا کرتے تھے، اور یہ اس لیے کہ وہ خراج کے امور سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کا زمینوں کی آبادی میں اہم کردار رہا تھا۔[3] اس حوالے سے زیاد بن ابیہ کا کہنا تھا: خراج کے کاتبین غیر عرب اقوام کے سرکردہ لوگ ہونے چاہئیں جو کہ خراج کے امور سے بخوبی آگاہ ہیں۔[4] زیاد نے دیہاتی سرداروں کو مراعات دینے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے حوالے سے کہا تھا: دہکانوں[5] سے اچھا سلوک کیا کرو، اس لیے کہ اگر وہ خوشحال ہوں گے تو تم بھی خوشحال رہو گے۔[6]

۴۔ عشور:

اس سے مراد اندرون ملک یا بیرون ملک تجارت سے حاصل شدہ اموال ہیں، جن کی حیثیت عصر حاضر میں کسٹم محصولات جیسی ہوا کرتی تھی، انہیں ایک سرکاری ملازم وصول کیا کرتا تھا جسے "عاشر" یعنی عشور وصول کرنے والا کہا جاتا تھا۔[7] اسلام میں سب سے پہلے نظام عشور وضع کرنے والے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں، انہوں نے اسے حربی پر عشر، ذمی پر نصف عشر اور مسلمان پر ربع عشر کی نسبت سے عائد کیا[8] اور نظام مندرجہ ذیل قواعد کے مطابق اموی عہد حکومت میں بھی جاری رہا: ا: راس المال کی کم از کم حد قابل معافی تھی، جو کہ مسلمان کے لیے دو سو درہم تھی،[9] جہاں تک اس حوالے سے حربی اور ذمی کا تعلق ہے، تو اس بارے اختلاف وارد ہوا ہے۔[1]

ب: عشر سال میں صرف ایک بار وصول کیا جائے گا۔

ج: مسلمان کے چوپائے جانوروں سے عشر وصول کرنے کی شرط یہ تھی کہ وہ کھلے چرنے والے ہوں۔ د: عشور غلام، مکاتب اور مضارب سے وصول نہیں کیا جائے گا، وہ صرف مال کے مالک سے وصول کیا جاتا تھا۔[2]

ھ: تاجر سے عشر وصول کرنے کے بعد اسے رسید جاری کی جائے گی اور پھر اس کی بنیاد پر اس سے آئندہ سال عشر وصول کیا جئے گا۔[3]

و: تاجر سے نہ تو تفتیش کی جائے گی اور نہ اس پر سختی کی جائے گی۔[4]

ز: جو تاجر اس قدر قرضے کا دعویٰ کرے جس کی ادائیگی پر اس کے پاس موجود مال تجارت ختم ہو جاتا ہو تو مسلمان ہونے کی صورت میں اس کی تصدیق کی جائے گی اور شک گزرنے کی صورت میں اس سے حلف لیا جائے گا۔ (اس بارے اختلاف وارد ہے) [5] رہا ذمی تو اس کے بارے میں زیادہ صائب قول یہ ہے کہ اگر اس کے حق میں دو مسلمان گواہی دے دیں تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔[6]

ح: مسلمان کے مال سے زکوٰۃ اور عشور ایک ساتھ وصول نہیں کیے جاسکتے۔[7]

ط: اگر کوئی غیر مسلم کوئی ایسا مال لے کر گزرے جو ان کے نزدیک تو مال ہے مگر وہ مسلمانوں کے نزدیک مال نہیں ہے مثلاً شراب، خنزیر اور ان جیسی دیگر اشیاء، تو غیر مسلم اس کی قیمت کا تعین کریں گے اور پھر اس قیمت کو اس کے پاس موجود دوسرے مال تجارت کی قیمت کے ساتھ ملا کر اس سے عشور وصول کیا جائے گا۔[8] کچھ ایسے دلائل موجود ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس دور میں عشور ملکی آمدن کا بڑا اہم جز تھا۔ مثلاً جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ایک سال کے لیے عشور کی وصولی سے منع کیا تو اس کے نتیجے میں ریاستی آمدن میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں اپنا یہ حکم واپس لینا پڑا۔[9]

ثالثاً:... حکومت کی طرف سے زراعت کا اہتمام

دولت امویہ کے آغاز کے ساتھ ہی بھاری زرعی ملکیتوں کا ظہور ہو گیا تھا جو کہ اس میدان میں خلفاء اور ولاۃ کے اترنے کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے صوافی اور زرخیز مفتوحہ اراضی کو آباد کرنے میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ خاص طور سے صوبہ عراق اور اس جیسے دیگر علاقہ جات میں، اس بارے میں ان کے لیے ان کے زیر ملکیت آبی گزرگاہیں بڑی مددگار ثابت ہوئیں۔ عراق کے خراج پر متعین معاویہ رضی اللہ عنہ کے والی نے ان کے لیے زمینیں آباد کیں، اس نے ان کا پانی خشک کر کے انہیں زراعت کے قابل بنایا جن کا غلہ پانچ ملین درہم کی مالیت تک جا پہنچا۔[1] غلہ کی اس قدر پیداوار سے ان کے رقبہ کی وسعت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

معاویہ رضی اللہ عنہ ان زمینوں کی آمدن کو اپنے خصوصی اخراجات میں شامل نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے کچھ حصے کو عوام الناس کے اخراجات کے لیے بھی صرف کیا جاتا تھا۔[2] اور نہ ہی ان کے بعد ان زمینوں کو ان کے ترکہ کے طور پر تقسیم کیا گیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جس زمین کو حجاج بن یوسف نے بعد ازاں عبدالملک کے لیے آباد کیا تھا یہ وہی زمین تھی جسے معاویہ رضی اللہ عنہ نے آباد کیا تھا اور جو زیادہ پانی کی وجہ سے غیر آباد ہو گئی تھی۔[3] شرعی حوالے سے غیر آباد زمینوں کو آباد کرنا جائز ہے اور یہ زمین کی ملکیت حاصل کرنے کا ایک سبب ہے۔ اور جس کا اثبات اس بارے وارد متعدد احادیث سے ہوتا ہے اور اس میں حاکم و محکوم سب برابر ہیں۔ حاکم کے بارے میں اس حوالے سے کچھ اضافی قیود ہیں، جن میں سے اہم تر یہ ہیں: ☆ حاکم اپنی حیثیت اور اقتدار سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا وہ زمین کی آبادی کے عمل میں رعایا کے عام افراد کی طرح داخل ہو گا۔

☆ زمین کو آباد کرنے کے لیے مسلمانوں کا مال خرچ نہیں کر سکتا، وہ یہ کام اپنے خاص مال سے کرے گا۔

☆ زمین آباد کرنے کی صورت میں زمین کی ملکیت کے حصول کی وجہ سے نہ تو مسلمان افراد یا جماعت کو کوئی نقصان پہنچنا چاہیے اور نہ ذمی لوگوں کو۔[4] زمین کو آباد کرنے کی غرض سے اسے مختلف لوگوں کے حوالے کرنے کی وجہ سے بڑی بڑی زرعی ملکیتیں معرض وجود میں آئیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے دونہروں کے درمیان واقع جزیرہ اپنے بعض بھائیوں کو الاٹ کر دیا جسے بعد ازاں زیاد بن ابیہ نے دو سو درہم میں خرید کر کسی اور کے نام الاٹ کر دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑا رقبہ تھا جسے آباد کرنے کے لیے زیاد نے کئی نہریں کھدوائیں۔[5] ایک دفعہ زیاد نے دریائے ابلہ کے کنارے پر زمین کا

ثالثاً:... حکومت کی طرف سے زراعت کا اہتمام

دولت امویہ کے آغاز کے ساتھ ہی بھاری زرعی ملکیتوں کا ظہور ہو گیا تھا جو کہ اس میدان میں خلفاء اور ولاۃ کے اترنے کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے صوافی اور زرخیز مفتوحہ اراضی کو آباد کرنے میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ خاص طور سے صوبہ عراق اور اس جیسے دیگر علاقہ جات میں، اس بارے میں ان کے لیے ان کے زیر ملکیت آبی گزرگاہیں بڑی مددگار ثابت ہوئیں۔ عراق کے خراج پر متعین معاویہ رضی اللہ عنہ کے والی نے ان کے لیے زمینیں آباد کیں، اس نے ان کا پانی خشک کر کے انہیں زراعت کے قابل بنایا جن کا غلہ پانچ ملین درہم کی مالیت تک جا پہنچا۔[1]

غلہ کی اس قدر پیداوار سے ان کے رقبہ کی وسعت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ ان زمینوں کی آمدن کو اپنے خصوصی اخراجات میں شامل نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے کچھ حصے کو عوام الناس کے اخراجات کے لیے بھی صرف کیا جاتا تھا۔[2] اور نہ ہی ان کے بعد ان زمینوں کو ان کے ترکہ کے طور پر تقسیم کیا گیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جس زمین کو حجاج بن یوسف نے بعد ازاں عبد الملک کے لیے آباد کیا تھا یہ وہی زمین تھی جسے معاویہ رضی اللہ عنہ نے آباد کیا تھا اور جو زیادہ پانی کی وجہ سے غیر آباد ہو گئی تھی۔[3] شرعی حوالے سے غیر آباد زمینوں کو آباد کرنا جائز ہے اور یہ زمین کی ملکیت حاصل کرنے کا ایک سبب ہے۔ اور جس کا اثبات اس بارے وارد متعدد احادیث سے ہوتا ہے اور اس میں حاکم و محکوم سب برابر ہیں۔ حاکم کے بارے میں اس حوالے سے کچھ اضافی قیود ہیں، جن میں سے اہم تر یہ ہیں:

☆ حاکم اپنی حیثیت اور اقتدار سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا وہ زمین کی آبادی کے عمل میں رعایا کے عام افراد کی طرح داخل ہو گا۔

☆ زمین کو آباد کرنے کے لیے مسلمانوں کا مال خرچ نہیں کر سکتا، وہ یہ کام اپنے خاص مال سے کرے گا۔

☆ زمین آباد کرنے کی صورت میں زمین کی ملکیت کے حصول کی وجہ سے نہ تو مسلمان افراد یا جماعت کو کوئی نقصان پہنچنا چاہیے اور نہ ذمی لوگوں کو۔[4] زمین کو آباد کرنے کی غرض سے اسے مختلف لوگوں کے حوالے کرنے کی وجہ سے بڑی بڑی زرعی ملکیتیں معرض وجود میں آئیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے دونہروں کے درمیان واقع جزیرہ اپنے بعض بھائیوں کو الاٹ کر دیا جسے بعد ازاں زیاد بن ابیہ نے دو سو درہم میں خرید کر کسی اور کے نام الاٹ کر دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑا رقبہ تھا جسے آباد کرنے کے لیے زیاد نے کئی نہریں کھدوائیں۔[5] ایک دفعہ زیاد نے دریائے ابلہ کے کنارے پر زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ اراضی کسی کے نام الاٹ کیا اور پھر اسے سیراب کرنے کے لیے ایک نہر کھدوائی، اسی طرح اس نے اپنی ہر

بیٹی کو ساٹھ ساٹھ جریب زمین الاٹ کی۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد ان زرعی ملکیتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا، یہ زرعی زمینیں صرف اموی خاندان کے لوگوں کو ہی الاٹ نہیں کی جاتی تھیں اگرچہ غالب اکثریت انہی لوگوں کی تھی[2] بلکہ رعایا کے عام لوگوں کو بھی یہ سہولت حاصل تھی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ زیاد جس کسی کو زرعی زمین کا قطعہ اراضی الاٹ کرتا اسے دو سال تک اس کے پاس رہنے دیتا اس دوران اگر وہ اسے آباد کر لیتا تو ٹھیک ورنہ اس سے واپس لے کر کسی اور کو دے دیتا۔[3] ان قطعات اراضی کی ساخت ساٹھ سے سو جریب کے درمیان تھی[4] اور ان زمینوں کے بڑے بڑے مالک یا تو اموی خاندان کے لوگ تھے یا ان کا تعلق اشراف قریش کے ساتھ تھا۔ حکومت اراضی الاٹ کرنے کے لیے ایسے مال دار لوگوں کو تلاش کرتی جو ان پر خرچ کر کے ان سے پیداوار حاصل کر سکیں، مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا بہت بڑی ملکی دولت معاشرے کے چند ہاتھوں میں آ گئی۔[5] اموی دور حکومت میں عمومی طور سے زراعت کا انحصار نہری پانی پر تھا یہی وجہ ہے کہ زرعی پیداوار کے رئیسی مراکز عراق، مصر اور شام تھے، خصوصاً نہروں کے آس پاس کے علاقہ جات۔[6] بنو امیہ کے دور حکومت میں زرعی ترقی میں پرائیویٹ الاٹمنٹ کا بڑا اہم کردار تھا جس سے وسیع و عریض زمینی رقبے کو قابل کاشت بنایا گیا، اسی کی مثال وہ نشیبی زمینیں ہیں جو فارسیوں کے عہد سے اموی دور حکومت کے آغاز تک پانی میں ڈوبی رہتی تھیں۔ اموی حکمرانوں نے انہیں قابل کاشت بنانے کے لیے ان کا پانی روک کر انہیں خشک کرنے کی تحریک کا آغاز کیا جس کی وجہ سے بکثرت اناج پیدا کرنے والی وسیع اور زرخیز زمینیں میسر آئیں۔[7] زرعی ملکیتوں میں اضافہ ہوا تو زرعی پیداوار میں بھی اضافہ دیکھنے میں آیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آبپاشی کے مرکز سے بہت دور زمینیں معرض وجود میں آ گئیں اور جنہیں سیراب کرنے کے لیے ماہرانہ انداز میں متعدد بڑی اور چھوٹی نہریں کھودی گئیں جس سے زرعی پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا،[8] مگر زرعی زمینوں کی الاٹمنٹ کا کام دولت امویہ کے مشرقی علاقہ میں ناکامی سے دوچار ہوا جس کے چند عوامل یہ تھے:

ا۔ سیاسی اضطراب:

علاقہ میں سیاسی اضطراب اور امن و امان کے فقدان کا اثر زرعی پیداوار پر پڑنا یقینی تھا جس کا آغاز یزید بن معاویہ، معاویہ ثانی اور مروان بن حکم کی آمد کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔

[1] معجم البلدان: ۴۳۵/۱۔ التطور الاقتصادی، ص: ۱۸۰. [2] ارض الصوافی، مصری، ص: ۱۲۲. [3] تطویر نظام ملکیة الاراضی، محمد علی، ص: ۱۹۰۱۹۱. [4] التطور الاقتصادی فی العصر الاموی، ص: ۱۸۸. [5] تطویر نظام ملیکة الاراضی، محمد علی، ص: ۱۹۰۱۹۱. [6] التطور الاقتصادی فی العصر الاموی، ص: ۱۸۸. [7] التطور الاقتصادی فی العصر الاموی، ص: ۱۹۰. [8] الادارة فی العصر الاموی، ص: ۱۵۱.

۲۔چند لوگوں کے ہاتھوں میں مال و دولت کا ارتکاز:

وہ اس طرح کے علاقہ میں رہائش پذیر زیادہ تر لوگ موالی تھے،[1] جس کی وجہ سے علاقہ میں سرمائے کی گردش کمزور پڑ گئی جس کی وجہ سے سامانِ تجارت کے تبادلہ کی تحریک بھی کمزور پڑ گئی اور یوں پورا علاقہ کساد بازاری کا شکار ہو گیا۔

۳۔نیروز اور مہرجان کے ٹیکس کا اعادہ:

اس کے بارے میں مروی ہے کہ اس کا معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کے عہد حکومت سے آغاز ہوا تھا۔[2] اس کے اعادہ کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ اسلام نے اس قسم کی تقریبات سے منع کر رکھا تھا مگر لوگ اس کے عادی ہو چکے تھے۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ کا ارادہ تھا کہ اسے ان غیر مسلم دہکانوں سے وصول کیا جائے جو محاصل وصول کرنے کے ذمہ دار تھے تاکہ وہ مالی طور سے مضبوط ہو کر دولت اسلامیہ کے خلاف کارروائیاں کرنے کی پوزیشن میں نہ آجائیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اسے امت اسلامیہ کی مصالح کے لیے خرچ کیا کرتے تھے، مگر ان کے بعد دہکانوں اور مقامی امراء پر متعدد نئے ٹیکس لگا دیئے گئے۔[4] جن کی وجہ سے مزارعوں پر بھاری بوجھ ڈال دیا گیا مزید براں ان کی وصولی کے لیے ان پر سختی بھی روا رکھی جاتی تھی۔[5]

۴۔زرعی منصوبہ جات کو سیاسی دباؤ میں رکھنا:

حکومت کی طرف سے اپنے سیاسی مخالفین کے ساتھ جنگ و جدال کی وجہ سے اس کے زرعی منصوبہ جات تباہی سے دوچار ہو گئے جس کے حکومت کی اقتصادی حالت پر بڑے منفی نتائج مرتب ہوئے، مثلاً حجاج بن یوسف نے بعض لوگوں کے خلاف سیاسی بنیادوں پر کارروائی کرتے ہوئے ان کی زرعی زمینوں کو زیر آب آنے سے نہ بچایا جس کی وجہ سے وہ بنجر ہو گئیں۔[6]

۵۔مہاجرین کا بوجھ:

دولت امویہ کو آغاز کار میں عراق آنے والے مہاجرین کا بوجھ اٹھانا پڑا، یہ لوگ بے روزگار تھے یہ لوگ سرکاری دفتر میں عطیات کے لیے رجسٹرڈ بھی نہیں تھے اور نہ ہی ان کے پاس قابل کاشت زمینیں تھیں جن میں وہ کھیتی باڑی کر کے گزر بسر کر سکیں، بجائے اس کے کہ وہ کسی دوسرے میدان عمل میں کچھ کرتے انہوں نے آب پاشی کے نظام میں دخل اندازی کرتے ہوئے اس میں شگاف ڈال دیئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کھیتیاں غرقاب ہو گئیں۔ زیاد عراق کی ولایت سنبھالنے کے بعد تخریب کاری کی اس جیسی کارروائیوں کو بمشکل ختم کر سکا۔[7]

[1]الخراج و النظم، ریس، ص: ۲۱۹۔ الاصطلاحات الاجتماعیة و الاقتصادیة فی الدولة الاموية، ص: ۷۱. [2] الادارة فی العصر الاموی، ص: ۲۴۷. [3] مقدمه فی التاریخ الاقتصادی العربی للدوری، ص: ۲۷. [4] تاریخ بلاد الشام الاقتصادی، عاطف رجال، ص: ۱۳۵. [5] التنظیم الاقتصادی فی صدر الاسلام، ص: ۸۲. [6] تاریخ بلاد الشام الاقتصادی فی العصر الاموی، ص: ۱۳۶. [7] الزراعات المادية، حسین مروه: ۴۷۶/۱۔ تاریخ بلاد الشام الاقتصادی.

٦۔ دیہات سے شہروں کو ہجرت کرنے والے مزارعین اور دولت امویہ کے درمیان فوجی ٹکراؤ:

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب والی عراق حجاج بن یوسف نے طاقت کے بل بوتے پر انہیں ان کی اراضی میں واپس لوٹانے کی کوشش کی اور ان پر جزیہ عائد کر دیا تو وہ بنو امیہ کے باغی ابن الاشعث کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔[1] مگر اس کے ساتھ ساتھ اس مدت کے دوران کچھ ایسے منصوبے بھی وضع کیے گئے جن کی وجہ سے علاقے میں زرعی انحطاط کی شدت میں کمی واقع ہوئی، جن میں قابل ذکر یہ ہیں:

ا: زیاد بن ابیہ نے کوفہ کو سیلابی ریلوں سے بچانے کے لیے ایک پل تعمیر کیا جس کی وجہ سے پانی میں غرقاب زمینوں کو نئے سرے سے قابل کاشت بنایا گیا، اس پل کی اہمیت کے پیش نظر اموی دورِ حکومت کے بعض امراء وولاۃ اس کی نگہداشت کرتے رہے۔[2]

ب: زرعی کارکنوں کو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں منتقل کیے جانے کا عمل جاری کیا گیا جس کا مقصد اس علاقہ میں زرعی پیداوار میں اضافہ کرنا تھا، مثلاً:

☆ زیاد بن ابیہ نے زرعی تجربہ رکھنے والے پچاس ہزار خاندانوں کو کوفہ اور بصرہ سے خراسان اس مقصد کے لیے منتقل کیا تاکہ وہ اسے آباد کر سکیں۔[3] دولت امویہ آب پاشی کے بڑے بڑے ذرائع قائم کرنے کا فریضہ سرانجام دینے سے غافل نہیں تھی اس کے لیے کنویں کھودے گئے، نہریں نکالی گئیں، سیلابی شگاف بند کیے گئے اور کئی ڈیمز تعمیر کیے گئے۔ رہے مالکان اراضی تو وہ بھی کبھی کبھار ان کاموں میں ان کے ساتھ شراکت کیا کرتے تھے۔ اندرون مملکت آب پاشی کے وسائل قائم کرنا حکمرانوں ہی کی ذمہ داری تھی[4]

اور وہ اس سے عہدہ برآ بھی ہوئے۔ اموی حکمرانوں نے امکانی حد تک اراضی سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے زرعی اراضی کے رقبہ میں اضافہ کیا، ان کی اصلاح کی گئی، پانی سٹور کیا گیا اور انہیں سیراب کرنے کے وسائل مہیا کیے گئے۔[5]

یہاں تک کہ امویوں کے صحرائی محلات بھی زرعی پیداوار بڑھانے کے مراکز تھے۔[6] خود خلیفہ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما زراعت کو ترقی دینے اور زرعی پیداوار کا معیار بہتر بنانے میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ آب پاشی کے وسائل کو ترقی دیتے، زمینوں کو زرخیز بنانے پر اپنی توجہ مبذول کرتے اور اس کے لیے مقامی لوگوں میں سے تجربہ کار لوگوں کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے۔[7] یزید بن معاویہ کو تو مہندس (انجینئر) کے لقب سے ملقب کیا گیا تھا اس لیے کہ اسے زرعی امور میں گہرا تجربہ حاصل تھا اور اسے آب پاشی کے نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کا شوق دامن گیر رہتا۔ اس نے اپنے نام سے موسوم نہر یزید کھدوانے کا حکم دیا اور پھر اسے مزید چوڑا اور گہرا کیا جس وجہ سے اس میں پانی کی گنجائش پہلے سے کہیں بڑھ گئی اور اس طرح وہ غوطہ میں وسیع وعریض اراضی کو سیراب کرنے کے لیے کافی ہو گئی۔

[1] الخراج و النظم، ریس، ص: ۲۱۹۔ الاصطلاحات الاجتماعیة و الاقتصادیة فی الدولة الاموية، ص: ۱۷. [2] الادارة فی العصر الاموی، ص: ۲۴۷. [3] مقدمه فی التاریخ الاقتصادی العربی للدوری، ص: ۲۷. [4] تاریخ بلاد الشام الاقتصادی، عاطف رجال، ص: ۱۳۵. [5] التنظیم الاقتصادی فی صدر الاسلام، ص: ۸۲. [6] تاریخ بلاد الشام الاقتصادی فی العصر الاموی، ص: ۱۳۶. [7] النزاعات المادیة، حسین مروه: ۱/۴۷۶۔ تاریخ بلاد الشام الاقتصادی.

مزید برآں اس سے مزارعین کو اپنی بعض متروکہ اراضی کی اصلاح اور ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع میسر آیا۔[2] بلاد شام میں زیادہ تر اراضی کو بارش کے پانی سے سیر اب کیا جاتا تھا اور ان کا دار و مدار بھی اسی پانی پر تھا، مگر بہت زیادہ زمین کو نہروں اور چشموں کے پانی سے بھی سیر اب کیا جاتا۔[3] جبکہ بعض اونچی زمینوں کو ایسے آلات کے ذریعے سے سیر اب کیا جاتا جو نیچے بہنے والی نہروں کا پانی اٹھا کر ان زمینوں میں پھینکتے یا کنووں اور ٹینکیوں سے پانی اٹھا کر بالائی زمینوں میں پھینکتے اور یوں شام کے گوشے گوشے میں بہت سارے زرعی رقبے کو سیر اب کیا جاتا۔[4]

اس علاقے میں وافر مقدار میں پیدا ہونے والی اشیاء میں سے مندرجہ ذیل سر فہرست تھیں: گندم، جو، چاول، زیتون، انگور، انجیر، کھجور، کپاس، گنا، پھل اور سبزیاں وغیرہ۔[5]

رابعاً:...اندرونی اور بیرونی تجارت

دولت امویہ ایک طرف مشرقِ اقصیٰ کے ممالک جیسے چین، ہندوستان وغیرہ اور دوسری طرف بیزنطی حکومت کے درمیان واقع تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے کے پیمانوں کے مطابق اس کے ان حکومتوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم ہو گئے۔[6] معاویہ رضی اللہ عنہ کے منصب خلافت سنبھالنے کے بعد ملک میں استحکام آگیا اور گزشتہ کی طرح اندرونی تجارتی سرگرمیاں شروع ہو گئیں، معاویہ رضی اللہ عنہ نے تاجروں کو مراعات دینے اور تجارتی حجم میں اضافہ کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ اہل شام نے تجارت کے پیشہ میں نمایاں مقام حاصل کیا اور مغربی یورپ کے ساتھ تجارتی روابط استوار کر لیے، اس کے لیے انہوں نے اسلامی بحری بیڑے سے بھرپور فائدہ اٹھایا، ان ایام میں جن عوامل نے تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دیا ان میں سرمائے کی بہتات سر فہرست ہے یہ سرمایہ حکمران طبقہ اور ان کے حاشیہ برداروں کی ملکیت تھا اور یہ وہ لوگ تھے جو کہ شان و شوکت اور آسودگی و خوشحالی کے دلدادہ تھے، لہٰذا ان میں سامان تعیش کے حصول کا رجحان اور اس کی ضرورت قدرتی امر تھا جس کی وجہ سے وہ گراں قیمت تجارتی سامان خریدنے میں دلچسپی لینے لگے، جس سے تاجر پیشہ لوگوں کی کارکردگی اور تجارت کے فروغ میں مزید اضافہ ہوا۔[1] امویوں نے تجارت کی دنیا میں بڑا اہم کردار ادا کیا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ خلیفۃ الاسلام معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا شمار قریش مکہ کے بڑے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا، مزید براں جب معاویہ رضی اللہ عنہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شام کے والی تھے تو وہ اپنے تجارتی قافلوں کو شام سے جزیرہ عربیہ کے پایہ تخت بھیجا کرتے تھے۔[2] اموی دورِ حکومت میں تاجروں کو نمایاں معاشرتی مقام و مرتبہ حاصل تھا، انہوں نے تجارتی کارکردگی کو موثر بنانے کے لیے کئی تجارتی کمپنیاں قائم کر رکھی تھیں جن میں وہ سرمایہ بھی لگاتے اور عملی کردار بھی ادا کرتے۔ ان میں سے کئی لوگ مضاربت کے اصول پر کاروبار کیا کرتے تھے۔[3] اس دور میں مضاربہ کمپنیوں نے خوب ترقی کی اور تجارتی عمل میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔[4] نئی کروٹ لینے والے سیاسی ظروف و حالات کی وجہ سے دار الحکومت دمشق کو اہم تجارتی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جو کہ مشرقی تجارت کا مرکز تھا اور جہاں سے مختلف علاقوں میں تجارتی سامان کی ترسیل ہوتی تھی۔[5] دمشق کی اسی اہمیت کی وجہ سے اس کی کمرشل مختلف قسم کے تجارتی سامان سے بھری رہتیں جس میں مقامی طور پر تیار کردہ سامان بھی ہوتا اور بیرون ملک سے درآمد کردہ بھی، یاقوت حموی رقمطراز ہے: دمشق کے بازاروں میں کسی بھی طلب کردہ چیز کا غیر موجود ہونا ممکن نہیں تھا۔ یہاں تک کہ متمدن دنیا سے درآمد کردہ مہنگا ترین سامان بھی دمشق میں موجود ہوتا تھا۔[6] صرف اسی پر بس نہیں، دمشق اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے بادیہ نشینوں کے لیے بھی اہم تجارتی مرکز تھا جہاں خرید و فروخت کے لیے بادیہ

نشین اور صحراء میں مقیم لوگوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔[7] شام کے دیگر شہر مثلاً حلب، رصافہ، حمص، رملہ، قدس اور انطاکیہ بھی اپنی تجارتی اہمیت کی بنا پر بڑی شہرت کے حامل تھے۔[8] یہ درست ہے کہ کوفہ، بصرہ، موصل اور نجد و حجاز کے کئی شہروں میں بھی تجارتی سرگرمیاں جاری تھیں مگر اس حوالے سے شام کے شہر بہت آگے تھے ان کی حیثیت بڑے اور اہم تجارتی مراکز کی تھی، علاوہ ازیں اس کے بعض شہروں میں جو موسمی بازار لگتے تھے ان میں بھی مختلف قسم کی تجارتی اشیاء کی بکثرت خرید و فروخت ہوتی تھی جن سے شہری اور دیہاتی لوگ برابر استفادہ کیا کرتے تھے، ان موسمی منڈیوں اور بازاروں میں بصرہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جو تیس سے لے کر چالیس دنوں تک قائم رہتا، اس کے ساتھ ساتھ اذرعات کی منڈی بھی بڑی اہمیت کی حامل تھی جو کہ اموی دورِ حکومت کے بعد تک بھی منعقد ہوتی رہی۔[9] جہاں تک معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کے ادوار حکومت میں بیرونی تجارت کا تعلق ہے تو اس دوران اسے بیزنطی حکومت کے ساتھ بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ بیرونی تجارت کے اس فروغ میں متعدد عوامل نے اہم کردار ادا کیا، مثلاً:

(۱) دولت امویہ کے مشرقی علاقے میں بکثرت اضطرابات نے اگرچہ جزوی شکل میں ہی سہی دولت امویہ اور مشرقی ممالک کے درمیان تجارتی تبادلات کے حجم کو کم کر دیا تھا جس کے نتیجے میں مغرب کی طرف واقع دولت بیزنطیہ کے ساتھ اس کے تجارتی تبادلات کے حجم میں اضافہ ہو گیا۔

(۲) دولت امویہ کے پرامن حالات نے تجارتی راس المال کو کاروباری فوائد کے لیے مشرق میں بدامنی کے علاقوں سے شام منتقل کر دیا۔

(۳) تجارت کے حوالے سے یہ دونوں ممالک ایک دوسرے پر مکمل اعتماد کرتے تھے جس کی وجہ سے اس میں گرم جوشی دیکھنے میں آئی۔ اگر دولت بیزنطیہ کلی طور سے بردی اوراق پر اعتماد کرتی تھی تو دولت امویہ اندرون ملک کلی طور پر بیزنطی حکومت کی طرف سے آنے والی سونے کی کرنسی کے حجم پر اعتماد کرتی تھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد آنے والے خلفاء کے مختلف ادوار حکومت کے دوران طرفین میں تجارت کے فروغ پر دلالت کرنے والی علامات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ دولت امویہ میں سونے کے بیزنطی دنانیر کی کمیت، اندرونی لین دین کی کارروائیاں انہی کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچتی ہیں۔

ب۔ مصر میں بردی اوراق کے کارخانے عبدالملک بن مروان کے دور حکومت تک اس کی تیاری میں بیزنطی انداز ہی اختیار کیے رہے۔[1]

خامساً:... صنعت و حرفت

اموی دور حکومت میں صنعت و حرفت کا اپنے اقتصادی ماحول سے متاثر ہونا، مزید براں اس کا اموی حکومت کے اقتصادی حالات سے متاثر ہونا بھی ایک فطری امر تھا، چونکہ اس دوران زراعت کو بنیادی اور خصوصی اہمیت حاصل تھی، لہٰذا ایسی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا جو اپنے خام مال کے لیے زرعی پیداوار پر انحصار کرتی تھیں، مثلاً کپڑا سازی اور آٹا پیسنے کی صنعتیں، دولت امویہ میں عمرانی ترقی کی وجہ سے مختلف صنعتوں نے بھی خوب ترقی کی لہٰذا عمارت سازی کے لیے ضروری آلات و اشیاء کی تیاری کی صنعت خوب پھلی پھولی، علاوہ ازیں صنعت اموی دور حکومت کے دوران پائے جانے

والے عسکری احوال وظروف سے بھی متاثر ہوئی جس کی وجہ سے تجارتی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والی کشتیوں کی صنعت نے بھی ترقی کی۔[2] دولت امویہ نے اس بیزنطی جنگی بحری بیڑے کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنا جنگی بحری بیڑہ تیار کرنے میں خاصی دلچسپی دکھائی جو دولت اسلامیہ کے ساحلوں کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا تھا، کشتی سازی کی جو صنعت دولت امویہ کے آغاز میں صرف کشتی سازی تک محدود تھی وہ اس کے آخری دور میں جنگی کشتی سازی کی صنعت کے کمال کو چھونے لگی۔ صنعت ۴۹ھ تک مصر تک محدود تھی بعد ازاں معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام کے عکا نامی شہر میں کشتی سازی کا کارخانہ قائم کرنے کا حکم دیا اور اس کام کو کرنے کے لیے مصر سے تجربہ کار ماہرین منگوائے، اس میں کام آنے والی لکڑی لبنان کے پہاڑوں سے حاصل کی گئی جو کہ وہاں وافر مقدار میں موجود تھی اور جس کا حصول بھی آسان تھا۔[1] پھر اس صنعت میں مزید بہتری لانے کے لیے ۵۴ھ کے دوران مصر میں ایک نیا صنعتی زون قائم کیا گیا جسے خاص طور سے جنگی کشتیوں کی تیاری کے حوالے سے بڑی شہرت ملی۔[2] اموی حکومت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد بھی کشتی سازی کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے تسلسل کے ساتھ مصروف عمل رہی۔ جنگی کشتی سازی کے یہ علاقے لوگوں کی رہائش اور روزگار کے لیے باعث کشش ثابت ہوئے اور اس طرح یہ صنعتی ترقی اور اقتصادی خوشحالی کے مراکز میں تبدیل ہوگئے، وہاں ہوٹل تعمیر کیے گئے، گندم پیسنے کے متعدد کارخانے قائم کیے گئے، علاوہ ازیں متعدد دیگر سرگرمیاں بھی دیکھنے میں آئیں جن کی وجہ سے اس صنعت میں کئی تبدیلیاں آئیں اور وہ ترقی کے مراحل طے کرنے لگی، اس صنعت کو منظم انداز میں استوار کرنے کے لیے اس کے نگران اعلیٰ کا عہدہ قائم کیا گیا جسے اس کے نگران کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور جس کی اہم ترین ذمہ داری اس صنعت میں کام کرنے کے لیے لوہے اور لکڑی کے کام کے ماہرین اور دیگر کارکنوں اور مزدوروں کو قریبی مسلم ریاستوں اور حکومت کے دیگر صوبوں سے لاکر یہاں آباد کرنا اور ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا تھا۔ کشتی سازی میں کام آنے والی عمدہ لکڑی اور دیگر ضروری خام مال فراہم کرنا بھی اس کے ذمہ تھا، اس صنعت کے قیام کی عمدگی اس امر سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ اس میں کام کرنے والے کاریگروں اور عام کارکنوں کی مالی مراعات کی تحدید کی جاتی اور انہیں ضروری غذائی اشیاء فراہم کرنے کا بندوبست کیا جاتا، علاوہ ازیں انہیں ہر ممکن سہولیات فراہم کی جاتی حتیٰ کہ انہیں رہائش گاہیں بھی فراہم کی جاتیں اور انہیں ہر طرح کی زیادتی سے بچانے کے لیے ضروری اقدامات کیے جاتے تاکہ وہ مکمل اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرسکیں۔[3] یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اموی دور حکومت کے دوران ایک بھاری بھرکم بحری جنگی بیڑہ وجود میں آگیا۔[4]

آغاز کار میں دولت بیزنطیہ کو دولت اسلامیہ پر بحری برتری حاصل تھی، معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے کمزور کرنے اور بعد ازاں اسے بالتدریج ختم کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے۔ اموی دور حکومت جن صنعتوں کے لیے مشہور ہے ان میں تجارتی کشتیوں کی صنعت بھی قابل ذکر ہے۔ ان دنوں تجارتی کشتیاں جنگی کشتیوں سے کوئی زیادہ مختلف نہیں ہوتی تھیں مگر پھر ان کی تیاری کے لیے خوبصورت تبدیلیاں کی گئیں، ان کے سائز میں اضافہ کرنے اور انہیں جدید اور دیرپا بنانے کے لیے ان میں کیل استعمال کرنے کا حکم دیا گیا۔[1] واسط شہر میں تیار کردہ کشتیوں کو واسطیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، جہاں ایسی چھوٹی کشتیاں بھی تیار کی جاتی تھیں جو سیر وسیاحت اور واسط وبصرہ کے درمیان تجارتی سامان کی نقل وحرکت کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔[2] دولت امویہ میں مشرقی کشتیوں کی تیاری کے مراکز میں اگرچہ زیادہ تر تجارتی کشتیاں ہی تیار کی جاتی تھیں مگر وہ صرف اسی قسم کی کشتیوں کے ساتھ ہی خاص نہیں تھے بلکہ وہ تجارتی اور جنگی دونوں قسم کی کشتیوں کی تیاری کی صلاحیت رکھتے تھے۔ حجاج بن یوسف نے خلیج عربی اور بحر ہند میں فوجی قوت کے قیام میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔[3]

سادسًا:... عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں مالی اخراجات کے بارے میں شبہات

بعض مؤرخین نے عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں مالی اخراجات کے بارے میں شبہات پیدا کیے ہیں، اور ان مصارف کا ذکر کرتے ہوئے انہیں ظالمانہ اور غیر شرعی قرار دیا، وہ الزامات درج ذیل ہیں:

ا۔ بعض علاقوں کے خراج میں کمی وزیادتی اور شاہ خرچیاں:

ا: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر رشوت کے طور پر دیا گیا: متعدد روایات میں وارد ہے کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر رشوت کے طور پر دیا گیا تھا اور یہ اس لیے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی مدد کی تھی، یہ جملہ روایات واخبار معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ دشمنی پر مبنی ہیں اور جن میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ گویا ایک گھٹیا اور مشکوک سودے بازی کی وجہ سے وہ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف متفق تھے جس میں وہ دنیوی مقاصد کے حصول کے لیے اپنے رب، دین اور تاریخ کے ساتھ خیانت اور زیادتی کے مرتکب ہوئے، گویا کہ اگر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر کی گورنری نہ ملتی تو ان کے لیے اس قضیہ کے حل کے لیے اپنا تعارف پیش کرنا امر محال تھا جس کے لیے ہزاروں لوگ بیک آواز تھے اور وہ قضیہ تھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ۔ ان میں سے بعض روایات میں ان جلیل القدر اصحاب رسول کو سب وشتم بھی کیا گیا ہے اور جن سے لگتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اخروی اجر وثواب پر مصر کی گورنری کو ترجیح دی اور خود انہوں نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہا: یہی دنیا ہمارا اصل مقصود ہے۔[4] انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا: میں تمہیں اس وقت اپنا دین نہیں دوں گا جب تک تم سے تمہاری دنیا نہ لے لوں۔[5] اسی طرح ان کا یہ قول: میں تم سے مصر کے بدلے اپنا دین فروخت کر رہا ہوں۔[6] اسی طرح ان کا حضرت معاویہ سے یہ کہنا: اگر مصر اور اس کی ولایت نہ ہوتی، مجھے معلوم ہے کہ علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں اور تم باطل پر۔[7] مزید اس طرح کی اور کئی روایات۔[8] اسی طرح مسعودی اور ابن قتیبہ کی طرف منسوب کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" وغیرہ کی باطل اور موضوع روایات میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لالچی اور دنیا پرست شخص قرار دیا گیا ہے، ان موضوع، ضعیف اور سقیم روایات سے کئی مورخین اور اہل قلم حضرات نے متاثر ہو کر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو پستی میں دھکیلنے کی کوشش کی جن میں سے محمود شیت خطاب،[1]

عبد الخالق سید ابو رابیہ[2] اور عباس محمود العقاد قابل ذکر ہے۔ آخر الذکر تو معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی اس انداز سے تصویر کشی کرتے ہیں گویا کہ وہ دونوں بڑے موقع پرست اور مصلحتوں کا شکار تھے۔ اگر تمام تاریخی ناقدین عقاد کی پیش کردہ روایات کے بطلان پر اتفاق کر لیں تو انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ عقاد ان ضعیف، لالچی اور غیر معتبر روایات کو نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں: تاریخی ناقدین کچھ بھی کہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ ان دونوں (معاویہ وعمرو) کا اتفاق بادشاہت اور ولایت کے حصول کے لیے تھا، اور یہ وہ سودے بازی تھی جس سے دونوں کو حصہ ملا، اور اگر یہ کچھ نہ ہوتا تو دونوں میں اتفاق نہ ہوتا۔[3]

[1] سفراء النبی صلي الله عليه وسلم . ص: ۵۰۸. [2] عمرو بن العاص. لعبد الخالق سيد ابو رابية. ص: ۲۱۶. [3] عمرو بن العاص. عقاد. ص: ۲۳۱۲۳۲ .

مگر متعدد ایسے دلائل موجود ہیں جو ان ضعیف، موضوع اور سقیم روایات کی تردید کرتے ہیں جنہیں معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا چہرہ مسخ کرنے کے لیے بڑی پذیرائی حاصل ہوئی، ان دلائل میں چند درج ذیل ہیں:

☆ معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا تقویٰ وطہارت اور صحت اسلام معروف ومعلوم ہے، اور قبول اسلام کے بعد خدمت اسلام کے حوالے سے دونوں کی تاریخ درخشاں وتاباں ہے۔[4]

☆ معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت ورفعت کے لیے ان کے حق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا ہی کافی ہے: "یا اللہ! اسے ہادی اور مہدی بنا اور اس کے ساتھ دوسروں کو ہدایت نصیب فرما۔"[5]

☆ ان کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بھی فرمائی تھی: "یا اللہ! معاویہ کو کتاب اور حساب سکھا اور اسے عذاب سے بچا۔"[6]

☆ جہاں تک عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں ایمان کی گواہی دیتے ہوئے فرمایا تھا: "لوگ مسلمان ہوئے اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔"[7]

☆ دوسری حدیث میں ہے: "العاص کے دونوں بیٹے عمرو اور ہشام مومن ہیں۔"[8]

☆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد گرامی ہے: "عمرو صادق ہیں: اللہ کے ہاں عمرو کے لیے خیر کثیر ہے۔"[1]

☆ عمرو بن العاص نے علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے مطالبہ پر بیعت کی تھی، عمرو رضی اللہ عنہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ سے شدید طور پر متاثر ہوئے، جب انہوں نے خلیفہ مظلوم کی شہادت کی خبر سنی تو وہ روتے ہوئے پیدل ہی چل کھڑے ہوئے، اس وقت وہ کہہ رہے تھے: ہائے عثمان! ہم حیاء داری اور دین کو آپ کی موت کی خبر دیتے ہیں، یہاں تک وہ دمشق پہنچ گئے۔[2] عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا شمار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قریبی ساتھیوں، مشیروں اور دوستوں میں ہوتا تھا، وہ عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں بدون ولایت شوریٰ کے اجلاس میں شریک ہوا کرتے تھے، ان کے معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون کر کے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص اور خلیفہ شہید کا انتقام لے سکیں۔[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل ناحق سفاک مجرموں کے خلاف ان کے غیض وغضب کو تحریک دینے کے لیے کافی تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم کے خلاف دلیری دکھانے والوں سے انتقام لینے کے لیے مدینہ منورہ کے علاوہ کسی اور جگہ کا انتخاب ضروری تھا۔ آخر خلیفہ مظلوم عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے غضب ناک ہونے میں انوکھے پن والی کون سی بات ہے؟ اگر اس موضوع میں کسی کو کوئی شک ہے تو اس کا دار ومدار ان جھوٹی روایات پر ہے جو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ ان کا واحد مقصد اقتدار اور حکومت کا حصول تھا۔[4]

اسی الزام کی تردید کہ مصر عمر بن العاص کو رشوت کے طور سے دیا گیا، ابو مخنف -جو کہ گزشتہ جھوٹ کا ایک راوی ہے- کی ذکر کردہ اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنا لشکر مصر بھیجنا اور اسے علی رضی اللہ عنہ کے انصار سے چھین لینا اس امید کے پیش نظر تھا کہ اگر وہ اس پر غالب آ گئے تو علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں پر غالب آ جائیں گے اس لیے کہ مصر سے بہت زیادہ خراج حاصل ہوتا تھا۔[5] ایسے میں معاویہ رضی اللہ عنہ یہ سارا خراج عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے حوالے کیسے کر سکتے تھے جبکہ خود انہیں اس کی شدید ضرورت تھی؟ یاد رہے کہ اس حملہ کے قائد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تھے۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے منصب خلافت سنبھالنے کے بعد مصر کے خراج پر اپنے عامل وردان کو لکھا کہ ہر قبطی سے ایک قیراط مزید خراج وصول کیا جائے۔ جس کے جواب میں وردان نے لکھا کہ میں ان کے خراج میں کس طرح اضافہ کر سکتا ہوں جبکہ ان کے ساتھ کیا گیا معاہدہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔[6]

۲۔ لوگوں کے دل جیتنے اور اپنے حمایتی پیدا کرنے کے لیے مال خرچ کرنے میں وسعت:

معاویہ رضی اللہ عنہ نے اشراف و زعماء کے دل جیتنے اور دولت اسلامیہ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے بھاری رقوم خرچ کیں، ان کی رائے میں بہت سے مسلمانوں کا خون بہانے سے کچھ مال خرچ کرنا بہتر ہے۔ ان لوگوں کو مالی طور پر نوازنے کا مقصد ان کے اور ان کے اتباع و انصار کے دلوں کو جیتنا، ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کرنا اور ان کے متعلقین کی ضروریات کو پورا کرنا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد مؤلفۃ القلوب کو دین کی طرف مائل کرنے اور ان کے دلوں سے نفرت و کدورت کو ختم کرنے کے لیے جو بھاری بھر کم عطیات دیئے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے یہ سمجھا کہ اس قسم کے لوگوں کے دل جیتنے کے لیے انہیں مال دینا جائز ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنو امیہ کے نزدیک دین اور دولت کے لیے دوستی دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ یہ ایک ہی چیز ہے اور یہ اس لیے کہ ان کے اعتقاد میں ان کی حکومت کا مقصد دین کی نصرت اور حاملین دین میں وحدت و یگانگت پیدا کرنا تھا۔[2] اور جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں اگر معاویہ رضی اللہ عنہ اس بارے میں غلطی پر تھے تو آپ ان عظیم القدر لوگوں کے بارے میں کیا کہیں گے جنہوں نے ان سے عطیات اور انعامات وصول کیے۔ جبکہ ان میں ان لوگوں کے نام بھی آتے ہیں جو تقویٰ و پرہیز گاری اور خشیت الٰہی میں بڑی شہرت رکھتے ہیں؟ ہمارا یہ کہنا مبنی بر حقیقت ہے کہ اس دور کا اسلامی معاشرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدین کے زمانے سے بہت مختلف تھا۔ یہاں تک کہ اس کی بعض سیاسی کارگزاریاں عطیات میں فرق ملحوظ رکھنے کا اپنا حق سمجھتی تھیں۔[3]

۳۔ امویوں کے شاہانہ طرزِ زندگی:

امویوں کی خوشحالی اور ان کی شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ ہمارے مورخین کا بڑا پسندیدہ موضوع رہی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ رہائش، لباس، عطیات اور اخراجات کے حوالوں سے ان پر شاہانہ انداز زیست کا رنگ نمایاں تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے والی تھے اس دوران جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے تو وہ ایک بھاری بھر کم جلوس کے ساتھ صبح و شام ان کے ساتھ رہتے جس کا خلیفۃ المسلمین نے نوٹس لیا تو انہوں نے اس

کا جواز بھی پیش کیا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمیں امویوں کی زندگی کو اس وقت کے عربی اور اسلامی معاشرے سے الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہیے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا ضروری تھا اور ایسا ہوا بھی۔ اسی دور میں سماجی ترقی کا عمل تسلسل سے جاری تھا۔ مال داری، خوشحالی اور جائز طریقہ سے ان سے لطف اندوز ہونے کی رغبت اس قدر عام ہو چکی تھی کہ کیا حاکم اور کیا محکوم سبھی مزید سے مزید کی جستجو میں سرگرداں تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ کے زہد اور ان کے لباس کی بوسیدگی[1] اور ان کے عامل زیاد اور اس کے پیوند لگے کپڑوں[2] کے بارے میں وارد تاکیدی روایات و اخبار کا انکار بھی ممکن نہیں۔ حکمران طبقہ کے شاہانہ لباس اور ان روایات میں کوئی تناقض بھی نہیں بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفوس عالیہ نہ تو زہد و ورع کو نقص خیال کرتی ہیں اور نہ ہی دنیوی نعمتوں کو حرام۔[3] اسی طرح اگر ہم ہمہ گیر نظروں سے اس دور کے مالی اخراجات کا جائزہ لیں تو ہمیں خوشحالی کے یہ مظاہر بنو امیہ اور ان کے خلفاء و امراء میں ہی نظر نہیں آئیں گے بلکہ بنو ہاشم، بنو زبیر وغیرہ کے بعض لوگ جن کا امویوں کے مخالفین و معارضین میں شمار ہوتا ہے وہ بھی بنو امیہ سے کم خرچ نہ تھے۔[4]

اگر بنو امیہ نے محلات تعمیر کیے تھے تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے اشراف عرب میں سے کتنے ہی لوگوں نے بڑے عالیشان اور قابل ذکر محلات تعمیر کیے تھے۔ عرب لوگ اسے باعث عزت خیال کرتے، اس پر فخر کرتے اور اپنے معززین میں سے ہر شخص سے اس کی توقع رکھتے تھے اگرچہ وہ کسی حکومتی منصب پر فائز نہ ہی ہوں۔[5] مالی اخراجات میں امویوں کے اس طرز عمل کی وجہ سے ہر طرف آسائش و خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ پھر امت میں اس کی جڑیں مزید گہری ہوئیں تو اس نے تباہ کن صورت حال اختیار کر لی جس کا نتیجہ صلیبیوں کے ہاتھوں بلاد شام، تاتاریوں کے ہاتھوں سقوط بغداد اور دولت عباسیہ کے زوال کی صورت میں سامنے آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام آسائش و تعیش کو ناپسند کرتا اور اس سے خبردار کرتا ہے:

﴿وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝﴾ (الاسراء: ۱۶)

"اور جب ہم کسی بستی کی ہلاکت کا ارادہ کر لیتے ہیں تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس بستی میں کھلی نافرمانی کرتے ہیں تو ان پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی نسبتاً مال و اسباب کی بہتات تھی مگر انہوں نے اسے وجہ فساد نہیں بننے دیا تھا، اس کے سدباب کے طور پر انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ منورہ سے نکل کر زمینوں پر جانے اور کاروبار کرنے سے روک دیا تاکہ اس طرح ان کے ہاتھوں میں زیادہ مال آنے کی وجہ سے غربت و امارت کے مابین کوئی حد فاصل کھڑی نہ ہونے پائے اور معاشرے میں بگاڑ پیدا نہ ہو سکے، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مال و اسباب کے حوالے سے اپنے اور اپنے اہل خانہ کے بارے میں سخت پالیسی اختیار کی تاکہ وہ رعایا کے لیے برا نمونہ نہ بنیں اور لوگ ان کے نقش قدم پر چل کر تباہی سے دوچار نہ ہو جائیں۔ اگر حکمران کی طرف سے مال و زر کمانے اور اسے خرچ کرنے کے بارے میں ضروری حدود و قیود وضع نہ کی جائیں اور پھر ان کی پاسداری نہ کی جائے تو پھر سنت الٰہیہ کے مطابق اس کے طے شدہ نتائج کا سامنے آنا ضروری ہوتا ہے اور یہ اس لیے نہیں ہے کہ مال فی حد ذاتہ کوئی بری شے ہے بلکہ اس لیے کہ اس کے مثبت نتائج اخذ کرنے کے لیے جن انسانی کوششوں کی ضرورت تھی ان کے حوالے سے کوتاہی کا ارتکاب کیا گیا، یاد رہے کہ مال کی آفت آسائش و تعیش ہے اور اس کا علاج حکمرانوں کے ہاتھ میں ہے، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے میں

سنجیدگی کو پروان چڑھائیں اور اس کے لیے اپنی ذات کو بہترین نمونہ کے طور پر پیش کریں۔ اگر مال وزر کو بغیر کسی ضابطہ کے لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جائے اور کسی سے کسی چیز کے بارے باز پرس نہ کی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کے اخلاق و کردار کو تباہ کرنے کے لیے کچھ قوتیں بھی بڑی متحرک ہوں تو پھر اس نتیجہ کا انتظار کیا جائے جسے سنت ربانیہ ضروری قرار دیتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝﴾ (الروم: ۴۱)

''خشکی اور تری میں لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث فساد پھیل گیا اس لیے کہ انہیں ان کے بعض کرتوتوں کا پھل اللہ چکھا دے ممکن ہے کہ وہ باز آ جائیں۔'' مال وزر کی بہتات ایک متعدی آفت ہے اور اگر اس کا علاج نہ کیا جائے اور اسے آگے بڑھنے سے نہ روکا جائے تو اس کا پھیلتے چلے جانا یقینی ہے، پھر جب اس کا آغاز خلافت کے محلات سے ہو تو معاملہ مزید سنگین ہو جاتا ہے، اس لیے کہ حکام لوگوں کے لیے نمونہ ہوا کرتے ہیں۔ اگرچہ اموی بڑے خوشحال تھے مگر ان کا مالی فساد عباسیوں سے بہت کم تھا اس لیے کہ وہ ایک طرف اپنی حکومت کے استحکام میں زیادہ مصروف رہے اور دوسری طرف جہاد فی سبیل اللہ میں لگے رہے۔ عباسی، تو ان کے ہاتھ حکومت آنے کے بعد ان میں خوشحالی بڑی سرعت کے ساتھ سرایت کرنے لگی اور پھر خلافت کے محلات سے نکل کر امراء و وزراء کے محلات تک اور پھر وہاں سے ہوتی ہوئی ان کے تاجروں کے محلات تک جا پہنچی جن کی عالمی تجارت میں آمدن کئی ملین دینار تھی۔ آہستہ آہستہ اس فساد نے پہلے دار الخلافہ بغداد کو اور پھر دیگر اسلامی دار الحکومتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔[1]

چھٹی بحث:

عہد معاویہ رضی اللہ عنہ اور دولت امویہ کا عدالتی نظام

عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کے نظام قضاء کے بعد عہد اموی میں نظام قضاء تیسرے درجہ میں آتا ہے۔ اس لیے کہ اموی دور حکومت میں عہد خلافت راشدہ کے آثار بکثرت موجود تھے اور اس کے بہت سارے اعمال خلافت راشدہ کے دور کا تسلسل تھے۔ خاص طور پر فتوحات اسلامیہ، مشرق و مغرب میں دعوت اسلام کی اشاعت، اللہ کے دین میں لوگوں کی گروہ در گروہ شمولیت اور اسلامی تہذیب کی ترقی کے حوالوں سے۔[1]

اولًا:... عہد اموی کا عہد راشدہ سے تعلق

اموی دور حکومت اور خاص طور سے معاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت کئی حوالوں سے عہد خلافت راشدہ کا تسلسل تھا۔ اموی دور حکومت تک بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بقید حیات تھے، اور علم، فقہ اور قضاء وغیرہ میں کبار تابعین اور بعد ازاں صغار تابعین ان کے شراکت دار تھے، اسی طرح عہد خلافت راشدہ کے بعض قضاۃ عہد اموی میں بھی شعبہ قضاء سے وابستہ تھے، ان میں قاضی شریح بن حارث کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ عہد اموی میں دینی تربیت، عقیدہ کی برتری، آثار ایمان، دین سے وابستگی اور شرعی احکام کی پاسداری باقی تھی، اس دور میں ایسے مجتہدین کی بڑی تعداد معرض وجود میں آئی جو صحابہ کرام اور فقہی مذاہب کے درمیان رابطے کا کام دیتے تھے۔ اموی دور حکومت کے علماء و مجتہدین عہد عباسی میں

رونما ہوئے ائمہ مذاہب کے اساتذہ تھے۔ اس بڑی پر رونق فقہی تصویر کے اموی دورِ حکومت کے عدالتی نظام پر بڑے گہرے اور قابل تعریف اثرات مرتب ہوئے اور اجتہادی سرگرمیوں میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ مزید برآں علوم اسلامیہ کی تدوین، دوسری تہذیبوں سے استفادہ کرنے اور ہمسایہ اقوام کے علوم وثقافات کے ترجمہ کی تحریک کا آغاز ہوا۔[2]

ثانیاً:... خلفاء کا قضاء سے الگ ہونا

خلفائے راشدین لوگوں کے تنازعات واختلافات حل کرنے کے لیے خود فیصلے صادر فرمایا کرتے تھے اور اس بنا پر ان سے بہت سے فیصلوں کا صدور ہوا۔ مختلف شہروں کے امراء بھی خلیفہ وقت کے نائب ہونے کی حیثیت سے یہ فریضہ سرانجام دیا کرتے تھے، الا یہ کہ ان کے اختیارات کو محدود کر کے انہیں قضاء سے روک دیا جائے، اس صورت میں لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کے لیے ان کے ساتھ قاضیوں کا تقرر کر دیا جاتا، ان ولاۃ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام سرفہرست ہے جو عرصہ بیس سال تک شام کے والی رہے اس دوران وہ انتظامی اور عدالتی دونوں قسم کے امور نمٹاتے رہے۔[1] پھر جب انہوں نے منصب خلافت سنبھال لیا تو منصب قضاء سے الگ ہو گئے اور دار الحکومت دمشق میں قاضیوں کا تقرر کر کے عدالتی اختیارات انہیں تفویض کر دیئے۔ دیگر شہروں کے ولاۃ بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عدالتی امور سے الگ ہو گئے، اموی خلفاء نے بنو امیہ کے پورے دور حکومت میں عدالتی امور کے حوالے سے یہی طریقہ اپنائے رکھا، دولت امویہ کے دار الحکومت میں بھی اور اس کے صوبوں اور اس کے شہروں میں بھی۔ اسی دوران خلفائے بنو امیہ کا تعلق تین امور کے علاوہ اسلامی قضاء سے منقطع رہا:

۱۔ دار الحکومت دمشق میں قضاۃ کا براہ راست تقرر کرنا:...

۲۔ قضاۃ کے اعمال واحکام ان کی تقرری ومعزولی، مالی مراعات، حسن سیرت اور ان کے جاری کردہ عدالتی احکامات کی نگرانی کرنا، تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جاسکے کہ ان کے فیصلے عدل وانصاف اور حق وصداقت پر مبنی ہوں، شرع ودین سے ہم آہنگ ہوں، اور ان میں ٹھوس عدالتی رویوں کا التزام کیا گیا ہو۔

۳۔ مظالم اور احتساب کے فیصلوں پر نظر رکھنا، خلفاء بنو امیہ نے قضاء مظالم کو خاص اہمیت دے رکھی تھی اور اس کے لیے ایک کامل اور مستقل نظام وضع کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموی دورِ حکومت میں عدلیہ کو آزادانہ حیثیت حاصل تھی یہاں تک کہ وہ خلیفہ اور والی کے دباؤ سے بھی آزاد تھی جنہیں قاضی کی تقرری اور اس کی معزولی کا اختیار حاصل تھا، مگر ان کا قاضی کے اعمال، اس کے اجتہاد اور فیصلوں میں کوئی عمل دخل نہیں تھا جبکہ وہ قاضیوں کے صادر کردہ احکامات کو نافذ کرنے کے پابند تھے۔[2] نباہی فرماتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے پورے طور سے قضاء سے الگ ہو کر اسے دوسروں کے حوالے کر دیا، دیگر شہروں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی حکومت کے مرکز میں بھی قاضیوں کا تقرر کر رکھا تھا۔[3]

[1] تاریخ القضاء فی الاسلام، ص: ۱۲۶. [2] تاریخ القضاء فی الاسلام، ص: ٦٧. [3] عبقریۃ الاسلام فی اصول الحکم، ص: ۳۴۲.

ثالثاً:... قاضیوں کے لیے مالی مراعات

یہ بات سبھی کے علم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عدالت کو حکومت سے الگ کرنے میں پہل کی تھی اور انہوں نے ہی سب سے پہلے قاضیوں کی تنخواہیں مقرر کی تھیں۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ جو کہ زہد و قناعت میں بڑی شہرت رکھتے ہیں انہوں نے قاضیوں کے بارے میں مصر پر اپنے عامل سے فرمایا: انہیں اتنی مالی مراعات دو جس سے ان کی ضروریات پوری ہو سکیں اور لوگوں کے سامنے اپنی ضروریات پیش کرنے کی ضرورت نہ رہے۔[4] یہ صورت حال عہد اموی میں بھی برقرار رہی اور قاضیوں کی تنخواہیں بیت المال سے ادا کی جاتی رہیں۔[5] ان کی مقدار بہت زیادہ تھی، البتہ مختلف شہروں اور حالات وظروف کے حساب سے یہ مقدار مختلف تھی۔[6] شعبی قاضی شریح سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ماہانہ پانچ سو درہم تنخواہ وصول کرتے تھے، وہ فرمایا کرتے تھے: میں لوگوں کے لیے پورا پورا وصول کروں گا اور انہیں پورا پورا دوں گا۔ مزید فرماتے تھے: میں ان کے لیے منصب قضاء پر بیٹھتا ہوں اور ان کے لیے اپنے آپ کو پابند کرتا ہوں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے روزی نہ ملے؟ جب ۷۲ھ میں عبد الملک بن مروان ؒ نیلہ آیا تو اس نے قاضی شریح کے بارے میں معلوم کیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے عہد میں قضاء سے الگ ہو گئے تھے۔ اس نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان سے کہا: اللہ تمہیں توفیق عطا فرمائے، اپنے منصب پر واپس آجائیں۔ ہم نے آپ کے لیے دس ہزار درہم اور تین صد جریب کا حکم جاری کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ پیش کش قبول کر لی اور ۷۸ھ تک منصب قضاء پر فائز رہے۔[1] اس کے برعکس بعض قاضی حضرات قضاء کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے اور وہ اقامت شریعت کے لیے اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کے حصول کے خواستگار تھے۔ قاضی و مفتی مسروق بن اجدع (متوفی ۶۳ھ) کا شمار اسی قسم کے قاضیوں میں ہوتا ہے۔ آپ شریح سے بڑے مفتی جبکہ شریح ان سے بڑے قاضی تھے۔ مسروق کی بیوی کہتی ہیں: مسروق قضاء کی ذمہ داری ادا کرنے پر تنخواہ وصول نہیں کرتے تھے۔ قاسم فرماتے ہیں: مسروق کہا کرتے تھے: اگر میں ایک دن حق کے مطابق فیصلہ کروں تو یہ مجھے ایک سال فی سبیل اللہ دشمن کی سرحد پر موجود رہنے سے زیادہ پسند ہے۔[2]

رابعاً:... احکام کو محفوظ کرنا اور ان پر گواہ بنانا

عہد اموی میں پہلی بار قاضیوں کے صادر کردہ احکام کو رجسٹر اور دیوان محکمہ میں محفوظ کرنے کا رواج ہوا، تاکہ قاضی بوقت ضرورت ان کی طرف رجوع کر سکے اور سب سے پہلے یہ کام عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں مصر کے قاضی سلیم بن عنز تجیبی نے کیا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب میراث کی تقسیم کے سلسلے میں کچھ لوگ ان کے پاس جھگڑا لے کر آئے تو انہوں نے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا۔ وہ ایک عرصہ تک غائب رہے پھر باہم اختلاف کیا اور ان کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، پھر وہ دوبارہ ان کے پاس آئے اور ان سے دوسری دفعہ فیصلہ کروانا چاہا۔ مگر قاضی کو ان کا واقعہ یاد آ گیا۔ جب انہوں نے ان کے سامنے ساری تفصیل بیان کی تو انہوں نے اس کا اعتراف کر لیا۔ اس پر قاضی سلیم بن عنز نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ وہ عدالتی احکامات کو تحریری طور سے محفوظ بنائے، آپ نے انہیں اپنا فیصلہ لکھ کر دیا اور اس پر گواہ بنائے۔[3] کندی فرماتے ہیں: سلیم بن عنز مصر میں پہلے قاضی تھے جنہوں نے اپنے فیصلے تحریری طور پر محفوظ کیے۔[4] ہم تک پہنچنے والی معلومات کی رو سے سلیم تجیبی پہلے قاضی تھے جنہوں نے عدالتی احکامات کی توثیق اور ان سے انکار کا راستہ بند کرنے کے لیے ان پر گواہ بنائے۔ بعد ازاں عباسی دور حکومت میں اس میں مزید وسعت آ گئی۔[5]

خامسًا:... قاضیوں کے معاونین

عام طور پر قاضیوں کو ایسے معاونین کی ضرورت ہوتی ہے جو عدالتی امور کو باندازِ احسن چلانے کے لیے ان کے ساتھ تعاون کر سکیں۔ ان میں سے ایک قاضی کا سیکرٹری ہوا کرتا تھا، اس کا پہلا ظہور عہد خلافت راشدہ میں ہوا[1] اور بعد ازاں اس کا استعمال عام ہو گیا۔ عہد اموی میں زندگی کے ارتقاء اور قاضی کے اعمال میں وسعت آنے اور مقدمات کی کثرت کی وجہ سے مزید معاونین کی ضرورت پڑی، جن میں سے اہم تر مندرجہ ذیل ہیں:

☆ **منادی:**... قاضی کا یہ معاون اس کے پاس بیٹھ کر لوگوں کو اس کا تعارف کرواتا، اس کے مقام و مرتبہ کو بیان کرتا اور مقدمہ لے کر آنے والوں کو آواز دیتا، اسے "صاحب المجلس" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا ظہور سب سے پہلے قاضی شریح کے زمانہ میں ہوا۔ وکیع کہتے ہیں: عمرو بن قیس الماضی سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو قاضی شریح کے سر پر کھڑا رہتا جب مقدمہ کے دونوں فریق آگے بڑھتے تو وہ کہتا: تم میں سے جو مدعی ہے وہ پہلے بات کرے۔ وکیع ہی کی روایت ہے: جب قاضی شریح فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھتے تو وہ اپنی جگہ سے نہ اٹھتے یہاں تک کہ یہ اعلان کیا جاتا: کیا کوئی جھگڑا کرنے والا یا حقیقت حال معلوم کرنے والا یا کوئی فتویٰ طلب کرنے والا موجود ہے؟[2]

☆ **حاجب** (دربان):... یہ عدالتی معاون قاضی کے دروازے پر کھڑا رہتا تاکہ وہ قاضی کی طرف سے دعویٰ جات کا جائزہ لینے کے دوران لوگوں کو اس کے پاس آنے سے روک سکے، اور رش کی صورت میں ان کے داخلے کو مرتب کر سکے۔ کبھی کبھی حاجب منادی والی ذمہ داری بھی ادا کرتا اور اس طرح وہ دونوں کام بیک وقت سرانجام دیتا، کبھی وہ پولیس مین کے تابع یا عدالتی پولیس کا رکن ہوتا اور کبھی قاضی اسے محکمہ کے بعض اعمال کی سرانجام دہی کی ذمہ داری تفویض کر دیا کرتا یا اس سے باہر کسی مہم کو سر کرنے کا حکم دے دیتا،[3] وکیع بتاتے ہیں کہ ابراہیم نخعی قاضی شریح کے لیے یہ ذمہ داریاں ادا کیا کرتے تھے،[4] قاضی شریح کے سر پر ایک پولیس والا ہاتھ میں کوڑا لیے کھڑا رہتا۔[5]

☆ **ترجمان یا مترجم:**... دائرہ اسلام میں داخل ہونے والی غیر عرب اقوام کی وجہ سے عدالتوں میں ترجمان رکھے گئے۔ چونکہ یہ اقوام عربی اور اسلامی معاشرہ میں مل جل کر رہتی تھیں، لہٰذا اگر ان میں کوئی تنازع کھڑا ہو جاتا، کوئی اختلاف رونما ہو جاتا یا ان میں سے کوئی شخص عدالت میں کوئی دعویٰ دائر کرتا تو قاضی عدالتی معاونت کے لیے کسی قابل اعتماد اور قابل قبول ترجمان کی خدمات حاصل کرتا تاکہ وہ اسے فریقین کے موقف سے آگاہ کر سکے۔[1]

سادسًا:... نگرانی اور مسلسل جائزہ

خلفاء اور ولاۃ الامور کا از خود فیصلے کرنے کے عمل سے علیحدگی اختیار کرنے اور صرف قضاۃ کی تقرری اور معزولی کے اختیارات استعمال کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ قاضیوں کے اعمال کی نگرانی اور ان کی طرف سے صادر ہونے والے فیصلوں سے بھی الگ تھلگ ہو جائیں، اس لیے کہ اصلاً خلیفہ ہی قضاء اور دین و دنیا کے حوالے سے امت اور افراد امت کے جملہ معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ قضاء کو قاضیوں کے حوالے کر دینے سے خلیفہ

دنیا و آخرت میں اس کی ذمہ داریوں سے بچ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاء قاضیوں کے اعمال کی نگرانی کرتے اور ان کی طرف سے جاری کردہ احکامات کا مسلسل جائزہ لیتے رہتے تھے اور اگر انہیں اس میں کوئی خلل، نقص یا انحراف نظر آتا تو اسے درست کرتے۔[2] معاویہ بن صخر نے منصب اقتدار سنبھالنے کے بعد قاضیوں کی نگرانی کے حوالے سے سابقہ طریق کار کو بحال رکھا اور وہ اس بارے میں اپنے سے قبل کے خلفاء کے نقش قدم پر گامزن رہا۔[3]

سابعاً :...اموی دور حکومت میں عدالتی احکامات کے مصادر

عہد اموی کے قاضی حضرات انہی مصادر پر اعتماد کرتے تھے جن پر عہد خلافت راشدہ کے قضاۃ کیا کرتے تھے، یعنی کتاب و سنت، اجماع، گزشتہ عدالتی فیصلے اور اجتہاد، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا التزام وہ اصل اساس ہے جس کا خلافت التزام کرتی اور اسی پر بیعت مکمل ہوتی تھی، عدالتی فیصلے جاری کرتے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اور ان کی طرف سے صادر کردہ فیصلوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ زمانی طور پر مدرسہ نبوت اور نزول وحی کے قریب ترین تھے اور ان کا ولی کے ساتھ گہرا ربط وضبط تھا اور خاص طور سے خلفائے راشدین کے جاری کردہ فیصلے ان سے بہت قریب تھے، پھر چونکہ خلافت امویہ کے طول و عرض میں مختلف نسلوں اور عادات و اطوار کے لوگ آباد تھے، حکام کے جاری کردہ فیصلوں پر عرف اور عادت کے اثرات بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے، اس بنا پر قاضی حضرات اقوال، دعویٰ جات، قسموں اور تہمتوں کا اس اصلیت کی رو سے جائزہ لیتے جو ان الفاظ اور اصطلاحات کا مفہوم و معنی متعین کرتیں۔[4] فقہاء، قضاۃ اور خلفاء نے جن نقول اور احادیث پر اعتماد کرنا ہوتا ان کے صحیح اور یقینی ہونے کا بڑا اہتمام کرتے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے جھوٹی احادیث پر اعتماد کرنے سے خبردار کرتے ہوئے قریش کے وفد سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ایسی احادیث بیان کرتے ہیں جو نہ تو کتاب اللہ میں ہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی منقول ہیں، یہ تمہارے جاہل لوگ ہیں۔[5]

ساتویں بحث:

عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں پولیس کا نظام

معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت نے ملکی سطح پر ایک سرکاری ادارے کی حیثیت سے پولیس کے نظام میں بڑی تبدیلی کا مشاہدہ کیا گیا۔ ان کے دور میں یہ ادارہ انتہائی مضبوط اور موثر بھی تھا اور اس سے وابستہ لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ یہ ادارہ مملکت کے تمام اسلامی شہروں میں امن و امان کی صورت حال کو قائم رکھنے اور ملکی نظام کو پائیدار بنانے کا براہ راست ذمہ دار تھا۔ پولیس ایک ایسی امن قائم کرنے والی قوت تھی جس پر حکمرانوں کی ذاتی حفاظت اور اندرونی امن و امان کی حفاظت کے حوالے سے معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والیوں کو پورا پورا اعتماد حاصل تھا، اموی حکمرانوں کے خوارج و روافض جیسے مخالف گروہوں سے دفاع کی ذمہ داری بھی پولیس پر عائد ہوتی تھی۔ یہ لوگ اموی حکومت کو گرانے اور حکمرانوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے ان کے خلاف مختلف محاذوں پر سرگرم عمل تھے اور جس کے لیے وہ مختلف طریقے اختیار کیا کرتے تھے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے

پولیس کو اپنے خصوصی حفاظتی دستے کے طور پر استعمال کیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے خوارج نے جو ناکام کوششیں کی ان کا آئندہ کے لیے سدباب کرنے کے لیے انہیں اپنی ذاتی حفاظت کے لیے پولیس پر اعتماد کرنا پڑا۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف سے اس قسم کی مذموم کارروائیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو شہید بھی کر دیا گیا۔ اس روح فرسا واقعہ کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ ذاتی حفاظتی انتظامات کے بغیر باہر نہیں نکلا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کے پہرے دار نماز کے اوقات میں بھی انہیں ان کے مخالفین کے حملوں سے بچانے کے لیے ان کے قریب کھڑے رہتے۔[1]

اولاً:... پولیس عراق میں

مغیرہ رضی اللہ عنہ پہلے والی تھے جنہیں معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ پر متعین کیا اور انہوں نے امن وامان قائم کرنے کے لیے پولیس کی مدد حاصل کی اس غرض کے لیے جس شخص کو پولیس کا سربراہ مقرر کیا گیا وہ تند مزاجی، سخت گیری میں بڑی شہرت رکھتا تھا اور جسے قبیصہ بن دمون کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔[2] امن وامان اور نظام مملکت کی حفاظت کے لیے پولیس کی فعالیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جو مغیرہ رضی اللہ عنہ کو خوارج کے ساتھ پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب پولیس کے سربراہ نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ خوارج معاشرے میں بے چینی اور خطرات بھڑکانے کے لیے کوفہ کے ایک مکان میں جمع ہو رہے ہیں تو مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اسے اس مکان کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا اور پھر انہیں گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا والی مقرر کیا۔ پھر ۴۵ھ میں اسے معزول کر کے اس کی جگہ زیاد بن ابیہ کو بصرہ کا والی متعین کر دیا۔ جب زیاد بصرہ پہنچا تو اسے شہر کی امن وامان کی بگڑتی صورت حال کا اندازہ ہوا اور پھر اس نے اپنے افتتاحی خطاب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لیے سخت کارروائی کرنے کی دھمکی دی اور انہیں بتایا کہ وہ صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات کر سکتا ہے۔ اس کے اس خطبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امن وامان کی صورتِ حال کو بہتر بنانے اور نظام مملکت کو قائم رکھنے کے لیے عزم مصمم کیے ہوئے تھا۔[1] اگرچہ اس کے لیے اس نے جو طریقہ کار اپنانے کی بات کی وہ انتہائی قابل افسوس تھا۔ اس نے خطبہ کے دوران اعلان کیا: مجھے اللہ کی قسم! میں ولی کو ولی کے بدلے، مقیم کو مسافر کے بدلے، آنے والے کو جانے والے کے بدلے اور تندرست کو بیمار کے بدلے پکڑوں گا، یہاں تک کہ تم میں سے ایک شخص اپنے بھائی کو ملے گا اور اس سے کہے گا: سعد تو تو بچ جا سعید تو مارا گیا۔ یا پھر میرے لیے تمہارے نیزے سیدھے ہو جائیں گے۔[2] زیاد بن ابیہ کے عہد ولایت کے دوران بصرہ میں امن کس طرح قائم ہوا۔ اس کے بارے میں بلاذری روایت کرتے ہیں کہ زیاد نے عام لوگوں میں آوازوں کا شور سنا تو اس نے اس کا سبب دریافت کیا۔ اسے بتایا گیا کہ کسی آدمی نے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے کسی کو اجرت پر رکھا ہے اور یہ اس لیے کہ چور جگہ جگہ پھرتے ہیں اور پولیس کا کہیں وجود نہیں۔[3] دوسرے دن زیاد نے پولیس کے سربراہ کو حکم دیا کہ عشاء کی نماز کے بعد راستوں کی حفاظت کے لیے پولیس کی نفری متعین کی جائے۔[4] اس معاملے کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بلاذری بتاتے ہیں کہ پولیس نے تقریباً چار سو چوروں اور ڈاکوؤں کو ہلاک کر ڈالا۔[5] زیاد پہلا حکمران تھا جس نے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکل کر ادھر ادھر کو گھومنے سے منع کر دیا تھا۔[6] اس کے بعد زیاد پولیس سربراہ کو باہر نکلنے کا حکم دیتا ہے، جب وہ گشت پر نکلتا تو وہ جس انسان کو بھی دیکھتا اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا، اس نے ایک رات ایک اعرابی کو پکڑ کر اسے زیاد کے حوالے کر دیا، زیاد نے اس سے پوچھا: کیا تو نے یہ اعلان نہیں سنا کہ رات کے وقت گھومنا پھرنا منع ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے

یہ اعلان نہیں سنا، میں اپنی دودھ دینے والی اونٹنی کے ساتھ ادھر آیا، جب رات ہو گئی تو میں نے اسے کسی جگہ چھوڑ دیا اور خود صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا، مجھے امیر کے حکم کا کوئی علم نہیں ہے، زیاد کہنے لگا، اللہ کی قسم! میں تجھے تیرے قول میں سچا سمجھتا ہوں مگر تیرے قتل میں اس امت کی بہتری ہے، پھر اس کے حکم سے اس کی گردن اڑا دی گئی۔[7] اس جیسے ظالمانہ فعل کی شریعت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے چاہے اس کے لیے جتنے بھی جواز گھڑ لیے جائیں۔[8]

آٹھویں بحث:

گورنرز اور انتظامیہ، عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں

معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے دوران مرکزیت اور لامرکزیت کے درمیان توازن قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہے۔ انہوں نے دمشق کو دار الحکومت قرار دیا جہاں سے حکومت کے سیاسی، اقتصادی اور انتظامی احکامات جاری کیے جاتے۔ جہاں تک ولایات کے داخلی امور کی ترتیب کا تعلق ہے تو اس کے لیے معاویہ رضی اللہ عنہ نے صوبائی گورنروں کو ان کے تجربات اور صلاحیتوں کے مطابق اپنے امور نمٹانے کی آزادی دے رکھی تھی مگر وہ سارے کے سارے معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے براہ راست جواب دہ تھے اور ان کے ہر عمل کے لیے ان کا احتساب بھی کیا جاتا تھا۔ دمشق کو دار الحکومت بنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اہل شام کے بارے بخوبی آگاہ تھے اور انہیں ان پر اور ان کی دوستی پر مکمل اعتماد تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے تقریباً بیس سال بلاد شام کے امیر کے طور پر گزارے اور اس دوران وہ ان کے درمیان عوامی مقبولیت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس امر کا احساس تھا کہ اموی حکومت کے تسلسل کا زیادہ تر دار و مدار ان کے لیے اہل شام کی نصرت و حمایت پر ہے، لہٰذا آغاز کار سے ہی ان کی یہ کوشش رہی کہ بلاد شام میں موجود مختلف عرب قبائل کے رجال کار اور خاص طور پر یمنی اور قیسی قبائل کے درمیان توازن قائم رہے۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی استطاعت کی حد تک سرزمین شام میں طرفین کے مفادات کے تحفظ میں توازن قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہے، معاویہ رضی اللہ عنہ کو قیسی قبائل کے مردان کار کی خدمات بھی حاصل تھیں، مثلاً ضحاک بن قیس فہری اور حبیب بن مسلمہ فہری اور یمنی قبائل کے سرکردہ لوگوں کی بھی، جن میں سے مالک بن ہبیرہ سکونی، شرحبیل بن سمط کندی اور حسان بن بحدل کلبی وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنی امارت اور خلافت کے دونوں عرصوں کے دوران طرفین کی طرف سے مکمل تعاون حاصل رہا، وہ ایک ہی لشکر میں شامل ہو کر ایک ہی امارت کے تحت ان کے پہلو بہ پہلو اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف برسرپیکار رہتے۔[2]

معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست اموی خاندان کے افراد سے استعانت پر قائم تھی، جیسا کہ عنبسہ بن ابوسفیان، عتبہ بن ابوسفیان، ولید بن عتبہ بن ابوسفیان، سعید بن العاص بن امیہ، مروان بن حکم اس کا بیٹا عبد الملک[3] اور عمرو بن سعید بن العاص وغیرہ۔[4] معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں میں سے بڑا وسیع تجربہ رکھنے والے لوگوں کو اپنے معاونین اور والی کے طور سے منتخب فرمایا، مثلاً عبد اللہ بن عامر بن کریز، مغیرہ بن شعبہ، نعمان بن بشیر انصاری، مسلمہ بن مخلد انصاری رضی اللہ عنہم۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے ان لوگوں کے انتخاب کی وجہ صرف ان کے ساتھ ان کی دوستی ہی نہیں تھی بلکہ ان میں سے زیادہ تر کی خدمات ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو بھی حاصل رہی تھی، لہٰذا انہوں نے ان کی صلاحیتوں

سے فائدہ اٹھانا مناسب سمجھا، پھر یہ ایسے لوگ بھی تھے جنہیں شام میں اسلامی فتوحات کے واقعات نے نمایاں کر دیا تھا۔[2] یہ امر بھی ہمارے ملاحظہ میں ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے مختلف شہروں کی ولایت کے لیے باصلاحیت اور وفادار لوگوں کا انتخاب کیا اگرچہ انہوں نے اپنے بعض معاونین کا انتخاب اپنے اہل بیت سے کیا مگر آپ ان کے ساتھ بڑی احتیاط پر مبنی معاملہ کرتے یہاں تک کہ ان کے بارے میں مطمئن ہو جاتے اور ان کی انتظامی اور ادارتی صلاحیتوں کا یقین کر لیتے۔ آپ آغاز میں انہیں طائف[3] جیسے چھوٹے شہروں کے لیے منتخب کرتے پھر جب ان میں سے کوئی اپنی انتظامی صلاحیت کا لوہا منوا لیتا تو اس کی ولایت کا دائرہ مکہ مکرمہ تک بڑھا دیتے اور پھر مدینہ منورہ کو بھی اس کی ماتحتی میں کر دیتے اور پھر اسے باصلاحیت ماہر کا لقب دے دیا جاتا۔[4] یہاں پر یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس وقت طائف کا شمار اہم ترین شہروں میں ہوتا تھا جس کی وجہ وہاں طاقتور قبیلہ بنو ثقیف کا آباد ہونا تھا۔[5] جو بھی والی سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے طائف پر کنٹرول کر لیتا اس کے لیے دیگر شہروں پر کنٹرول حاصل کرنا مشکل نہ رہتا۔ اس امر کے اشارے موجود ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حجاز میں ایک ایسا مرکز قائم کر رکھا تھا جس میں اموی خاندان کے لوگوں کو مستقبل کے کامیاب حکمران بنانے کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔[6] معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے خاندان کے جن لوگوں کی خدمات سے سرکاری طور سے فائدہ اٹھانا ہوتا انہیں ایک دوسرے سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے اور یہ اس لیے کہ وہ ان کے خلاف کوئی محاذ نہ کھڑا کر سکیں۔[7]

معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کی خلافت کے دور میں ان کی غیر مسلم رعایا کو خصوصی مراعات حاصل تھیں، ان کے ساتھ حد درجہ نرمی برتی جاتی اور ان کے ساتھ درگزر سے کام لیا جاتا اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے حقوق حاصل کر لیتے۔ وہ لوگ مختلف حکومتی عہدوں پر بھی کام کرتے تھے۔ انہوں نے اس بیزنطی اور قبطی نظاموں کو قائم رکھا جس پر مصر، شام اور مغرب میں عمل کیا جاتا تھا، اسی طرح عراق اور خراسان میں بھی فارسی نظاموں کو باقی رہنے دیا گیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا معالج خاص ابن اثال غیر مسلم تھا۔[8] اسی طرح ان کا رومی مالی مشیر سرجیج (سرجون) بن منصور[9]، ابن سینا اور ابن نضیر[10] جیسے ان کے عمال غیر مسلم تھے جن میں سے کچھ بعد میں دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

مدینہ منورہ کے گورنر

۱۔ مروان بن حکم (۴۹-۴۲ھ):... ۴۲ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان بن حکم کو مدینہ منورہ کی ولایت عطا کی، مروان کی معزولی کے وقت عبداللہ بن حارث بن نوفل مدینہ کے قاضی تھے۔[4]

۱۔ سعید بن العاص رضی اللہ عنہ (۵۴-۴۹ھ):... ماہ ربیع الاوّل ۴۹ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان بن حکم کو معزول کر کے اس کی جگہ سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ کا والی مقرر کر دیا۔ یہ ربیع الثانی کی بات ہے، دوسری روایت کی رو سے یہ ربیع الاوّل کا واقعہ ہے۔[5]

۳۔ مروان بن حکم کی دوسری ولایت (۵۷-۵۴ھ):... ۵۴ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے سعید بن العاص کو مدینہ منورہ کی ولایت سے ہٹا کر اس کی جگہ دوبارہ مروان بن الحکم کو مدینہ منورہ کا عامل مقرر کر دیا۔[6]

۴۔ ولید بن عتبہ بن ابوسفیان:... ۵۷ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو ہٹا کر اس کی جگہ ولید بن عتبہ بن ابوسفیان[7] کو مدینہ منورہ کا عامل مقرر کیا۔[8]

مدینہ منورہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات(۵۸یا۵۹ھ):

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں فوت ہوئے چونکہ انہیں اعدائے سنت نبویہ کی طرف سے اس کی خدمت کی وجہ سے زبردست تنقید کا سامنا کرنا پڑا، لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس جگہ ان کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد ان کے بارے میں پھیلائے گئے شکوک وشبہات کا ذکر کروں اور پھر ان کے بطلان وزیف کو واضح کروں۔

ا: ان کا تعارف:... آپ کا نام عبدالرحمن بن صخر دوسی یمانی ہے، زمانہ جاہلیت میں ان کا نام عبد شمس تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبدالرحمن رکھا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی اس کنیت کے ساتھ اس قدر مشہور ہوئے کہ یہ ان کے نام پر غالب آگئی۔ جب ان سے اس کنیت کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا: مجھے ایک بلی ملی تو میں نے اسے اپنی آستین میں اٹھالیا جس پر مجھے ابوہریرہ کہا جانے لگا۔ آپ بچپن میں اپنے گھر والوں کی بکریاں چرایا کرتے اور اپنی بلی کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے: مجھے ابوہریرہ کی کنیت سے نہ پکارا کرو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کنیت ابوہر رکھی تھی۔ مذکر مونث سے افضل ہوا کرتا ہے۔[1]

ب: قبول اسلام:... ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں فتح خیبر کے موقع پر یمن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے، قبل ازیں آپ یمن میں طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکے تھے، آپ مدینہ منورہ پہنچے تو صبح کی نماز سباع بن عرفطہ کی امامت میں ادا کی۔ جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خیبر کے دوران اپنی عدم موجودگی میں مدینہ منورہ پر اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا۔[2] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تادم واپسیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے وقف کیے رکھا اور آپ سے اکتساب علم کیا، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آتے جاتے، حتیٰ کہ آپ کے ساتھ آپ کے گھر بھی چلے جاتے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حج اور غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک سفر اور سفر وحضر میں شب وروز آپ کے رفیق رہے، یہاں تک کہ معلم کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مقدار میں علم نبوت حاصل کیا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو چار سال تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحبت ورفاقت کا شرف حاصل ہوا، انہوں نے صفہ کو اپنی رہائش گاہ بنایا اور عسرت کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اصحاب صفہ کا عریف (مانیٹر) مقرر فرمار کھا تھا اور وہ ان سے اور ان کے مراتب سے بخوبی آگاہ تھے۔[3]

ج: اپنی ماں کو دعوت اسلام:... ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اپنی مشرکہ والدہ کو اسلام کی دعوت دیا کرتا تھا، جب میں نے ایک دن اسے یہ دعوت دی تو اس نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غیر پسندیدہ باتیں سنائیں۔ میں روتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] سیر اعلام النبلاء: ۲/۴۲۴. [2] ایضاً: ۲/۴۲۵. [3] حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۷۶۔ السنۃ قبل التدوین، محمد عجاج الخطیب، ص: ۴۱۲.

خدمت میں حاضر اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں اپنی ماں کو اسلام کی دعوت دیا کرتا تھا مگر وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کرتی تھی، پھر جب آج میں نے اسے اسلام کی دعوت دی تو اس نے مجھے آپ کے بارے میں غیر پسندیدہ باتیں سنا دیں۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت عطا فرما دے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے اللہ! ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت عطا فرما۔'' میں آپ کی زبان مبارک سے یہ دعا سن کر خوشی خوشی واپس آیا، جب گھر کے دروازے پر پہنچا تو اسے اندر سے بند پایا، جب میری ماں نے میرے قدموں کی آہٹ سنی تو کہنے لگی: ابوہریرہ! ادھر ہی ٹھہرو، اس دوران میں نے پانی کے حرکت کرنے کی آواز سنی۔ ابوہریرہ کہتے ہیں: میری ماں نے غسل کیا اور جلدی جلدی کپڑے پہن کر دروازہ کھولا اور کہنے لگی: اشهد ان لا إله الا الله و اشهد ان محمدا عبده و رسوله۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آیا تو خوشی سے رو رہا تھا، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! خوش ہو جائیں اللہ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت عطا فرما دی ہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور کلمات خیر ادا کیے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ اپنے مومن بندوں کے دلوں میں میری اور میری ماں کی اور ہمارے دلوں میں ان کی محبت پیدا فرما دے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے یہ دعا فرما دی۔ آپ کی اسی دعا کا نتیجہ ہے کہ جو بندہ مومن بھی میرے بارے میں سنتا یا مجھے دیکھتا ہے مجھ سے پیار کرنے لگ جاتا ہے۔[1]

د: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کی عبادت گزاری:... ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بڑے متقی اور پرہیز گار انسان تھے، آپ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا التزام کیا کرتے تھے، لوگوں کو دنیوی لذات اور اس کی شہوات سے مستغرق ہونے سے خبر دار کرتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دیتے اور اس حوالے سے غریب امیر اور چھوٹے بڑے میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتے تھے، اس بارے میں ان کے بہت سے واقعات مروی ہیں۔ آپ اندر باہر ہر جگہ اللہ سے ڈرتے، لوگوں کو اس کی یاد دہانی کراتے اور انہیں اللہ کی اطاعت گزاری کی ترغیب دلایا کرتے تھے۔[2] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بڑے عبادت گزار تھے، دن کو روزہ رکھتے اور رات کو قیام کیا کرتے۔ وہ خود، ان کی بیوی اور ان کی بیٹی باری باری قیام اللیل کیا کرتے[3] اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ اپنے گھر کی آبادی کا بھی اہتمام فرماتے۔ ابو عثمان نہدی کہتے ہیں: میں سات دن تک ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مہمان رہا، وہ، ان کی بیوی اور بیٹی رات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے باری باری قیام کرتے، ان میں سے ایک نماز پڑھنے کے بعد دوسرے کو جگا دیتا اور پھر دوسرا تیسرے کو۔[4] اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت سے ابوہریرہ کا روشن و تاباں گھر ہمیں اس دور کے گھروں کی کیفیت سے آگاہ کرتا ہے جب ان کا گھر رات بھر کی عبادت سے آباد رہتا تو اس میں شیطان کے لیے گنجائش کہاں سے نکل سکتی تھی۔ یہ حافظ کبیر اور عالم ربانی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی تقویٰ اور عمل صالح پر عالی شان تربیت، طاہرہ زکیہ خاتون کی طرف سے اس کی استجابت کریمہ اور اطاعت گزار صالح خادم کی طرف سے اس کی قبولیت کا مبارک نتیجہ تھا۔ جب فرزندان دنیا اپنے خدام کو کسی بڑے کام کا مکلف بناتے ہیں تو صرف دنیوی اعمال کا مکلف بناتے ہیں ان کے نزدیک اخروی عمل کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، جبکہ فرزندانِ آخرت کی خوشی کی اس وقت کوئی حد نہیں رہتی جب وہ اپنے خدام کو اخروی اعمال کے لیے سر توڑ کوشش کرتے دیکھتے ہیں اس لیے کہ اس طرح وہ اپنی خوبی توجیہات کی وجہ سے اجر جزیل حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔[1]

ھ: فقر و فاقہ اور عفت و پاک دامنی:... ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا شمار فقراء و مساکین لوگوں میں ہوتا ہے۔ آپ فقر و فاقہ کی شدت کے باوجود بھی صابر و شاکر رہے۔ یہاں تک کہ وہ بھوک کی وجہ سے اپنا پیٹ کنکریوں پر بچھا دیتے اور یوں شب و روز تڑپتے تڑپتے گزارا کرتے مگر انہیں ایسی کوئی چیز میسر نہ آتی جو اُن کی پشت کو سیدھا کر سکتی۔[2] سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بازار میں گھومتے رہتے پھر گھر

آکر پوچھتے: کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟ اگر وہ نفی میں جواب دیتے تو فرماتے: پھر میں روزے سے ہوں۔[3] آپ بڑے قناعت پسند اور اللہ کی نعمتوں پر شاکر رہنے والے تھے۔ اگر کبھی پندرہ کھجوریں کہیں سے میسر آ جاتیں تو پانچ کھجوروں سے روزہ افطار کرتے، پانچ کے ساتھ سحری کرتے اور پانچ افطاری کے لیے رکھ لیتے۔[4] آپ بکثرت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ فضل و خیر پر بڑی کثرت کے ساتھ اس کی تسبیح و تحمید اور تکبیر بیان کرتے۔[5] و: حلم و حوصلہ اور عفو و کرم:... ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک سیاہ فام لونڈی تھی جس نے اپنے عمل و کردار سے انہیں زچ کر رکھا تھا، ایک دن ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کوڑا اٹھاتے ہوئے اس سے کہا: اگر قیامت کے دن قصاص کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں تجھ پر اس کی بارش برسا دیتا، میں تجھے اس کے ہاتھ فروخت کروں گا جو اس دن مجھے تیری پوری پوری قیمت دے گا جب مجھے اس کی بہت زیادہ ضرورت ہو گی۔ چلی جا، تو اللہ کے لیے آزاد ہے۔[6] یوں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی خادمہ پر اپنی قدرت اور اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا موازنہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کے عذاب سے بچاؤ کو اپنی ناراضی کے مقتضی کی تنفیذ پر ترجیح دیتے نظر آتے ہیں اور خادمہ کے ساتھ بدسلوکی کرنے اور اسے سزا دینے کی بجائے اس پر احسان کرتے ہوئے اسے لوجہ اللہ آزاد کر دیتے ہیں۔ یوں انہوں نے متعدد اعمال صالحہ اپنے نامۂ اعمال میں جمع کر لیے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی خشیت، بدسلوکی کے مرتکب کو معاف کرنا اور اس پر احسان کرنا۔ اس سے یہ امر بھی منکشف ہوتا ہے کہ اخروی زندگی کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تصور بڑا گہرا تھا، اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کرتے تھے اور اس کی رضامندی کے حصول کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔[7]

(د) مرض الموت میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا رونا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کا ان کے ورثاء کے لیے وصیت کرنا:

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ موت کے وقت رونے لگے تو ان سے کہا گیا: آپ رو کیوں رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: میں تمہاری اس دنیا کے لیے نہیں روتا، بلکہ میں اپنے اس سفر اور زادِ راہ کی کمی پر روتا ہوں۔ میں ایسی بلند جگہ پر کھڑا ہوں جہاں سے ایک راستہ جنت کو اور دوسرا جہنم کو جاتا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کس راستے پر چلایا جائے گا۔[2] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ والی مدینہ ولید بن عتبہ بن ابوسفیان نے پڑھائی اور نماز جنازہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سمیت بہت سارے لوگوں نے شرکت کی۔ ان کی وفات وادی عقیق میں واقع ان کے گھر میں ہوئی، پھر انہیں مدینہ منورہ لا کر ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور بقیع میں مدفون ہوئے، ولید بن عتبہ نے ان کی وفات کی خبر معاویہ رضی اللہ عنہ کو دی تو انہوں نے اسے ان کے ورثاء کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انہیں دس ہزار درہم ادا کرنے کا حکم دیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاون و مددگار تھے اور پھر محاصرہ کیے گئے ان کے گھر میں ان کے ساتھ رہے۔[3]

کیا معاویہ رضی اللہ عنہ نے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ سے شام منتقل کرنے کا ارادہ کیا تھا؟

طبری نے اپنی تاریخ میں ۵۰ھ کے واقعات کے ضمن میں ذکر کیا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ سے شام منتقل کرنے کے لیے اسے اپنی جگہ سے حرکت دی تو سورج کو گرہن لگ گیا یہاں تک کہ ستارے نظر آنے لگے۔ جسے لوگوں نے بڑا گراں خیال کیا۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے منبر رسول کو یہاں سے اٹھانے کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ مجھے یہ خوف لاحق ہوا تھا کہ کہیں اسے دیمک نہ لگ

گئی ہو۔ اب میں نے اسے خود دیکھ لیا ہے۔ پھر انہوں نے اسے کپڑے سے ڈھانپ دیا۔[4] دوسری روایت میں وارد ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: میرا خیال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور لاٹھی کو مدینہ میں نہ چھوڑا جائے اس لیے کہ اہل مدینہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل اور ان کے دشمن ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا مبارک سعد القرظ کے پاس تھا جب انہوں نے ان سے عصا کا مطالبہ کیا تو ان کے پاس ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ آئے اور کہنے لگے: امیر المومنین! ہم تمہیں اللہ کا واسطہ دیتے ہیں کہ آپ یہ کام نہ کریں۔ ایسا کرنا صحیح نہیں ہو گا۔ آپ منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جگہ سے نکالنا چاہتے ہیں جس جگہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عصا کو بھی مدینہ سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس پر انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا، پھر انہوں نے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چھ سیڑیاں اور بنا دیں اور لوگوں سے اس بارے معذرت کی۔[5]

چوتھی فصل

فتوحاتِ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ

فتوحاتِ دولت اسلامیہ

ہم آئندہ سطور میں روئے زمین پر اسلامی فتوحات کی اس تحریک کے بارے میں تحریر کرنا چاہیں گے جو معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت سے لے کر پورے اموی دور حکومت میں اختتام پذیر ہوئیں، خلافت راشدہ اور بنو امیہ کے ادوار میں قائم ہونے والی اسلامی فتوحات کی تحریک محض زمین میں توسیع پسندی کی تحریک نہیں تھی اور نہ ہی اسے اس اعتبار سے دیکھنا جائز ہے بلکہ یہ دنیا کی تاریخ میں ایسی سب سے بڑی تحریک تھی جس کا مقصد لوگوں کو رشد و ہدایت سے ہم کنار کرنا اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لانا تھا۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں کے نزدیک ہمارا یہ دعویٰ بڑی حکومت کے اس دعویٰ جیسا ہے کہ جو زمین میں تہذیب عام کرنا چاہتی ہے اور یہ اس کی توسیع پسندانہ تحریک اسی تہذیب کی نشر و اشاعت کی غرض سے ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر ہم قدیم و جدید میں فرعونی، اشوری، فینقی، رومانی، فارسی، ہندی، چینی، برطانوی، فرانسیسی، امریکی اور روسی جیسی ان بے شمار جاہلی سلطنتوں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کریں گے کہ وہ کس طرح قائم ہوئیں؟ اور انہوں نے زمین میں کن چیزوں کی اشاعت کی؟ اگر یہ کہا جائے کہ وہ طاقت کے زور پر تسلط جما کر قائم ہوئیں، دوسروں کو کمزور کر کے انہیں زبردستی دبا دیا، انہیں اپنی حکومت کے تابع بناتے ہوئے ایسے خدمت گزاروں میں تبدیل کر دیا جو انہیں جنگجو افرادی قوت مہیا کرتے اور ان کے مختلف وسائل خیر سے ان کے معاون و مددگار بنتے اور توسیع پسندانہ نظریات کی حامل یہ آمرانہ حکومتیں اور حکمران ان کمزور و مقہور اور بھوکے لوگوں کے حساب پر عیاشی کرتے، تو اس بارے کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔[1] رہا یہ سوال کہ انہوں نے لوگوں کو کیا دیا اور زمین میں کیا کچھ پھیلایا؟ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے کسی قدر خیر کے ساتھ بہت زیادہ شر اور فساد پھیلایا، اس لیے کہ وہ تہذیبیں منہج ربانی پر گامزن نہیں تھیں اور ان میں خیر کم اور فساد زیادہ تھا، اور برتن سے اچھل کر وہی کچھ باہر آئے گا جو اس میں موجود ہو گا اور جس کے پاس خود کچھ نہیں وہ کسی کو کیا دے گا۔ رہی آج کے دور کی مغربی تہذیب تو اس کے ساتھ آنے والے استعمار کی رسوائیاں جو دوسری اقوام کی زمینوں پر قبضہ جمائے، ان کے وسائل خیر کو لوٹنے اور خود انہیں ذلیل کرنے سے عبارت ہیں تو یہ اس کے فساد کی بہترین شہادت

ہے۔اس تہذیب کی طرف سے دنیائے مسائل کا آخری حل جو کہ جدید عالمی نظام سے موسوم ہے وہ سرکشی کی نئی قسم ہے۔ جسے طاقتور ملک کمزور ملکوں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں اور جس کے قابل فخر کارناموں میں سے یورپی طاقتور ملکوں کے مفادات کے لیے پٹرول پیدا کرنے والے ملکوں پر حکومت کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرنا ہے اور جس کی عملی صورت یہ ہے کہ مختصر مدت میں زیادہ سے زیادہ پٹرول نکال کر دے، کم از کم قیمت پر عالمی مارکیٹوں میں پھینک دیا جائے تاکہ ان سرکش ممالک کی دولت وثروت اور فقراء کے فقر اور پسماندگی میں مزید اضافہ ہو جائے، ہر ممکن طریقہ سے اسرائیل کی مدد کرنا اور ہمارے اس دشمن کے خلاف عرب ممالک کی تمام صلاحیتوں کو ختم کر دینا بھی اس کے قابل فخر کارناموں میں سے ایک ہے۔ جہاں تک گزشتہ آسمانی مذاہب کے پیروکاروں یہود و نصاریٰ کا تعلق ہے تو انہوں نے زمین میں کیا پھیلایا؟ یہودیوں نے اپنے دین کو بنی اسرائیل کے لیے مخصوص کر لیا، لہٰذا وہ اسے زمین میں پھیلانا پسند ہی نہیں کرتے تاکہ الٰہ ان کا بن کر رہ جائے اور اس میں روئے زمین کے انسانوں میں سے کوئی ایک بھی ان کا شراکت دار نہ رہے۔ رہے نصاریٰ، تو وہ پولوس سے لے کر وسیع پیمانے پر اپنے دین کی اشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ انہوں نے کس چیز کی اشاعت کی؟ انہوں نے اس دین ربانی کی جگہ جسے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا ایک بت پرستانہ دین کی اشاعت کی جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اور روح القدس جبریل امین علیہ السلام کی بندگی کی جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ (المائدۃ: ۷۲)

"یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جن کا قول ہے کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے۔"

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ (المائدۃ: ۷۳)

"وہ لوگ یقیناً کافر ہو گئے جن کا قول ہے کہ اللہ تین کا تیسرا ہے۔"

مزید فرمایا گیا:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝﴾ (اٰل عمرٰن: ۷۹)

"کسی ایسے انسان کے لیے جسے اللہ تعالیٰ کتاب وحکمت اور نبوت دے یہ لائق نہیں کہ پھر بھی وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم سب رب کے ہو جاؤ تمہارے کتاب سکھانے کے باعث اور تمہارے کتاب پڑھنے کے سبب۔" انہوں نے اس دین کی اشاعت کی جو رہبانیت کی دعوت دیتا، دنیوی زندگی کو مہمل قرار دیتا اور جسم اور جسم کی ضروریات کی تقصیر کرتا ہے، ان مسیحی تعلیمات کی وجہ سے زندگی معطل ہو کر رہ گئی اور زمین کی آبادی ایک فضول شوق قرار پائی، پھر اس کا ردّ عمل بہت برا ہوا اور وہی عیسائی دنیا جسمانی لذتوں اور زندگی کی مادیات پر ٹوٹ پڑی۔[1]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝﴾ (الحدید: ۲۷)

"رہبانیت (ترک دنیا) تو انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی ہم نے ان پر اسے واجب نہ کیا تھا سوائے اللہ کی رضا جوئی کے، سو انہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی پھر بھی ہم نے ان میں سے جو ایمان لائے تھے انہیں ان کا اجر دیا اور ان میں سے زیادہ تر لوگ نافرمان ہیں۔" اس کے ساتھ ایسا انہونا دین پروان چڑھا جسے کنیسہ اور اس کے رجال کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے اور جن کی قیادت پاپا (پوپ) کے ہاتھ میں ہے جو زندگی کے تمام گوشوں میں سنگین قسم کی سرکشی کے مختلف رنگ متعارف کرواتا، عقل و فکر سے عداوت رکھتا، ان کے استعمال پر پابندیاں لگاتا، علماء پر ظلم ڈھاتا اور انہیں علمی بحث و مباحثہ سے روکتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں زندگی ہر پہلو سے پیچھے رہ گئی، مگر اس کا جو ردّ عمل ہوا وہ بہت ہی برا تھا جس کا مشاہدہ الحاد و بے دینی، دین سے دوری بلکہ دین سے عداوت کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یوں کنیسہ کے ہاتھوں آسمانی رسالت اپنے نزول کے مقاصد سے ہاتھ دھو بیٹھی، اور اصلاح کی جگہ فساد کا دور دورہ ہو گیا، عیسائیت کے پہلے دور میں بھی یہی کچھ ہوا اور دوسرے دور میں بھی۔[1]

اس کے برعکس زمین میں اسلامی پھیلاؤ انسانی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے، وہ اس شہنشاہیت کی وسعت پذیری سے بالکل ہٹ کر ہے جس کی جاہلیت قدیمہ و جدیدہ مشق کرتی رہی ہے۔ وہ اس تباہ کن طغیان و سرکشی سے بالکل مختلف ہے جس کی تحریف شدہ نصرانیت مشق کرتی چلی آئی ہے۔ تاریخ عالم کی اس انوکھی تحریک کے دوران مسلمان گمراہی کی جگہ ہدایت، تاریکیوں کی جگہ روشنی اور حکمرانوں، کاہنوں اور بتوں کی پرستش کی جگہ صحیح عبودیت پھیلاتے رہے، زمین میں زیردستوں کو آزادی کے پروانے عطا کرتے رہے، لوگوں کو ان کی گم شدہ انسانیت واپس کرتے رہے اور انہیں انسان کے شایانِ شان مقام پر فائز کرتے رہے۔ وہ عدل و انصاف، اخوت و مودت، رواداری اور برداشت کی ایسی قدروں کو عام کرتے رہے جن کی اسلام کے علاوہ کہیں مثال نہیں ملتی۔ مسلمان ایسی عالی شان اور ہمہ گیر حقیقی تہذیب کی اشاعت کرتے تھے جسے وہ صرف اپنے لیے ہی پسند نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے اس کے دروازے زمین میں رہنے والے ہر مسلمان کے لیے کھول رکھے تھے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اندلس، مشرقی یورپ کے نصاریٰ اور عالم اسلام کے مختلف شہروں اور علاقوں میں رہنے والے یہودی بھی اس کے سایہ عاطفت میں راحت محسوس کرتے تھے، ہندوستان میں گائے کے پجاری اور بت پرست تک بھی اس اسلامی تہذیب کے گھنے سائے میں پر لطف زندگی گزارتے تھے۔ اہل اسلام نے مفتوحہ ممالک کی دولت کو کبھی نہیں لوٹا اور نہ اپنی حکومتی طاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں کے باسیوں کو دبانے کی کوشش کی۔ وہ سب سے پہلے انہیں مجسمہ خیر دین اسلام کی دعوت دیتے اگر وہ اسے قبول کر لیتے تو وہ دینی اعتبار سے ایک دوسرے کے بھائی بن جاتے اور اگر وہ اس سے انکار کرتے تو مسلمان ان سے جزیہ کا مطالبہ کرتے اور اگر وہ اس سے بھی انکار کرتے تو پھر فریقین میں جنگ ہوتی۔ مگر یاد رہے کہ یہ جنگ کسی کو قبول اسلام کے لیے مجبور کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ قوت کے ان مراکز کے خاتمہ کے لیے ہوتی جو حق کو لوگوں تک رسائی حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ تھے، پھر جب سرکشی کے مراکز کا خاتمہ کر دیا جاتا اور انسانی نفوس سے ان کی تاثیر زائل ہو جاتی تو لوگوں کو اسلام کے سایہ عاطفت میں آزاد چھوڑ دیا جاتا تاکہ وہ جس دین کو چاہیں اسے اپنا سکیں۔[1]

مذموم مقاصد کے حامل بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اسلامی فتوحات کی تحریک کا اصل سبب مال وزر کا حصول تھا، مگر اس دعویٰ کا بودا پن اس امر سے واضح ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اقتصادی مقاصد متحرک کرتے ہیں وہ اس طرح گھروں سے نہیں نکلتے کہ سب سے پہلے لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں اور اگر وہ مشرف باسلام ہو جائیں تو اپنے ہتھیار پھینک کر انہیں بھائیوں کی طرح گلے لگالیں اور پھر انہیں اسلامی تعلیمات سے فیض یاب کرنے لگ جائیں تاکہ وہ بھی اس خیر ربانی میں ان کے شراکت دار بن جائیں جو رب کائنات نے انہیں پہلے سے عطا کر رکھی ہے، اس قسم کے جھوٹے لوگ تاریخ پر جھوٹ باندھنے کے مرتکب ہوتے اور بہت بڑی علمی خیانت سے روسیاہ ہوتے ہیں۔[2]

اصل بات یہ ہے کہ امت اسلامیہ کے نفوس میں اسلامی وجود کی گہرائی ہی وہ اصل قوت تھی جس کی وجہ سے امت مسلمہ متحرک ہوئی، اگر اسلامی وجود اس کی گہرائی میں نہ اتر چکا ہوتا اور وہ اس کی تعلیمات کی کماحقہٗ نمائندگی نہ کر رہی ہوتی تو وہ اس قدر برق رفتاری کے ساتھ اتنی موثر اور فعال تحریک برپا کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتی، یہ امت، دین اسلام کے لیے بڑی حریص تھی اور اس پر پختہ ایمان رکھتی تھی اور اسے اس بات میں بڑی دلچسپی تھی کہ وہ اسے زمین کے گوشہ گوشہ میں عام کرے اور بنی نوع انسان کو اس سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کرے، فتوحات اسلامیہ کی اس تحریک کے دوران جس قسم کے عجیب وغریب واقعات پیش آئے ان کا صدور محض قوت کی وجہ سے ممکن نہیں تھا کتنی ہی سرکش اور متمرد قوتوں نے اپنی طاقت کو زمین میں اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لیے اندھا دھند استعمال کیا مگر وہ تاریخ عالم کے صفحات پر وہ عجائب رقم نہ کر سکی جو تحریک اسلامی کے حصے میں آئے۔ تلوار کے ذریعے زمین کو فتح کرنا تو ممکن ہے مگر وہ دلوں کو فتح نہیں کر سکتی، اسلامی فتوحات کی تحریک کے دوران جو کچھ ہوا وہ محض توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لیے ممکن نہیں تھا، دلوں کو فتح کرنے کا مقصد انہیں اسلام کے فیوض وبرکات سے مستفید کرنا تھا اور وہ ان سے اس حد تک مستفید ہوتے کہ اکثر علاقوں میں مفتوحہ اقوام اپنی مادری زبانوں کو بھول گئیں اور دین اسلام کی زبان (عربی) کو سرکاری زبان کے طور پر اپنالیا یہاں تک کہ غیر مسلم اقوام نے بھی۔ اگر فاتحین حقیقی مسلمان نہ ہوتے تو ایسا ہونا ممکن نہیں تھا، اور اگر وہ عقیدہ وعمل میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہوتے تو اسلامی فتوحات کے دوران ان عجائبات کا ظہور نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلی بحث:

بیزنطی حکومت کے خلاف تحریک جہاد

معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے میں ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ بیزنطی حکومت تھی، اگرچہ دولت بیزنطیہ مشرق میں شام اور مصر جیسے اہم ترین صوبوں سے محروم ہو چکی تھی مگر اس کا جسم ابھی تک صحیح وسالم تھا، اس کا دار الحکومت باقی تھا، اس میں مقابلے کی بے پناہ طاقت موجود تھی اور ابھی تک وہ مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آئی تھی، المختصر مسلمانوں کی اصل دشمن یہی حکومت تھی جو ایک بہت بڑے خطرے کی صورت میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اس خطرے سے بخوبی آگاہ بھی تھے اور وہ اس کا مقابلہ کرنے کی پوری پوری قدرت بھی رکھتے تھے۔ وہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں فتوحات کے آغاز سے ہی شام میں موجود تھے اور وہ تقریباً بیس سال تک اس کے والی رہے تھے۔ شام میں عرصہ دراز تک قیام کی وجہ سے انہیں بیزنطیوں کے احوال وظروف، ان کی سیاست اور ان کے اہداف کا وسیع تجربہ حاصل ہو گیا تھا جس نے انہیں ان کے

ساتھ معاملہ کرنے کی کیفیت سے آگاہ ہونے میں بڑی مدد دی۔ یہی وہ وجوہات تھیں جن کی ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے دولت بیزنطیہ کے ساتھ اپنی حدود اور تعلقات کو بڑی اہمیت دی اور اس کے لیے ایسا واضح سیاسی منصوبہ وضع کیا جس پر وہ خود اور ان کے بعد ان کے اموی خلفاء اپنی حکومت کے اختتام تک گامزن رہے، معاویہ رضی اللہ عنہ کے بنیادی مقاصد میں اہم ترین مقصد ان کے دار الحکومت قسطنطنیہ پر غلبہ حاصل کرنا تھا۔[1]

اولاً:... معاویہ رضی اللہ عنہ اور قسطنطنیہ

جب ۴۱ھ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کو استحکام حاصل ہو گیا تو انہوں نے اسلامی بحری بیڑے کو مزید ترقی دینے کے کام کا آغاز کیا تاکہ وہ روم کے دار الحکومت قسطنطنیہ کو جو کہ مسلمانوں کے خلاف عداوت کا مرکز اور ان کے سر پر دائمی خطرے کی صورت منڈلاتا رہتا تھا کو نیست و نابود کرنے پر قادر ہو سکیں جن سرکش عناصر کو رومی دولت اسلامیہ کے خلاف استعمال کرنے اور ان کی جاسوسی کے لیے استعمال کرتے تھے۔[2] معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کا خاتمہ کرنے کے بعد دشمن کی بحری جنگی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کے لیے اپنی بحری سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔[3] ان بحری حملوں کے مقاصد میں رومیوں کی نقل و حرکت سے آگاہ ہونا، ان کے بارے میں حساس نوعیت کی معلومات حاصل کرنا اور انہیں قبرص، آرواد اور رودس کے جزائر کو استعمال کرنے سے روکنا تھا جو کہ اسلامی بحری بیڑے کے خلاف فوجی تیاریوں کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

انہوں نے ۴۳ھ[1] کو سمندر میں بُسر بن ارطاۃ کی موسم سرما کی فوج کے ساتھ اطلاعاتی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور پھر اس کے بعد ۴۶ھ کو سرزمین روم میں مالک بن عبد اللہ کے موسم سرما کے دستے اور عبد اللہ بن قیس فزاری کے موسم گرما کے دستے کو بھیجا۔ مزید برآں عقبہ بن عامر جہنی، عبد اللہ کرز بجلی، عبد اللہ بن یزید بن شجر رہاوی کے موسم سرما اور گرما کے فوجی دستوں کو استعمال کیا گیا[2] اور موسم سرما و گرما کے فوجی دستوں کے نظام کو مستقل بنیادوں پر جاری رکھا گیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک واضح ہدف تھا اور وہ تھا قسطنطنیہ پر دباؤ ڈال کر دولت بیزنطیہ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرنا جو کہ اس پر قبضہ کرنے کی تمہید تھی اور شاید ان کا یہ بھی مقصد ہو کہ قسطنطنیہ پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد دولت بیزنطیہ پر قبضہ جما لیا جائے، اس لیے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ یہ سرکش دار الحکومت دولت بیزنطیہ کے اعصاب کا مرکز اور اموال و رجال کا مستقر ہے، اور سوچ و بچار کرنے والے ارباب دانش و بینش بھی ادھر ہی ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں، اگر ان کے ہاتھوں قسطنطنیہ کا سقوط ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجہ کے طور پر ساری کی ساری دولت بیزنطیہ بے بس ہو کر رہ جائے گی۔ اس وقت مسلمانوں کا اہل فارس کے ساتھ تجربہ ان کے سامنے تھا، دار الحکومت مدائن کے مسلمانوں کے ہاتھوں سقوط کے بعد اہل فارس بے یقینی کا شکار ہو گئے تو انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ان کی ریاست ختم ہو گئی۔ لہٰذا اگر وہ بیزنطی دار الحکومت کو گرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ ریاست کے سقوط کی وارننگ ہو گی اور اس طرح وہ ایک سرکش اور مرکزی دشمن سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، لہٰذا انہوں نے اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ اگر ہم یہ کہیں تو مبالغہ نہیں ہو گا کہ دولت بیزنطیہ تقریباً آٹھ سو سال تک قائم رہی اور اس کا یہ قیام دار الحکومت قسطنطنیہ کی بقاء کا مرہونِ منت تھا اس شہر کی محفوظیت اور اسے فتح کرنے کی امویوں کی لگاتار کوششوں کے سامنے اس کا جم کر کھڑے رہنا اس سلطنت کے سقوط کے لیے بہت بڑی رکاوٹ تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب انتیس مئی ۱۴۵۳ء بمطابق ۸۵۷ھ عثمانی سلطان محمد الفاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے بعد اس پر قبضہ کر لیا تو اس سے دولت بیزنطیہ کے سقوط اور وجود کے زوال کی راہ ہموار ہو گئی۔[3]

ثانیاً:... قسطنطنیہ پر قبضہ جمانے کے لیے معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی

معاویہ رضی اللہ عنہ اس امر کے خواہش مند تھے کہ پیش قدمی کی باگ ڈور ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہے اس لیے کہ وہی بحر متوسط کے جزائر کو افرادی قوت اور سامان حرب وضرب فراہم کرنے اور وہاں کے رہنے والوں کو مصر اور شام کے ساحل پر حملہ آور ہونے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، انہوں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کئی پہلوؤں پر کام کرنا شروع کیا:

۱۔ مصر اور شام میں کشتی سازی کے کارخانے قائم کرنا اور ان میں کام کرنے کے لیے اس فن کے ماہر ترین لوگوں کا انتخاب کرنا، انہیں بھاری تنخواہیں ادا کرنا اور ضروری ساز وسامان فراہم کرنا تاکہ وہ انتھک محنت کر کے اس کام کو آگے بڑھا سکیں۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنی عسکری حس اور قائدانہ فکر و نظر کی وجہ سے اس بات کا پورا پورا ادراک تھا کہ رومیوں کے ساتھ مسلمانوں کے معرکوں کا انحصار بحری بیڑے پر ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ احساس اس وقت مزید گہرا ہو گیا جب رومیوں نے پانچ سو سے زیادہ کشتیاں اسلامی بحری بیڑے کو نیچا دکھانے کے لیے ذات الصواری کے معرکہ میں جھونک دیں۔ اگرچہ رومیوں کو اس معرکہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ جنگی تیاریوں سے باز نہ آئے اور نہ ہی مسلمانوں کی بحری قوت کا سامنا کرنے کے لیے اپنی قوتوں کو جمع کرنے سے ہاتھ کھینچا۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ ابھی تک مسلمانوں کی بحری قوت تیاری کے ابتدائی مراحل میں ہے، لہٰذا ان کے لیے اس کا خاتمہ کرنا ممکن ہے، لہٰذا اب وہ توقع کرنے لگے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ آئندہ معرکہ دار الحکومت قسطنطنیہ کی دیواروں پر ہو گا، لہٰذا وہ اس کے لیے تیاری کرنے لگے۔[2]

کشتی سازی کے لیے مصر اور شام کے باہمی تعاون کے بڑے اچھے نتائج بر آمد ہوئے، شام میں کشتیاں تیار کرنے کے لیے انتہائی موزوں صنوبر، شاہ بلوط اور عرعر کی لکڑی وافر مقدار میں پائی جاتی تھی، جبکہ مصر میں صنوبر، ہلج اور دوم نامی درخت بڑی کثرت سے پائے جاتے تھے جن کی لکڑی کشتیوں کے مختلف حصوں میں استعمال ہوتی تھی۔[3] مصر، شام اور یمن میں لوہے کی کانیں بکثرت پائی جاتی تھیں، ان سے نکلنے والا لوہا کشتی سازی میں استعمال ہونے والی لوہے کی مختلف چیزیں بنانے میں استعمال کیا گیا، مصر میں موجود گندھک کے بڑے بڑے ذخائر تھے جسے اس صنعت کے لیے کام میں لایا گیا، الغرض مصر اور شام کے باہم تعاون نے اسلامی بحریہ کو ترقی دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا جس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ گئی جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۵۴ھ[4] میں مسلمہ بن مخلد انصاری کو جزیرہ روضہ میں کشتی سازی کا کارخانہ قائم کرنے کا حکم دیا، یہ بیزنطیوں کی طرف سے مصر پر کیے گئے حملے کے بعد کی بات ہے۔[5]

۲۔ مصر اور شام میں بحری سرحدوں کو مضبوط بنانا:... معاویہ رضی اللہ عنہ نے ساحلی شہروں کو محفوظ بنایا اور انہیں جہادی قوتوں سے اس طرح مضبوط مراکز میں تبدیل کر دیا کہ ان سے بحری افواج ایک جگہ سے دوسری جگہ جہاں چاہیں آزادانہ نقل و حرکت کر سکیں۔ انہوں نے ان شہروں کے لیے ایسا نظام وضع کیا جسے رباط کے نام سے جانا جاتا تھا، اس سے مقصود ایسے مقامات تھے جہاں دشمن کی سرزمین پر حملہ آور ہونے کے لیے لشکر جمع ہوا کرتے تھے انہوں نے اس نظام میں اس قدر دلچسپی لی کہ اس کا جہاد کے ساتھ بڑا گہرا ربط وضبط پیدا ہو گیا اور وہ جہاد ہی کا ایک حصہ قرار پایا اور اسلام کے لیے تڑپ رکھنے والے اور اس کی نصرت و معاونت کے لیے بے قراری کے ساتھ عمل کرنے والے مجاہدین اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔[1]

معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دیگر اعمال کی طرح نظام رباط کو بھی بتدریج آگے بڑھایا اور پھر رباط کو ایسے قلعوں میں تبدیل کر دیا جن میں لشکری بیزنطی بحری بیڑوں سے ان کے حملوں کی زد میں آنے والے علاقوں کا دفاع کرنے کے لیے جمع ہوتے۔ یہ رباط ساحلی علاقوں کے باشندوں کے لیے اس وقت پناہ گاہوں کا بھی کام دیتے جب انہیں بیزنطی کشتیوں سے اپنے علاقے کے پانیوں میں کوئی خطرہ محسوس ہوتا۔ یہ رباطی قلعے لشکریوں کے لیے کمروں اور رہائش گاہوں کے ساتھ ساتھ اسلحہ اور سامان خورد و نوش کے سٹورز پر مشتمل ہوتے اور جن پر نگرانی کے لیے بلند و بالا مینار بھی قائم کیے گئے تھے۔ پھر ان میں مزید وسعت آئی اور ان کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی کہ وہ دشمن پر حملہ کرنے کے مراکز میں تبدیل ہو گئے۔[2] ساحلی علاقوں میں لوگوں کو زمینوں کے عطیات دینے کی پالیسی کو جو کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بحری جنگی تیاریوں سے قبل تشکیل دی تھی، اسے بحری دفاعی سیاست کے آخری قدم کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے بحری اڈوں کی تکمیل ہوئی اور پھر ان میں بحری بیڑے تیار کیے جانے لگے۔ ساحلی شہروں کی آبادی اور ترقی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۴۲ھ میں بعلبک، حمص اور انطاکیہ سے لوگ گروہ در گروہ اردن کے ساحلی شہروں صور اور عکا وغیرہ میں منتقل ہو گئے، اسی طرح معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان دونوں شہروں کے قلعوں کی بھی اصلاح کی اور خاص طور پر عکا کے قلعہ پر خصوصی توجہ دی جہاں سے نکل کر انہوں نے قبرص پر پہلا بحری حملہ کیا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے تمام ساحلی شہروں کو خصوصی توجہ دی اور حالات و ضروریات کے مطابق ان کے لیے ضروری ترقیاتی اقدامات لیے۔[3]

۳۔ بحر متوسط کے مشرق میں واقع جزائر پر قبضہ:... اس کا آغاز جزیرہ قبرص پر قبضہ سے ہوا، پھر انہوں نے ایک دوسرے اہم جزیرہ پر قبضہ کر لیا جو کہ رودس کے نام سے معروف ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس جزیرہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس میں قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور اس کے دفاع کے لیے وہاں مسلمانوں کی ایک جماعت کو متعین کر دیا اور اسے رباط قرار دے کر انہیں شام کے دفاع کی ذمہ داری بھی تفویض کر دی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ رودس میں مسلمانوں کو دینی ماحول میں رنگ دیا جائے اور اس کے باسیوں میں اسلام کا پرچم بلند کیا جائے، چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے لیے وہاں کے لوگوں کو قرآنی تعلیمات سے آشنا کروانے کے لیے مجاہد بن جبر رحمہ اللہ نامی عالم و فقیہ کو بھیجا جو لوگوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔[4]

ثالثاً:... قسطنطنیہ کا پہلا محاصرہ

معاویہ رضی اللہ عنہ نے (۴۸-۴۷ھ) کے دوران قسطنطنیہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بیزنطی سرزمین پر غارت گری کے لیے کئی لشکر بھیجے،[8] مالک بن ہبیرہ نے موسم سرما بیزنطی علاقے میں گزارا اور ۴۹ھ بمطابق ۶۶۹ء کو قسطنطنیہ شہر کا پہلا اسلامی محاصرہ دیکھنے میں آیا، سلطنت بیزنطیہ کے دو کمانڈروں سیلیوس اور میزیریوس کی اپنے حکمرانوں کے خلاف سرکشی نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو فضالہ بن عبید لیثی اور سفیان بن عوف عامری کی قیادت میں بری اور بحری لشکر قسطنطنیہ بھیجنے پر اکسایا جہاں یزید بن شجرہ زہاوی[9] ان کی مدد کے لیے پہلے سے تیار بیٹھا تھا، اسلامی بحری بیڑے نے خلقیدونیہ پہنچ کر اس میں داخل ہونے کے لیے اس کا محاصرہ کر لیا مگر موسم سرما کی شدت اور اکثر فوجیوں کے چیچک میں مبتلا ہونے کی وجہ سے شہر کا محاصرہ کرنے والے لشکر کے لیے حالات انتہائی مشکل بنا دیئے گئے جس کی وجہ سے بری فوج کے کمانڈر فضالہ بن عبید لیثی نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے مزید دستے بھجوانے کی درخواست کی تو اس کے جواب میں انہوں نے جو لشکر ادھر روانہ کیا اس میں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے جن میں عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن زبیر، عبد اللہ بن عمرو بن العاص اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم قابل ذکر ہیں،[1] اس لشکر کا جنرل کمانڈر یزید

بن معاویہ بن ابوسفیان تھا، جب یزید اپنے لشکر کے ہمراہ خلقیدونیہ پہنچا تو وہاں پہلے سے موجود ڈیرہ ڈالے لشکر کے ساتھ شامل ہو گیا اور پھر ان دونوں نے مل کر قسطنطنیہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور پھر اس کی دیواروں کے پیچھے مورچہ زن ہو کر اس کا محاصرہ کر لیا جو چھ ماہ تک جاری رہا، اس دوران فریقین میں گاہے بگاہے جھڑپیں ہوتی رہیں، اس محاصرے کے دوران یزید نے بڑی جوانمردی اور حوصلہ مندی کا مظاہر کیا اور شجاعت و سیاست کی ایسی نادر مثالیں قائم کیں جس کی وجہ سے بعض مورخین اسے "فتی العرب"[2] (عرب نوجوان) کے لقب سے ملقب کرنے لگے، اس دوران اگر مسلم سپاہ کو شدید قسم کی موسمی مشکل حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا تو اس کی کامیابی یقینی تھی، مثلاً شدید سردی اور موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے غذائی اشیاء کی شدید قلت پیدا ہو گئی اور مجاہدین متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گئے، علاوہ ازیں انہیں شہر کی مضبوط حفاظتی دیواروں کا بھی سامنا تھا، ان مایوس کن حالات میں انہوں نے شہر کا محاصرہ ختم کر کے فی الحال واپس شام لوٹ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔[3]

غزوہ قسطنطنیہ کا شمار دلائل نبوت میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دیتے ہوئے اور فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: "میری امت کا پہلا لشکر جو شہر قیصر سے جنگ کرے گا اس کی مغفرت فرما دی گئی ہے۔"[4] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مغفرت کی اس بشارت کی جستجو میں متعدد کبار صحابہ رضی اللہ عنہم اس غزوہ میں شریک ہوئے۔[5]

رابعاً:... قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات

ابو ایوب خالد بن زید بن کلیب انصاری رضی اللہ عنہ جنگ بدر، عقبہ اور تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ آپ خوارج کے ساتھ جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر رہے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر قیام فرمایا اور پھر ایک ماہ تک ان کے پاس ہی مقیم رہے، پھر جب آپ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد اس کے آس پاس اپنی رہائش گاہ تعمیر کر لی تو اس میں منتقل ہو گئے۔[6]

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بصرہ کے والی تھے تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے تو انہوں نے آپ کا بہت زیادہ اکرام کیا اور فرمایا: میں تمہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمان نوازی کا صلہ دوں گا، اس وقت ان کے پاس تقریباً چالیس ہزار درہم موجود تھے انہوں نے وہ ساری رقم ان کی خدمت میں پیش کر دی۔[1] دوسری روایت میں ہے: جب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کے لیے گھر کی تمام اشیاء سے دست بردار ہو گئے۔ مزید برآں انہوں نے ان کی خدمت میں کئی تحائف، بہت سارے خدمت گزار، چالیس غلام اور چالیس ہزار دینار پیش کیے، ان کی یہ عزت اس لیے کی گئی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر مہمان کے طور پر ٹھہرایا تھا، اور جو اُن کے لیے بڑے شرف کا باعث تھا۔[2] جب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ان سے کہا: کیا آپ نے وہ کچھ نہیں سنا جو لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟ ان کا اشارہ واقعہ افک کی طرف تھا۔ تو انہوں نے اس سے دریافت کیا: ام ایوب! کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہرگز نہیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا: اللہ کی قسم! عائشہ رضی اللہ عنہا تم سے بہت بہتر ہیں۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری: [3]

﴿لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ (النور: ۱۲)

"اسے سنتے ہی مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے حق میں نیک گمانی کیوں نہ کی۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے درمیان مواخات قائم کی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی وفات سرزمین روم میں قسطنطنیہ کی دیوار کے قریب ہوئی۔ اس وقت آپ یزید بن معاویہ کے لشکر میں شامل تھے اور اسی نے ہی آپ کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔[4] ایک دوسری روایت میں آتا ہے: دوران جنگ ابوایوب رضی اللہ عنہ بیمار ہوگئے تو انہوں نے فرمایا: جب میری موت واقع ہو جائے تو میری میت کو اٹھالینا اور جب دشمن تمہارے سامنے آئے تو مجھے اپنے قدموں میں پھینک دینا۔ خبردار! میں تمہیں وہ حدیث سناتا ہوں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے: "جو آدمی اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہرایا وہ جنت میں داخل ہوگیا۔"[5] ابوایوب رضی اللہ عنہ کو قسطنطنیہ کی دیواروں کے پاس دفن کیا گیا۔ جن لوگوں نے آپ کو دفن کیا ان سے رومی کہنے لگے: اے عرب گروہ! آج رات تمہارے لیے کوئی خاص بات تھی۔ انہوں نے جواب دیا: ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص کی موت واقع ہوگئی تھی۔[6]

قسطنطنیہ کی فتح اور دولت عثمانیہ کی آمد کے بعد ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو خلافت عثمانیہ میں بڑا عظیم مقام و مرتبہ حاصل ہوگیا۔ عثمانی سلاطین میں سے جب بھی کوئی تخت نشین ہوتا تو وہ مسجد ابوایوب رضی اللہ عنہ میں ایک دینی اجتماع کا انعقاد کرتے اور حکومت حاصل کرنے کی علامت کے طور پر گلے میں تلوار حمائل کرتے۔ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو سب ترکوں میں ولی اللہ کا رتبہ حاصل تھا، ایمان سے لبریز دل ان کی طرف لپکے چلے آتے اور وہ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے میزبان کی حیثیت سے دیکھتے جس نے انتہائی مشکل حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا، انہیں مجاہدین میں بھی بڑی قدر و منزلت حاصل تھی وہ ان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیافت اور جہاد فی سبیل اللہ کو ان کی عظیم ترین منقبت اور عظیم الشان کارنامہ خیال کرتے تھے۔[1] ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ انہیں دشمن کی زمین کے آخری حصہ میں دفن کیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ زندہ یا مردہ ہر حالت میں دشمن کی زمین کے اندر تک جائیں۔ گویا کہ انہوں نے جو کچھ زندگی میں حاصل کیا ان کے لیے وہ کافی نہیں تھا، لہٰذا انہوں نے اپنی موت کے بعد اس میں مزید اضافے کی تمنا کی اور یہ وہ چیز ہے جس کے علاوہ ایک حقیقی مجاہد کا اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔[2]

ہم اپنی زندگی میں اس عجیب و غریب چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض مسلمانوں کی خواہش ہوتی ہے کہ اگر اس کی بیرون ملک موت واقع ہو جائے تو اسے واپس لاکر اس کے ملک میں دفن کیا جائے، حالانکہ ساری زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اور سارے شہر بھی اسی ذات اقدس کے ہیں۔ جب ابوایوب رضی اللہ عنہ غزوہ قسطنطنیہ کے لیے روانہ ہوئے اس وقت وہ بہت زیادہ بوڑھے ہو چکے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ فرماتا ہے: ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾ (التوبۃ: ۴۱) "نکل کھڑے ہو ہلکے پھلکے ہو تو بھی بھاری بھرکم ہو تو بھی۔" میں ہلکا پھلکا ہوں یا پھر بھاری بھرکم۔[3] ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ لوگوں کو کتاب اللہ اور مفاہیم اسلام کا صحیح فہم دیا کرتے تھے۔ ابو عمران تجیبی کہتے ہیں: ہم قسطنطنیہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے روانہ

ہوئے تو اس جماعت کے قائد عبد الرحمن بن خالد بن ولید تھے۔ رومیوں نے اپنی پیٹھیں قسطنطنیہ کی دیوار کے ساتھ لگا رکھی تھیں۔ ایک آدمی نے دشمن پر حملہ کیا تو لوگ کہنے لگے: رک جا، رک جا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ یہ شخص اپنے آپ کو تباہی سے دوچار کر رہا ہے۔ اس پر ابو ایوب رضی اللہ عنہ کہنے لگے: یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت فرمائی اور اسلام کو غلبہ عطا فرمایا تو ہم نے کہا: آؤ اب ہم اپنے مالوں کی نگرانی کرتے اور ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّہْلُکَۃِ﴾ (البقرۃ: ۱۹۵)

''اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں ڈالنا یہ ہے کہ ہم اپنے اموال میں ہی مگن رہیں اور جہاد ترک کر دیں۔ ابو عمران فرماتے ہیں: ابو ایوب رضی اللہ عنہ ہمیشہ جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ قسطنطنیہ میں مدفون ہوئے۔[1] یہ حدیث بتاتی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر کے اموال میں مصروف ہو جانا کس قدر خطرناک ہے اور یہ کہ حقیقی ہلاکت آخرت کی ہلاکت ہے اور جس کا سبب واجبات اسلام کی ادائیگی میں کاہلی و سستی دکھانا ہے۔[2]

خامساً:... قسطنطنیہ کا دوسرا محاصرہ

معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسلسل فوجی حملوں اور رودس و ارواد نامی جزائر پر قبضہ جما کر دولت بیزنطیہ پر دباؤ برقرار رکھا، قسطنطنیہ سے قریب ہونے کی وجہ سے جزیرہ ارواد بڑی اہمیت کا حامل تھا، شہر کے دوسرے حصار یا (۶۰-۵۴ھ) [3] کی سات سالہ جنگ کے دوران اسلامی بحری بیڑے نے اس جزیرے کو اپنی جنگی کارروائیوں کے لیے اڈے کے طور پر استعمال کیا۔ بحری کشتیاں اس جزیرہ سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرنے کے لیے مسلمان سپاہ کو خشکی پر منتقل کرتیں، شہر کا بری اور بحری محاصرہ ماہ اپریل سے ماہ ستمبر تک جاری رہا، اس دوران صبح سے لے کر شام تک فریقین ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے۔ یہ صورت حال سات سال تک برقرار رہی یہاں تک کہ اس نے بیزنطیوں کو زچ کر دیا۔ ان کے لیے بڑی خوفناک صورت حال پیدا کر دی[4] اور انہیں زبردست نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود مسلم افواج نہ تو شہر میں داخل ہو سکیں اور نہ ہی اس کی دیواروں کا دفاع کرنے والوں پر غلبہ حاصل کر سکیں۔ اس کے متعدد اسباب تھے جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔[5]

۱۔ بیزنطیوں نے ان معرکوں میں ایک ایسی آگ استعمال کی جسے انہوں نے بحری یا افریقی آگ سے موسوم کیا اور جو تیل اور گندھک کے کیمیائی مرکب سے عبارت تھی، اس مرکب کو کشتیوں پر پھینکا جاتا تو ان میں آگ بھڑک اٹھتی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ جب یہ آگ پانی کو چھوتی تو مزید بھڑک اٹھتی۔ یہ تباہ کن کیمیائی مرکب جس نے مسلمانوں کی متعدد کشتیوں اور ان کے لشکروں کو تباہی سے دوچار کر دیا تھا کالینکوس نامی شامی الاصل ایک انجینئر کی اختراع تھا۔ یہ آدمی پہلے مسلمانوں کی خدمات سرانجام دیا کرتا تھا بعد ازاں قسطنطنیہ بھاگ گیا اور اپنی صلاحیت اور تجربے کو بیزنطیوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔[6] یہ جدید ہتھیار ان عوامل میں سے اہم ترین تھا جنہوں نے بیزنطیوں کی بھرپور مدد کی اور وہ دار الحکومت کا دفاع کرنے کے قابل ہوئے اور مسلمانوں کے خلاف ڈٹے رہے۔ یہ ہتھیار ایسا مخفی راز تھا جس سے اس صنعت کے چند ماہرین ہی آگاہ تھے، وہ لوگ اس

اسلحہ کے ساتھ اپنے حلفاء کی مدد تو کرتے تھے مگر اس کی ٹیکنالوجی سے کسی کو آگاہ نہیں کرتے تھے، تقریباً چار صدیاں بیت گئیں مگر اس کے ایجاد کنندہ کے علاوہ کوئی بھی اس کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکا۔ آخر سن دس میلادی میں ماہرین اس آگ کے راز سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے اس کے عناصر ترکیبی سے پردہ اٹھایا اور لوگوں کو ان وسائل سے آگاہ کیا جن کے استعمال سے اسے بجھایا جا سکتا ہے۔ اس اسلحہ نے مزید ترقی کی تو اس نے دھماکہ خیز اشیاء کی شکل اختیار کر لی جسے منجنیقوں کی مدد سے دشمن پر پھینکا جاتا جس سے ایک شعلہ بلند ہوتا اور ساتھ ہی دھویں کا بادل اٹھتا اور خوفناک آواز سنائی دیتی، اس اختراع نے مسلم سائنسدانوں کی توجہ حاصل کی تو اس بارے میں سوچ وبچار اور تحقیق کرنے لگے اور آخر کار وہ سن گیارہ میلادی کے آغاز میں اس کی ٹیکنالوجی سے آگاہ ہو گئے اور پھر انہوں نے اس میں متعدد تبدیلیاں کر کے اسے پہلے سے زیادہ تباہ کن اور افریقی آگ سے زیادہ بھڑک دار بنا دیا۔ مسلمانوں نے اس تباہ کن ہتھیار کو سرزمین شام میں صلیبیوں کے ساتھ اپنی جنگوں میں استعمال کیا جس سے ان پر ضرب کاری لگی اور وہ مرعوبیت اور گھبراہٹ کا شکار ہو گئے، اس وقت سے یہ آتشیں ہتھیار اسلامی آتشیں ہتھیار کے نام سے معروف ہو گیا۔[1] ڈاکٹر ابراہیم العدوی رقمطراز ہیں: مسلمانوں کے پاس موجود اس جدید ہتھیار کی شناخت سے ان کے دشمن بے بس ہو گئے اور یہ اسلامی آتشیں ہتھیار چودھویں صدی تک ان کے استعمال میں رہا۔ اسے ترقی دینے کے لیے اس میں بہت ساری تبدیلیاں کی گئیں اور جس کا نتیجہ بارود کی صورت میں سامنے آیا۔ اس بنا پر اسلامی آتشیں ہتھیاروں کو جنگ کے مختلف طریقوں میں اس خطرناک انقلاب کی بنیاد تسلیم کیا جاتا ہے جس سے نئی دنیا آشنا ہوئی اور اس سے مسلمانوں نے ثابت کر دیا کہ وہ دشمن کے کسی بھی ہتھیار کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے نہیں رہتے اور یہ کہ وہ اس چیز کے استعمال پر قادر ہیں جس میں ان کی منفعت پنہاں ہو۔[2] ہم اللہ رب کائنات سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو امریکی اور مغربی فوجی برتری کا توڑ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

۲۔ لوہے کی بھاری بھرکم زنجیر جو کہ قسطنطنیہ کی بندرگاہ اور ایشیائی ساحل کے درمیان حائل تھی جسے حالت جنگ یا محاصرے کی وارننگ کے دنوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔[3]

۳۔ بھاری بھرکم اندرونی اور بیرونی دیواریں، جن پر نگرانی کے لیے بڑے بڑے ٹاورز بنائے گئے تھے، جن سے دشمن کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے اور اس کی طرف سے کسی فوری کاروائی کو روکنے میں بڑی مدد ملتی۔

۴۔ سمندری پانیوں پر ایک دوسرے سے جڑے شہروں کے محاصرہ کے بارے میں اموی حکومت کی ناتجربہ کاری، جن میں سے قسطنطنیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے لیے جدید ترین ہتھیاروں کی ضرورت تھی جو کہ اس وقت تک اموی حکمرانوں کے پاس موجود نہیں تھا۔[4]

۵۔ دولت امویہ اور دولت اسلامیہ کی حکمت عملی، متعدد عوامل نے قسطنطنیہ کو سقوط سے محفوظ رکھنے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ مثلاً شہر کی طبیعی محفوظیت، افریقی آتش، موسمی شدت، بحر اسود سے اٹھنے والی شدید ترین سمندری لہریں، مسلمان سپاہ نے اگرچہ بڑے صبر و استقلال اور شجاعت و دلیری کا مظاہر کیا مگر وہ مندرجہ بالا عوامل کی وجہ سے شہر پر قبضہ کرنے میں ناکام رہیں، اور آخر کار دونوں حکومتیں شہر کا محاصرہ ختم کرنے کے لیے مذاکرات کرنے پر آمادہ ہو گئیں، یہ مذاکرات فریقین میں صلح کے معاہدہ پر منتج ہوئے اور اس کی رو سے اسلامی لشکر اور اسلامی بحری بیڑہ شام واپس لوٹ گیا۔ شہر کے محاصرہ کے دوران میں معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ محاصرہ اپنا ہدف حاصل کیے بغیر طویل سے طویل تر ہوتا چلا جا

رہا ہے، پھر جب ان کی عمر کافی زیادہ ہو گئی اور انہوں نے اپنی موت کو قریب آتے دیکھا تو انہوں نے بہتر سمجھا کہ شہر کے ارد گرد خیمہ زن ان کے لشکر کو واپس لوٹ جانا چاہیے تا کہ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے یزید کو جن مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے وہ ان کے ساتھ آسانی سے نمٹ سکے۔ مسلم سپاہ کی طرف سے دارالحکومت کے طویل محاصرہ کی وجہ سے دولت بیزنطیہ کو بھی شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، لہٰذا وہ بھی اس صورت حال کو ختم کرنے کی شدت سے خواہش مند تھی، چنانچہ اس نے بڑے ذہین و فطین اور معروف سفارت کار یوحنا کو دمشق بھیجا، اس بیزنطی سفیر نے اموی خاندان کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ متعدد ملاقاتیں کیں جن کے دوران اس نے دولت اسلامیہ کے لیے بڑے احترام کا اظہار کیا جس کی وجہ سے وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اپنے لیے عزت و احترام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے طرفین میں صلح کے مذاکرات کامیابی سے ہمکنار ہو گئے۔ اس معاہدہ کے بعد دارالحکومت کے سامنے پڑاؤ ڈالنے والی قوات اسلامیہ نے شام واپسی کا راستہ اختیار کیا۔[1]

سادسًا:... دونوں حکومتوں میں پرامن باہمی تعلقات

اگرچہ خلافت راشدہ اور اموی دور حکومت میں مسلسل حرکت جہاد کی وجہ سے دولت اسلامیہ اور دولت بیزنطیہ کے درمیان تعلقات پر فوجی اور عسکری رنگ غالب رہا مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ فریقین میں پرامن تعلقات کا یکسر فقدان تھا۔ باہمی مذاکرات اور تبادلہ خیالات کی صورت میں دونوں حکومتوں میں پرامن تعلقات کی بھی عکاسی ہوتی ہے، ان تعلقات نے اموی دور حکومت میں مختلف شکلیں اختیار کر لی تھیں، مثلاً باہم خط و کتابت، تجربات کا تبادلہ، ثقافتی میدانوں میں بحث و مباحثہ قیدیوں اور سفیروں کا تبادلہ وغیرہ۔[2]

ا۔ مراسلت:... ایام فتنہ کے دوران معاویہ رضی اللہ عنہ نے قیصر روم کے ساتھ خط و کتابت کی جس کی وجہ سے وہ اس شرط پر صلح کا معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ قیصر روم کو کچھ مال ادا کریں گے اور طرفین ایک دوسرے سے کچھ لوگوں کو اپنے اپنے ہاں گروی رکھیں گے۔ پھر جب رومیوں نے عہد شکنی کی تو معاویہ رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں نے انہیں قتل نہ کیا اور انہیں واپس جانے کی اجازت دے دی۔[1] الغرض ان جیسے مواقع پر اصولی طور پر دولت اسلامیہ کو طاقت کے اسباب اختیار کرنے میں سستی و کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا، تا کہ دشمن ان کی کمزوری سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ اسلامی ریاست کو اس قدر طاقت ور ہونا چاہیے کہ دشمن اس سے خوف محسوس کریں اور ان کے بارے میں اپنے مذموم عزائم کو کامیاب نہ کر سکیں اور اگر وہ کسی وقت کمزوری سے دوچار ہو جائے یا اسے مال خرچ کر کے کسی ضرر رساں صورت حال کو ختم کرنے کی ضرورت پڑے تو ایسا ضروریات کے زمرے میں آئے گا اور یہ حکم عام نہیں ہو گا۔ جو چیز ضرورت کے تحت مباح ہوتی ہے اسے بقدر ضرورت ہی اختیار کیا جا سکتا ہے جیسا کہ فقہائے کرام نے قرار دیا ہے۔[2] مال و زر کے بدلہ میں دشمن کے ساتھ دائمی صلح کرنا قطعاً غیر مناسب ہے۔ ایسی صلح مسلمانوں کی کمزوری کے عرصہ کے لیے یا ضرورت کی حالت میں ہونی چاہیے اور اس دوران کمزوری کی حالت کو ختم کرنے اور امت اسلامیہ کی قوت کے لیے اسے ضروری صلاحیتیں فراہم کرنے کے لیے بڑی سنجیدگی اور عزم کے ساتھ بھرپور کوششیں کرنی چاہئیں، پھر جب اس قسم کے حالات ختم ہو جائیں تو پھر مسلمانوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی بھی ایسا معاہدہ کرنے سے باز رہیں جس میں ان کی ذلت پنہاں ہو یا وہ ان کے لیے خرابی و فساد کا باعث بن سکتا ہو۔[3] خلاصہ کلام یہ کہ دولت اسلامیہ کے لیے بقدر ضرورت کوئی اضطراری معاہدہ کرنا جائز ہے، مگر ضرورت کے اختتام کے ساتھ ہی ایسا معاہدہ ختم ہو جانا چاہیے۔[4]

طرفین میں خط و کتابت صرف عسکری حوالے سے ہی نہیں رہتی تھی بلکہ بعض مراسلات علمی اور امور عامہ کے پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ قیصر روم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا: مجھے اس سے پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے اور پانچویں حکم کے بارے میں بتائیں جو اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہیں۔ وہ چار چیزیں کون سی ہیں جن میں روح تو موجود ہے مگر وہ رحم مادر میں نہیں رہیں؟ وہ کون سی قبر ہے جو صاحب قبر کو لے کر چلتی رہی؟ زمین میں وہ کون سی جگہ ہے جس تک سورج کی ایک ہی بار رسائی ہوئی؟ اس نے اس قسم کے اور بھی کئی سوالات کیے۔ اس کے جواب میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھا: اللہ تعالیٰ کا سب سے محبوب کلمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" ہے اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں کرتا اور یہی حکم نجات دہندہ ہے، دوسرا کلمہ "سبحان اللّٰہ" ہے جو کہ مخلوق کی عبادت ہے۔

ثالثاً :... جراجمہ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں

معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں مسلمانوں اور بیزنطیوں کے درمیان ہونے والی جنگوں اور جنگی حملوں میں ایک تیسرا فریق بھی ملوث تھا جو جرجومہ شہر کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر "جراجمہ" کہلاتا تھا۔[3] ان کے اصول غیر معروف ہیں۔ بلاذری اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ لوگ نصرانی تھے اور انطاکیہ کے جرنیل اور اس کے حکمران کے پیروکار تھے۔[4] جب مسلمانوں نے بلاد شام کو فتح کیا تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ عامر بن جراح نے حبیب بن مسلمہ فہری کو ان سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا مگر انہوں نے ان سے جنگ کرنے کی بجائے امان اور صلح کا مطالبہ کر دیا۔ انہوں نے یہ صلح اس شرط پر کی کہ وہ مسلمانوں کی مدد دیں گے، جبل لکام میں ان کے لیے کام کریں گے، اور یہ کہ ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا اور اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ مل ان کے دشمنوں سے جنگ کریں گے تو وہ جن لوگوں کو قتل کریں گے ان سے حاصل کردہ مال و اسباب ان کے حوالے کیا جائے گا۔[5] مگر جراجمہ کچھ ہی عرصے بعد اس معاہدے سے منحرف ہو گئے اور مسلمانوں اور بیزنطیوں کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دی اور اس طرح ایشیا صغریٰ میں فتوحات اسلامیہ کی پیش قدمی کو روک دیا، وہ کبھی مسلمانوں کا ساتھ دیتے اور کبھی رومیوں کا، یہ لوگ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں ہی نہیں بلکہ عبدالملک کے عہد خلافت تک عساکر اسلامیہ کے لیے دردِ سر بنے رہے۔ بعد ازاں جب یہ لوگ بلاد شام اور ایشیا صغریٰ میں ادھر ادھر پھیل گئے تو ان کی طرف سے مسلمانوں کو لاحق خطرات میں کمی آ گئی۔[6] بہر حال ہم یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ قسطنطنیہ تک رسائی کے لیے معاویہ رضی اللہ عنہ نے جس قدر بھی کوششیں کیں اگرچہ وہ ان کی زندگی میں ثمر آور نہ ہو سکیں مگر انہوں نے بعد میں آنے والے خلفاء کے لیے اپنے جاری کردہ مشن کو کامیاب بنانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا۔[7]

ثامناً:... ارض روم کا غازی ابو مسلم خولانی

ابو مسلم خولانی کا شمار اس دور کے ان عظیم لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے مسلم معاشرے اور فتوحات اسلامیہ کی تحریک میں بڑا مثبت اور اہم کردار ادا کیا۔ ان کے بارے میں امام ذہبی رقمطراز ہیں: سید التابعین، زاہد عصر ابو مسلم خولانی کا نام صحیح قول کی رو سے عبداللہ بن ثوب ہے۔[1] جب وہ مدینہ منورہ آئے تو اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے تھے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا تھا،[2] انہوں نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے اسود عنسی کا راستہ روکنے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا، اس فتنہ کے دوران ابو مسلم اسلام پر ثابت قدم رہے۔

نبوت کے جھوٹے دعوے دار اسود عنسی نے انہیں دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا مگر آپ کو اس سے کوئی گزند نہ پہنچی۔ اسود سے کہا گیا: اگر تو نے اسے یہاں سے نہ نکالا تو یہ تیرے پیروکاروں کو برباد کر دے گا۔ اس پر اس نے انہیں وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا تو آپ مدینہ منورہ چلے آئے۔ اپنی سواری بٹھائی اور مسجد نبوی میں داخل ہو کر نماز ادا کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھا تو ان سے پوچھا: آپ کہاں سے آئے؟ انہوں نے جواب دیا: یمن سے۔ انہوں نے پھر دریافت کیا: اس آدمی کا کیا بنا جسے کذاب نے نذر آتش کر دیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: وہ عبداللہ بن ثوب تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم وہی ہو؟ انہوں نے اس کا جواب اثبات میں دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں گلے لگا کر رونے لگ گئے۔ پھر ان کے ساتھ گئے اور انہیں اپنے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان بٹھا دیا اور فرمانے لگے: میں اس اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس نے مجھے موت نہ دی یہاں تک کہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں وہ آدمی دکھا دیا جس کے ساتھ اس نے وہی سلوک کیا جو سلوک اس نے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔[3] عہد معاویہ میں دنیا میں موجود اس تابعی کبیر کا تعلق اہل شام کے ساتھ تھا جن سے بہت ساری مخلوق متاثر ہوئی۔ خولانی رحمہ اللہ بہت بڑے عبادت گزار تھے۔ ابو عاتکہ کہتے ہیں: ابو مسلم نے مسجد میں ایک کوڑا لٹکا رکھا تھا۔[4] آپ فرمایا کرتے تھے: میں اس کوڑے کا حیوانات سے زیادہ حق دار ہوں، جب آپ عبادت کرتے کرتے تھک جاتے تو اپنی پنڈلیوں پر ایک یا دو کوڑے برسا دیتے۔ شرحبیل سے مروی ہے کہ دو آدمی ابو مسلم سے ملاقات کرنے کے لیے آئے مگر وہ اس وقت گھر میں نہیں تھے، وہ مسجد میں آئے تو انہیں نماز پڑھتے پایا جس پر وہ ان کا انتظار کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے شمار کیا کہ انہوں نے تین سو رکعت نماز ادا کی ہے۔[5] ابو مسلم جب بھی باران رحمت کے لیے دعا کرتے بارش برسنے لگتی۔[6] آپ بڑے مستجاب الدعوات تھے۔ محمد بن زیاد ابو مسلم سے روایت کرتے ہیں کہ کسی عورت نے ان کی بیوی کو خراب کرنا چاہا تو آپ نے اس کے لیے بد دعا کی جس سے وہ اندھی ہو گئی۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور توبہ کرنے لگی۔ آپ نے عرض کیا: یا اللہ! اگر یہ صدق دل سے توبہ کر رہی ہے تو اس کی بینائی واپس لوٹا دے۔ اس پر اس کی بینائی بحال ہو گئی۔[7] آپ ارض روم میں جہاد میں شریک رہے، مروی ہے کہ جب وہ کسی دریا پر آتے تو فرماتے: اللہ کا نام لے کر دریا سے پار گزر جاؤ۔ پھر آپ اپنے ساتھیوں کے سامنے دریا سے پار گزر جاتے اور پھر وہ بھی گہرا دریا عبور کر جاتے پھر جب وہ دریا عبور کر جاتے تو فرماتے: اگر کسی کی کوئی چیز گم ہو گئی ہو تو اس کا ضامن میں ہوں۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک آدمی نے اپنی کوئی چیز گم کر دی۔ جب آپ دریا سے پار گزر گئے تو وہ کہنے لگا: میری فلاں چیز گم ہو گئی ہے۔ انہوں نے فرمایا: میرے پیچھے پیچھے آئیں۔ وہ آپ کے پیچھے چلا تو دیکھا کہ وہ دریا میں ایک لکڑی کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے، آپ نے فرمایا: اسے پکڑ لو۔[1] حکمران ابو مسلم کے ساتھ برکت حاصل کیا کرتے اور مقدمات پر انہیں امیر بنایا کرتے تھے۔[2] آپ رحمہ اللہ نے ارض روم میں وفات پائی۔ آپ بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کے ساتھ موسم سرما کی جنگوں میں شریک ہوا کرتے تھے، اسی دوران ان کی موت واقع ہو گئی۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی موت کا علم ہوا تو فرمانے لگے: اصل مصیبت تو ابو مسلم خولانی رحمہ اللہ اور کریب بن سیف انصاری رحمہ اللہ کی وفات سے ٹوٹی۔[3] آپ کا شمار دانا لوگوں میں ہوتا تھا، ان سے اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر راضی رہنے کے بارے میں ان کا یہ قول مروی ہے: اگر میرے ہاں ایسا بیٹا پیدا ہو جسے اللہ تعالیٰ بڑی اچھی طرح نشو و نما دے یہاں تک کہ جب وہ بھرپور جوانی کو پہنچ جائے اور وہ میرے لیے سب سے بڑھ کر خوش کن ہو تو اللہ تعالیٰ اسے مجھ سے واپس لے لے تو مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ پسند ہے۔

[4] [1] سیر اعلام النبلاء: ۴/۱۱. [2] ایضاً: ۴/۱۳. [3] ایضاً: ۴/۱۴. [4] صفة الصفوة: ۴/۲۱۳۔ حلیة الاولیاء: ۲/۱۲۷. [5] التاریخ الاسلامی: ۱۹/۳۵۶.

یہ ابو مسلم عبد اللہ بن ثوب خولانی رحمہ اللہ کے کمال توحید کی دلیل ہے اور وہ یوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تکلیف دہ فیصلوں پر صبر کے مرحلے سے گزر کر قضا وقدر پر راضی رہنے کے مرحلہ تک جا پہنچے اور انہوں نے خوبصورت اور کڑیل جوانی کے حامل لخت جگر کی موت کو اپنے لیے دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں سے پسندیدہ قرار دے دیا۔[5]

دوسری بحث:

عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں شمالی افریقہ کی فتوحات

اولاً:... معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ کا حملہ

معاویہ بن حدیج کندی رضی اللہ عنہ شرف صحابیت سے مشرف ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم روایات نقل کی ہیں۔ ان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مروی ہے: "اگر کسی چیز میں شفا ہے تو وہ شہد پینے، سینگی لگوانے یا ڈم دینے میں ہے، مگر میں ڈم لگوانا پسند نہیں کرتا۔"[1]

ان کا شمار اشراف کندہ میں ہوتا ہے۔ آپ کی بادشاہت کو تسلیم کیا جاتا تھا[2] اور آپ بہترین امراء میں سے تھے۔ عبد الرحمن بن شماسہ کہتے ہیں: میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھ سے دریافت فرمایا: تم کن لوگوں میں سے ہو؟ میں نے کہا: اہل مصر سے۔ انہوں نے دریافت کیا: تم نے ابن حدیج کو کیسا پایا؟ میں نے جواب دیا: وہ بہت اچھے امیر ہیں، جس کے پاس گھوڑا نہ ہو اسے گھوڑا، جس کے پاس اونٹ نہ ہو اسے اونٹ اور جس کے پاس غلام نہ ہو اسے غلام دیتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے: "یا اللہ میری امت میں سے جو کوئی کسی چیز کا امیر بنا اور اس نے ان کے ساتھ نرمی کی تو تو اس کے ساتھ نرمی فرما، اور جس نے ان پر مشقت ڈالی تو اس پر مشقت ڈال۔"[3]

جب معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت مستحکم ہو گئی تو انہوں نے شمالی افریقہ کے محاذ کو سب سے زیادہ اہمیت دی، اس لیے کہ اگر ایک طرف اس کی سرحدیں مغربی مصر سے ملتی تھیں تو دوسری طرف یہ علاقہ دولت بیزنطیہ کے اثر ونفوذ کے تابع تھا جو کہ مسلمانوں کی دشمن ریاست تھی اور جس کے معاویہ رضی اللہ عنہ نے ناک میں دم کرنے کا ہمیشہ عزم مصمم کیے رکھا۔ عین اس وقت جب انہوں نے مشرق کی طرف سے دولت بیزنطیہ پر مسلسل دباؤ جاری رکھا اور اس کے دارالحکومت قسطنطنیہ تک پہنچنے کے لیے بحر متوسط میں اس کے جزائر میں پیش قدمی جاری رکھی تو انہوں نے شمالی افریقہ کے ساحلوں کے جنوب کی طرف سے بھی اسے نیچا دکھانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ انہوں نے ۴۱ھ میں معاویہ بن حدیج کو افریقہ روانہ کیا۔ پھر ۴۵ھ میں دس ہزار جنگجوؤں کا کمانڈر بنا کر انہیں دوبارہ ادھر بھیجا گیا یہاں تک کہ وہ افریقہ میں داخل ہو گئے۔ اس سفر کے دوران عبد اللہ بن عمر بن الخطاب، عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، عبد الملک بن مروان اور یحییٰ بن الحکم بن العاص اور دیگر اشراف قریش بھی ان کے ساتھ تھے، شاہ روم نے ان کے مقابلہ کے

لیے نقفورانامی بطریق کو تیس ہزار جنگجوؤں کے ساتھ بھیجا، وہ ساحل پر اترا تو معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف بھاری دستے کے ساتھ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو بھیجا، وہ یہاں سے روانہ ہو کر ایک بلند چوٹی پر فروکش ہوئے جہاں سے وہ اپنے اور سوسہ [1] شہر کے درمیان میل تک کا سمندری علاقہ صاف دیکھ سکتے تھے۔ جب اس کی خبر نقفورا کو ملی تو وہ جنگ کیے بغیر واپس پلٹ گیا اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ کے پاس واپس لوٹ آئے۔ ابن حدیج اس وقت جبل قرن پر موجود تھے۔ بعد ازاں ابن حدیج نے عبد الملک بن مروان کو ایک ہزار گھوڑا سوار سپاہ میں جلولاء[2] نامی شہر کی طرف روانہ کیا، انہوں نے جاتے ہی اس شہر کا محاصرہ کر لیا اور بہت سارے شہریوں کو قتل کرنے کے بعد اسے بزور بازو فتح کر لیا، خود معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ نے دو سو کشتیوں کے ساتھ صقلیہ کی طرف سمندر میں ایک دشمن لشکر سے جنگ کی جس میں انہوں نے کئی لوگوں کو قیدی بنایا، مال غنیمت حاصل کیا اور وہاں ایک ماہ قیام کرنے اور بہت سارا مال غنیمت حاصل کرنے کے بعد واپس افریقہ لوٹ آئے۔[3]

ان فتوحات کے بعد معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ مصر واپس لوٹ آئے مگر وہاں کسی کو کمانڈر یا عامل مقرر نہ کیا، اس جنگ کے دوران ابن حدیج کے تصرف اور ان کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ کے بربر رومیوں کے خلاف مسلمانوں کے حلیف بن گئے تھے جس کی وجہ سے مسلمان اس طرف کے رومی خطرات سے محفوظ ہو گئے تھے۔[4] جب معاویہ بن حدیج مغربی طرابلس سے واپس لوٹے تو انہوں نے رویفع بن ثابت انصاری کو اس کا والی مقرر کیا، یہ ۴۶ھ کا واقعہ ہے، وہاں سے انہوں نے تیونس کے ساتھ جنگ کی اور ۴۷ھ میں اس میں داخل ہو گئے اور جزیرہ جربہ کو فتح کر لیا جس میں بربر رہائش پذیر تھے،[5] مراجع بتاتے ہیں کہ انہوں نے اس جنگ میں بہت سارے لوگوں کو قیدی بنالیا تو رویفع بن ثابت انصاری کھڑے ہو کر مسلمانوں کو لونڈیوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کے بارے میں اسلامی احکام سے آگاہ کرنے کے لیے فرمانے لگے: خبر دار! میں تمہیں وہی بات بتاؤں گا جو میں نے جنگ حنین کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے دوسرے کی کھیتی کو پانی پلانا جائز نہیں ہے[6] اور جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی قیدی عورت سے مجامعت کرے حتی کہ اس کا استبرائے رحم ہو جائے[7] اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے مال غنیمت فروخت کرنا جائز نہیں ہے جب تک کہ اسے تقسیم نہ کر دیا جائے، ابن ثابت انصاری مغربی طرابلس کے والی کے طور پر کام کرتے رہے، پھر مسلمہ بن مخلد نے مصر اور برقہ کی ولایت بھی ان کے سپرد کر دی اس پر امارت کے دوران ہی ۵۶ھ میں ان کا وہیں انتقال ہوا۔ برقہ میں مدینۃ البیضاء کے مقام پر جبل اخضر میں ان کی قبر جانی پہچانی ہے۔ آپ اس علاقہ میں فوت ہونے والے آخری صحابی ہیں۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آٹھ احادیث روایت کی ہیں۔ آپ فقیہ صحابی تھے اور آپ کا شمار مفتی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ آپ بڑے فصیح اللسان خطیب تھے۔[1]

ثانیاً:... عقبہ بن نافع اور فتح افریقہ

عقبہ بن نافع قرشی فہری افریقہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کے افریقہ میں نائب تھے، انہوں نے ہی قیروان شہر آباد کیا اور اس میں لوگوں کو بسایا۔[2] آپ بڑے امانت دار، شجاع اور محتاط قسم کے مرد میدان تھے، ان کا صحابی ہونا ثابت نہیں ہے، آپ فتح مصر میں شریک ہوئے اور اس کی منصوبہ بندی کی۔[3] معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے افریقہ میں اسلامی فتوحات کی تحریک کی قیادت اس عظیم کمانڈر کے سپرد کی جس کا نام

تاریخ نے فتوحات کے میدان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیا۔ عقبہ افریقہ کے غزوات میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ آغاز سے ہی شریک عمل رہے اور اس میدان میں وسیع تجربات حاصل کیے۔ جب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فسطاط واپس لوٹے تو انہیں برقہ پر اپنا جانشیں مقرر فرمایا اس دوران وہ لوگوں کو دعوت اسلام پیش کرتے رہے۔ عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ کو قیادت کی سپردگی سارے شمالی افریقہ کی فتح کے لیے اہم قدم ثابت ہوئی۔ چونکہ وہ عمرو بن العاص کے ایام میں برقہ، زویلہ اور اس کے اردگرد کے علاقوں کی فتح سے ہی ان شہروں میں مقیم رہے جس کی وجہ سے انہیں اس امر کا بخوبی ادراک ہو گیا تھا کہ اگر مسلمانوں کو افریقہ میں قدم جمانے ہیں اور وہاں کے لوگوں کو ارتداد سے باز رکھنا ہے تو اس کے لیے ایک مضبوط مرکز قائم کرنے کی ضرورت ہے جہاں سے وہ غزوات کے لیے روانہ ہوا کریں اور پھر واپس آ کر اپنے اہل و عیال میں پر امن طریقے سے رہ سکیں۔ جب معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے افریقہ میں اسلامی فتوحات کی قیادت ان کے سپرد کی تو ان کے پاس دس ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل فوجی دستہ بھیجا، نیز جب دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے بربر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تو ان کی جمعیت میں خاصا اضافہ ہو گیا۔[4] وہ اپنی جمعیت کے ساتھ روانہ ہوئے اور سرت[5] میں مغمداش کے مقام پر فروکش ہو گئے۔ یہاں آمد پر انہیں یہ خبر ملی کہ اہل ودان[6] نے بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا ہوا اپنا معاہدہ توڑ دیا ہے اور جس جزیہ کی ادائیگی پر ان کے ساتھ اتفاق کیا تھا اس کی ادائیگی سے انکار کر دیا ہے، چنانچہ انہوں نے عمر بن علی قریشی اور زہیر بن قیش بلوی کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا اور خود ایک دوسرے لشکر کے ساتھ فزان[1] کی طرف جا نکلے۔ جب وہ فزان کے قریب پہنچے تو انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔[2] پھر انہوں نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کوار[3]، خاور[4]، غدامس[5] وغیرہا کے قلعہ جات فتح کر لیے۔[6] یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ عقبہ بن نافع دوران سفر ساحلی علاقوں سے دور رہے اور اندرونی علاقوں کے ایک ایک شہر کو فتح کرتے چلے گئے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ لگتی ہے کہ اس طرح وہ بربر کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے اور ایک ایسا داخلی محاذ کھڑا کرنا چاہتے تھے جو ساحل پر آباد بیزنطیوں کا گھیراؤ کرے اور اہل اسلام کو مستحکم کرنے اور بیزنطی وجود کو نیست و نابود کرنے کے لیے افرادی قوت مہیا کرے۔[7]

ثالثاً:... قیروان شہر کی تعمیر

۵۰ھ میں اسلامی افریقہ نے عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ کے ساتھ نئے دور کا آغاز کیا۔ عقبہ رضی اللہ عنہ کم عمری سے ہی افریقہ کے معاملات سے آگاہ تھے انہوں نے بربر کے بکثرت ارتداد اور ان کی عہد شکنی کا بار بار مشاہدہ کیا۔ ان کے علم میں تھا کہ افریقہ کی حفاظت اور وہاں کے باشندوں میں اشاعت اسلام کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ ایک ایسے شہر کی تعمیر ہے جو مسلمانوں کا پڑاؤ ہو اور ان کے لشکر وہاں سے روانہ ہوں، چنانچہ انہوں نے قیروان شہر کی بنیاد رکھی اور اس میں جامع مسجد بھی تعمیر کی۔[8] عقبہ نے شہر کی تعمیر شروع کرنے سے قبل اس کی راہ ہموار کرنے کے لیے اپنے لشکر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: جب افریقہ میں کوئی مسلمان امام داخل ہوتا ہے تو وہ لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں اور جب وہ اس سے باہر جاتا ہے تو وہ دوبارہ کفر اختیار کر لیتے ہیں، لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ تم وہاں ایک ایسا شہر آباد کرو جو رہتی دنیا تک اسلام کے لیے باعث عزت و قوت ہو۔ لوگوں نے ان کی اس بات سے اتفاق کیا، انہوں نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ اس شہر کے باسی اپنے دشمنوں کے خلاف ہمیشہ کمربستہ رہیں گے۔ ان کا کہنا تھا: ہم سمندر کے قریب رہیں تاکہ جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ کماحقہ ادا کر سکیں۔ اس پر عقبہ کہنے لگے: مجھے یہ خوف دامن گیر ہے کہ اس طرح قسطنطنیہ کا

حکمران اچانک حملہ آور ہو کر اس پر قبضہ جمالے گا۔ تم اس شہر اور سمندر کے درمیان اتنا فاصلہ رکھو جس سے نماز قصر واجب نہ ہوتی ہو۔[9] مگر عقبہ کو قیروان کے لیے وہ جگہ پسند نہ آئی جو قبل ازیں معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ نے تیار کی تھی۔ وہ لوگوں کو ساتھ لے کر اس جگہ پر آئے جہاں اس وقت قیروان موجود ہے۔[10] یہ جگہ ایک جنگل پر مشتمل تھی جو درندوں اور سانپوں سے بھرا پڑا تھا، انہوں نے ان سے جنگل کی صفائی کے لیے دعا کی تو ان میں سے کوئی ایک چیز بھی وہاں باقی نہ رہی۔ یہاں تک کہ درندے اپنے بچوں کو اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔[1] یحییٰ بن عبد الرحمن بن حاطب سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اے اہل وادی! ہم ان شاء اللہ یہاں ڈیرے ڈالنے والے ہیں، لہٰذا تم یہاں سے نکل جاؤ۔ انہوں نے یہ بات تین دفعہ دہرائی۔ ہم نے دیکھا کہ ہر درخت اور پتھر کے نیچے سے جانور نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ ہم وادی کے اندر اتر گئے، پھر انہوں نے لوگوں سے فرمایا: بسم اللہ پڑھ کر وادی میں اتر جاؤ۔[2] عقبہ بن عامر مستجاب الدعوات شخص تھے۔[3] جب بربر لوگوں کے ایک قبیلہ نے جانوروں کو اس طرح بچوں کو اٹھائے یہاں سے نقل مکانی کرتے دیکھا تو وہ اس سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ پھر لوگ درخت کاٹنے میں لگ گئے۔ عقبہ نے شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا تو ان کے حکم کی تعمیل میں قیروان شہر تعمیر کر دیا گیا اور اس میں جامع مسجد بھی بنا دی گئی۔ پھر لوگوں نے اپنے اپنے گھر تعمیر کیے اور مسجدیں بھی بنالیں۔ یہ ۵۵ھ کی بات ہے۔ شہر کی تعمیر کے دوران عقبہ لشکر روانہ کرتے رہے اور مخالفین کے ساتھ برسرپیکار رہے جس کی وجہ سے بہت سارے بربر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں کا دائرہ عمل وسیع ہو گیا، قیروان میں موجود مسلم سپاہ کو تقویت ملی، انہیں امن واطمینان میسر آیا اور اس میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔[4] قیروان شہر کی منصوبہ بندی اسلامی انداز میں کی گئی۔ جامع مسجد سے متصل دار الامارہ قائم کیا گیا۔ ان دونوں کے درمیان سے قیروان کی مرکزی سڑک کا آغاز ہوتا ہے جو سماط اعظم کے نام سے موسوم ہے۔ مسجد اور دار الامارہ کے ارد گرد وسیع دائرہ کی شکل میں خالی جگہ چھوڑی گئی تھی۔ افریقہ کے مختلف حصوں سے بربر قبائل قیروان کی طرف کھنچے چلے آئے اور اس کے گرد و نواح میں آباد ہو گئے۔ ان میں سے زیادہ تر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور عربی زبان، قرآن کریم اور دینی امور کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہو گئے، اس طرح ہم ۵۵-۵۰ھ کے درمیان شمالی افریقہ کو عربی رنگ میں رنگنے کی زور دار تحریک کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔[5]

ا۔ موضع قیروان کی خصوصیات:

وہ سیاسی، عسکری، انتظامی اور دعوتی اسباب بڑے قوی تھے جنہوں نے عقبہ بن عامر کے دل میں قیروان کی جگہ کو اس پر شہر آباد کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ قیروان کی جگہ مندرجہ ذیل امتیازات کی حامل تھی:

الف: اسے فسطاط میں قائم عسکری قیادت کے مرکز سے کوئی سمندر یا دریا الگ نہیں کرتا، یہ شہر خشکی کے اس راستے پر واقع ہے جو مصر میں فسطاط اور مغرب کو ملاتا ہے، یوں لگتا ہے کہ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ نظریہ اپنایا تھا کہ شہروں اور فوجی چھاؤنیوں کو اس انداز سے تعمیر کیا جائے کہ انہیں مدینہ منورہ یا مرکز قیادت سے کوئی دریا، سمندر یا پل الگ نہ کرے، اور یہ کہ وہ خشکی کے کنارے پر واقع ہو یا پھر خشکی اور صحراء کے قریب ترین ہو۔ ب: وہ جگہ عربوں کی ذہنیت اور ان کے ضروری مطالبات سے ہم آہنگ تھی، اس خصوصیت کی عکاسی عقبہ بن نافع کی اس تلقین سے ہوتی ہے کہ وہ جگہ شور زمین کے قریب ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ تمہارے پاس اونٹوں کی کثرت ہے جن کی چراگاہیں ان کے

باڑوں کے دروازوں کے قریب ہونی چاہئیں۔[1] اسی طرح ان کے رفقاء نے مشاورت کے دوران کہا تھا: ہم اونٹوں والے لوگ ہیں، ہمیں سمندر کے قریب رہنے کی کوئی ضروری نہیں ہے۔[2]

ج: یہ جگہ ان پہاڑوں کے سامنے واقع تھی جو کہ بربر قبائل کی جائے پناہ تھے، اس صورت میں یہ جگہ اس زرعی علاقہ میں واقع تھی جس سے حاصل ہونے والی زرعی پیداوار مسلمان مجاہدین کی غذائی ضروریات پورا کرتی تھی۔[3]

د: یہ بات درست ہے کہ قیروان کو جس بنیادی مشکل کا سامنا تھا وہ پانی سے متعلق تھی، اگرچہ بصرہ میں بھی یہی صورت حال تھی مگر دونوں شہروں میں اس حوالے سے بنیادی فرق تھا، کہ بصرہ کا پانی نمکین تھا جبکہ قیروان کا پانی پینے کے قابل تھا اور اس کے دو ذرائع تھے: ان میں سے پہلا ذریعہ بارش تھی جس کا پانی حوضوں میں سٹور کر لیا جاتا اور دوسرا ذریعہ وادی سراویل کا پانی تھا مگر یہ نمکین تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مورخین قیروان کے پانی کے مصدر کے بارے میں کہتے ہیں: وہ لوگ بارش کا پانی پیتے تھے، جب موسم سرما میں بارشیں ہوتیں تو بارش کا پانی وادیوں سے بڑے بڑے حوضوں میں داخل ہو جاتا جنہیں مؤجل کہا جاتا تھا۔ وادی سراویل میں کھارا پانی آتا جسے وہ دیگر ضروریات کے لیے استعمال کرتے تھے۔[4]

۲۔ قیروان (مغرب میں اسلامی تہذیب کا مرکز اور اس کا علمی دار الحکومت)

۵۰ھ میں قیروان کا سنگ بنیاد رکھے جانے کے بعد ہی باقاعدہ علمی زندگی کا آغاز ہوا تو پھر جلدی ہی یہ شہر مغرب میں اسلامی تہذیب کا مرکز اور اس کا علمی دار الحکومت بن گیا، یہیں سے ہی داعیان اسلام روانہ ہوتے اور اسلامی دنیا کے گوشے گوشے سے متلاشیان علم ادھر ہی کا رخ کرتے۔ قیروان کے اس تہذیبی اور علمی مقام و مرتبہ کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں: الف: قیروان کی تعمیر کا مطلب یہ تھا کہ افریقہ نیا اسلامی صوبہ اور عالم اسلامی کا جزو لاینفک بن گیا ہے اور اس کے نتیجے میں اس میں مسلمان اپنی عادی زندگی گزاریں گے جس میں تعلیم اور اسلامی ثقافت کی نشر و اشاعت سر فہرست ہو گی، اس لیے کہ قیروان شہر رسالت تھا جس کے شہریوں پر مغرب میں اشاعت اسلام کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی جس طرح یہاں سے اسلامی لشکر روانہ ہوتے تھے، اسی طرح اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے داعیان اسلام بھی یہیں سے روانہ ہوا کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قیروان کے اس مقام و مرتبہ سے اس کی تاسیس کے دن سے ہی آگاہ تھے۔[1]

ب: قیروان میں جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی۔ جسے اسلام میں پہلے مدرسہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عقبہ کے لشکر میں شامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس مسجد میں اسی انداز سے فریضہ تعلیم ادا کرتے جو اس وقت مشرقی شہروں میں مروج تھا، قیروان کی تاسیس کے دوران عقبہ کے ساتھ اٹھارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔[2] جو وہاں پانچ سال تک مقیم رہے اور اس دوران وہ جامع قیروان میں عربی زبان کی اشاعت اور قرآن و سنت کی تعلیم کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور یہ سب کچھ قیروان کی تعمیر کے دوران ہوتا رہا۔ اس دوران کوئی ایسی بڑی جنگیں نہیں ہو رہی تھیں جو ان کی قیروان سے طویل غیر حاضری کا مطالبہ کرتیں۔ عقبہ کے دوسرے غزوہ کے دوران ان کے ساتھ پچیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔[3] جبکہ باقی سارا لشکر تابعین پر مشتمل تھا، اس عرصہ کے دوران حدیث نبوی کی روایت اس قدر عام ہو گئی کہ عقبہ کو اپنی اولاد اور ان کی

وساطت سے تمام مسلمانوں کو یہ وصیت کرنا پڑی کہ وہ ثقہ راویوں کی روایات اخذ کیا کریں اور ایسی چیزیں نہ لکھا کریں جو انہیں قرآن سے مشغول کر دیں۔[4]

ج: قیروان بربر مسلمانوں کی بھاری تعداد کا مرکز بن گیا تھا جو یہاں نیا دین سیکھنے کے لیے آئے تھے۔ ابن خلدون عقبہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: وہ افریقہ میں داخل ہوئے تو بربر قبائل کے مسلمان ان کے ساتھ مل گئے جس سے ان کی جمعیت میں اضافہ ہو گیا، اکثر بربر اسلام میں داخل ہو گئے اور دین کو رسوخ حاصل ہو گیا۔[5] اس امر میں کوئی شک نہیں کہ فاتحین اسلام نے اپنے لیے ایسے لوگوں کو خاص کر لیا تھا جو یہ ذمہ داری بخوبی نباہ سکتے تھے۔[6] قیروان سے اسلام تمام بلاد مغرب میں پھیل گیا۔ عقبہ نے بربر قبائل میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے مغرب اقصیٰ اور مغرب اوسط میں متعدد مساجد تعمیر کروائیں۔[7] پھر جب ابو المھاجر دینار افریقہ کے والی بن کر آئے تو انہوں نے کسیلہ اور اس کی قوم کی تالیف قلبی کی اور بربر قبائل کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے تو وہ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہو گئے۔ بعد ازاں حسان بن نعمان نے بربر قبائل میں اسلام کی نشر و اشاعت کی کوششوں کو مزید تقویت دیتے ہوئے انہیں عربی زبان، فقہ اور مبادیات اسلام کی تعلیم کے لیے تابعین میں سے تیرہ فقہاء کا تقرر کیا۔[8] موسیٰ بن نصیر نے بھی یہ سلسلہ تعلیم جاری رکھتے ہوئے عربوں کو حکم دیا کہ وہ بربر قبائل کے لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور دین کے مسائل سے آگاہ کریں۔[1] انہوں نے مغرب اقصیٰ کے لوگوں کو تعلیم دینے کی غرض سے وہاں ستائیس فقہاء کا تقرر کیا۔[2]

د: اسلامی لشکر کے زیادہ تر لوگ اپنی بیویاں بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے افریقہ میں لونڈیاں اور امہات الاولاد اپنا رکھی تھیں۔ ابو العرب[3] کہتے ہیں: بعض محدثین روایت کرتے ہیں کہ جب عبد اللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر جہاد کے لیے نکلے تو ان کی ام ولد بھی ان کے ساتھ تھی جس نے ان کی بچی کو جنم دیا جو مر گئی اور جسے انہوں نے باب سلم میں قریش کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ جسے قریش نے اس بچی کی وجہ سے مستقل قبرستان بنا لیا جس میں وہ اپنے مردوں کو دفن کیا کرتے تھے۔[4] دریں حالات مسلمان نوخیز بچوں کے لیے عربی زبان اور مبادیات اسلام کی تعلیم کا اہتمام کرنا از حد ضروری تھا، یہی وجہ تھی کہ قیروان میں آغاز ہی سے تعلیم گاہیں قائم کر دی گئیں۔ غیاث بن شبیب سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی سفیان بن وہب رضی اللہ عنہ ہمارے پاس سے گزرتے اس وقت ہم قیروان میں بچپن کی عمر میں تھے، وہ ہمیں سلام کہتے جبکہ ہم مکتب میں ہوتے، انہوں نے سر پر پگڑی باندھ رکھی ہوتی جس کا ایک سرا پیچھے کی طرف لٹکا رکھا ہوتا۔[5] سفیان بن وہب رضی اللہ عنہ دو دفعہ قیروان آئے تھے۔ پہلی دفعہ ۶۰ھ میں، یعنی قیروان کی تاسیس سے پانچ سال بعد، اور دوسری دفعہ ۷۸ھ میں۔[6]

ھ: قیروان کے محل وقوع کا بھی علمی زندگی کو مالا مال کرنے اور اسے اوپر اٹھانے میں بڑا اہم کردار ہے۔ یہ شہر مشرق و مغرب کے درمیان میں واقع ہے جب مغرب اور اندلس کے علماء و طلباء مشرق جانے کے لیے وہاں سے گزرتے تو وہ اس کے علماء سے استفادہ کرتے۔[7] اسی طرح اہل مشرق میں سے جو لوگ مغرب یا اندلس جانا چاہتے وہ بھی اس شہر میں آتے اور وہاں کے اہل علم سے علمی استفادہ کرتے۔[8]

و: قیروان میں تجارت بڑی نفع بخش تھی اور اس میں سامان تجارت بڑی جلدی فروخت ہو جاتا تھا، لہٰذا مشرق و مغرب کے بڑے بڑے تاجروں کا وہاں آنا جانا لگا رہتا، ان تاجروں میں بہت سے محدثین اور فقہاء بھی ہوتے۔ قیروان میں علمی زندگی کی ترقی کا یہ بھی ایک اہم عامل تھا۔[9]

ز: اس شہر کی علمی زندگی کے پر رونق ہونے کا ایک سبب اس کا سیاسی دارالحکومت ہونا تھا، جب بھی کوئی نیا امیر آتا وہ کئی علماء اور ادباء کو بھی اپنے ساتھ لے کر آتا۔ مزید برآں افریقی دارالحکومت میں آنے والے بہت سارے علماء و فقہاء مشرق سے آنے والے اسلامی لشکروں میں شامل ہوئے اور یہ سلسلہ دوسری صدی کے نصف تک جاری رہا۔ علاوہ ازیں امراء کی مدح وستائش کے لیے آنے والے شعراء اور ادباء نے بھی قیروان کی علمی و ادبی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔[1]

ح: چونکہ قیروان کی تاسیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں ہوئی تھی اور اس میں ان کے ہاتھوں بہت ساری کرامات کا ظہور ہوا اور ان میں سے کچھ ایک عرصہ تک اس میں مقیم بھی رہے اور یہ بلاد مغرب کا آخری شہر ہے جس میں صحابہ کرام تشریف لائے[2] تو اس وجہ سے قیروان کو ایک طرح کا احترام اور تقدس حاصل ہو گیا جس کی وجہ سے قیروان کو افریقہ اور مغرب میں علمی قیادت کا شرف حاصل ہوا۔ اس شہر کے اوصاف گنواتے ہوئے ابو اسحاق جبنیانی فرماتے ہیں: قیروان سر اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ جسم ہے، اہلیان قیروان نے ہی شکوک و شبہات اور بدعات و خرافات کی تردید کی، اور اس کے ائمہ نے ہی احیاء سنت کے لیے قتال کیا اور پھر اسی مقصد کے لیے جام شہادت نوش کیا۔[3] تمام قدیم مصنّفین علمی میدان میں قیروان کی مغرب کے تمام شہروں پر فضیلت کے معترف ہیں، قیروان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ولایت و علوم کا منبع ہے وہ اہل مغرب کے لیے ہر خبر کی اصل ہے اور تمام شہر اس کے محتاج ہیں۔ مغربی شہروں کی ہر ٹہنی قیروان سے بلند ہوئی اور اس کی ہر شاخ اسی پر مبنی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ ہر مذہب کے علوم کا یہیں سے خروج ہوا اور ہر علم اسی کے ائمہ کی طرف منسوب ہوا اس حقیقت کا نہ کوئی خاص انکار کرتا ہے اور نہ کوئی عام، اور تاریخ کے طویل دور میں اس کی اس فضیلت میں کوئی ایک بھی مزاحم نہیں ہے۔[4] یوں قیروان افریقی دارالعلم قرار پایا اور یہاں سے بڑے بڑے فقہاء، محدثین اور قراء کا ظہور ہوا۔ اہل مغرب و اندلس طلب علم کے لیے اس کی طرف کشاں کشاں دوڑے چلے آتے تھے۔ اس شہر کے علماء و محدثین نے سلف صالحین کے مذاہب کا دفاع کیا اور وہ مغرب میں دار السنہ والجماعہ قرار پایا۔[5] قیروان نے شمالی افریقہ اور اندلس کو فتح کرنے اور مغرب میں اسلام کی نشر و اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور وہ اسلامی تہذیب کا اہم ترین مرکز بن گیا۔[6]

تیسری بحث: دولت امویہ کے مشرقی حصہ میں فتوحات معاویہ رضی اللہ عنہ

مسلمانوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت تک عراق اور نہر جیحون کے درمیانی علاقہ کی فتح مکمل کر لی تھی جو کہ جرجان، طبرستان، خراسان، فارس، کرمان اور سجستان پر مشتمل ہے۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد فتوحات اسلامیہ کی تحریک کو شدید زد پہنچی، پھر جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت شروع ہوا تو دولت امویہ نے مفتوحہ علاقوں کو واپس لینے اور فتح اسلام کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے نئے سرے سے بھرپور کوششوں کا آغاز کر دیا۔[1]

اولاً:... خراسان، سجستان اور ماوراء النہر کی فتوحات

جب حالات معاویہ رضی اللہ عنہ کی گرفت میں آ گئے تو انہوں نے عبداللہ بن عامر کو بصرہ کا والی مقرر کیا اور سجستان اور خراسان سے جنگ کی۔[2] عبداللہ بن عامر کی اس منصب پر تقرری ان کے اس علاقہ میں گزشتہ تجربہ کی وجہ سے کی گئی تھی۔ ۴۲ھ میں ابن عامر نے عبدالرحمن بن سمرہ بن حبیب کو سجستان کا والی مقرر کیا، جب وہ یہاں آئے تو ان کے ساتھ عمر بن عبید اللہ بن معمر تیمی، عبداللہ بن حازم سلمی، قطری بن فجاءہ اور مہلب بن ابو صفرہ ازدی بھی تھی۔ انہوں نے اس حملہ کے دوران زرنج[3] نامی شہر کو صلح کے ذریعے فتح کر لیا اور اس کے سردار سے دو ملین درہم کی ادائیگی پر موافقت کر لی، بعد ازاں انہوں نے خواش[4] ،بست[5] اور خشک[6] وغیرہا شہروں کی طرف پیش قدمی کی اور انہیں فتح کر لیا، اسی طرح انہوں نے ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد کابل کو بھی فتح کر لیا،[7] معاویہ رضی اللہ عنہ نے سجستان کو ولایت قرار دیتے ہوئے اس کا والی عبدالرحمن بن سمرہ کو مقرر کر دیا[8] جو کہ ان کی ان جیسی فتوحات کا صلہ تھا۔

اس طرح خراسان اور سجستان کی ولایت دوسری دفعہ والی بصرہ کی نگرانی میں آ گئی، جب ۴۵ھ میں زیاد بصرہ آیا تو اس نے خراسان کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا:

۱۔ مرو:... اس کے امیر وامیر احمد لشکری تھے اور یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے عربوں کو مرو میں لا کر آباد کیا۔[9]

۲۔ نیساپور: اس کے امیر خلید بن عبداللہ حنفی تھے۔

۳۔ مرو الرود، طالقان اور فاریاب: اس کا امیر قیس بن ہیثم سلمی کو مقرر کیا گیا۔

۴۔ ہرات، باذغیس، یوشنج اور قادیس، اس پر نافع بن خالد طاحی ازدی کو متعین کیا گیا۔[1]

۴۷ھ میں زیاد نے خراسان کے شہر مرو کو اپنی حکومت کا مرکز قرار دے دیا۔

ثانیاً:... حکم بن عمرو غفاری کا تقرر

حکم بن عمرو غفاری بڑے پاک دامن اور شرف صحابیت سے مشرف تھے[2] ،۴۷ھ میں حکم نے "طخارستان"[3] سے جنگ کی اور بہت سا مال غنیمت حاصل کیا، پھر جبال غور[4] کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں کے لوگوں سے جنگ کی جو اسلام سے مرتد ہو گئے تھے، ان کے خلاف تلوار استعمال کی اور اسے بزور بازو فتح کر لیا۔[5] مہلب بن ابو صفرہ خراسان میں حکم بن عمرو کے ساتھ تھے، انہوں نے ان کے ساتھ مل کر ترکوں کے بعض پہاڑی علاقوں میں جنگ کی جن میں جبل "الاشل" بھی شامل ہے۔[6] مگر ترکوں نے ان پر گھاٹیاں اور راستے بند کر دیئے، اس پر حکم نے جنگی امور مہلب کو تفویض کر دیئے، مہلب نے حیلہ گری سے کام لیتے ہوئے ترکوں کے بہت بڑے سردار آدمی کو گرفتار کر لیا اور اس سے کہا: ہمیں اس تنگ

گھاٹی سے باہر نکال ورنہ ہم تجھے قتل کر ڈالیں گے۔ وہ کہنے لگا: ان راستوں میں سے کسی ایک راستے کے سامنے آگ جلاؤ اور اپنا سارا ساز و سامان ادھر منتقل کر دو، اس طرح یہ سب لوگ ادھر جمع ہو جائیں گے اور دوسرے راستے خالی کر دیں گے، جب ایسا ہو جائے تو تم فوراً دوسرے راستے سے نکل جانا، اس طرح تم وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ مہلب نے ایسا ہی کیا اور یوں وہ اور ان کے ساتھی بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔[7] حکم بن عمرو نے نہر جیحون عبور کی اور ماوراء النہر کے علاقے میں چلے گئے، مگر ادھر کوئی علاقہ فتح نہ کیا۔[8] مسلمانوں میں پہلا شخص جس نے اس نہر کا پانی پیا وہ حکم کا آزاد کردہ غلام تھا، اس نے اپنی ڈھال سے نہر کا پانی نکالا، پھر خود بھی پیا اور حکم کو بھی پلایا، حکم نے اس سے وضو بھی کیا اور دو رکعت نماز ادا کی، حکم یہ کام کرنے والے پہلے شخص تھے۔[9] ایک دفعہ عبد اللہ بن مبارک نے اہل "صغانیات" میں سے ایک شخص سے پوچھا: تیرے علاقہ کو کس نے فتح کیا تھا؟ اس نے کہا: میں نہیں جانتا۔ ابن مبارک نے فرمایا: اسے حکم بن عمرو غفاری نے فتح کیا تھا۔[10]

حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ ۵۰ھ میں فوت ہو گئے۔[1] ان کے جانشین جلیل القدر صحابی غالب بن فضالہ لیثی رضی اللہ عنہ بنے، انہوں نے طخارستان کی فتح کے لیے منظم جنگی حملے جاری رکھے مگر وہ تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی قابل ذکر پیش قدمی نہ کر سکے،[2] جس کی وجہ سے زیاد نے انہیں معزول کر کے ان کی جگہ ربیع بن زیاد حارثی (۵۳-۵۰ھ) کو والی مقرر کر دیا۔[3] ربیع بن زیاد نے خراسان پر اپنی ولایت کے عرصے کے دوران بلخ سے جنگ کی مگر وہاں کے لوگوں نے ان کے ساتھ صلح کر لی، بعد ازاں کوہستان سے جنگ کی تو اسے تلوار کے زور پر فتح کر لیا، ۵۳ھ میں چند ماہ کے لیے ان کا بیٹا عبد اللہ ان کا جانشیں رہا اور اس کے بعد خلید بن عبد اللہ حنفی۔ خلید اپنے اس منصب پر قائم رہا یہاں تک کہ خراسان پر معاویہ رضی اللہ عنہ کا متعین کردہ عامل عبید اللہ بن زیاد (۵۵-۵۴ھ) میں یہاں پہنچ گیا، اس وقت عبید اللہ کی عمر پچیس سال تھی۔[4]

ثالثاً:... عبید اللہ بن زیاد

عبید اللہ بن زیاد نے مرو پہنچنے کے فوراً بعد چوبیس ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک فوجی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے نہر جیحون عبور کرنے کے بعد رامیثیب، نسف اور بیکندہ کو فتح کر لیا[5] تو ملکہ بخاریٰ نے ترکوں کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ وہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس کی مدد کے لیے آئے، مسلمانوں کی ان سے مڈبھیڑ ہوئی تو شکست سے دوچار ہوئے۔[6] اس پر ملکہ نے ان سے صلح اور امان کا مطالبہ کیا تو وہ تقریباً ایک سال تک اس منصب پر فائز رہا۔[7]

رابعاً:... سعید بن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

تاریخی مصادر روایت کرتے ہیں کہ سعید بن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تقریباً چار ہزار لوگوں کے ساتھ خراسان پہنچے، ان میں بصرہ اور کوفہ میں موجود عرب قبائل کے مشاہیر بھی شامل تھے، نیز ان میں مالک بن رہب مازنی تمیمی جیسے تخریب کار اور ڈاکو بھی موجود تھے جو اب گزشتہ اعمال بد سے توبہ کر کے رشد و ہدایت کی راہ پر گامزن ہو کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔[8] [1] طبقات ابن سعد: ۷/۲۹. [2] خلافة معاوية، عقيلي، ص: ۱۳۶. [3] فتوح البلدان، ص: ۴۰۹. [4] تاريخ طبری نقلا عن خلافة معاوية، ص: ۱۳۸. [5] الكامل فی التاريخ: ۲/۵۰۶. [6] تاريخ اليعقوبی: ۱۲/۲۱۱۔ قادة الفتح الاسلامی فی بلاد ماوراء النهر، ص: ۱۲۵. [7] خلافة معاوية، عقيلي، ص: ۱۳۹. [8] ايضاً، ص: ۱۴۰.

مالک بن رہب ہی کا یہ شعر ہے:

الم ترنی بعت الضلالۃ بالھدی

و اصبحت فی جیش ابن عفان غازیا

"کیا تو نے مجھے نہیں دیکھا کہ میں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو فروخت کر دیا ہے اور میں ابن عفان کے لشکر میں غازی بن گیا ہوں۔"[9]

سعید نے خراسان آمد کے بعد سمرقند جانے کے لیے نہر عبور کی تو اس کی خبر ملکہ بخاریٰ کو بھی ہو گئی، اس نے ابن زیاد کے ساتھ اپنی صلح کے بارے میں آگاہ کیا۔ صغد، کش اور نسف کے لوگ ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد میں آگے بڑھے اور بخاریٰ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے، ملکہ بخاریٰ جزیہ کی ادائیگی پر نادم ہوئی اور ابن زیاد سے کیا گیا معاہدہ توڑ دیا، مگر سعید کے ساتھ لڑائی کے لیے آنے والے لشکر میں سے کئی لوگ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی واپس چلے گئے اور ان کی واپسی دوسرے لشکریوں کی معنویات پر بھی اثر انداز ہوئی۔ جب ملکہ نے یہ صورت حال دیکھی تو اس نے صلح بحال کر دی اور سعید بخاری شہر فاتح کی حیثیت سے داخل ہو گئے۔ سعید نے ملکہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے علاقے کے اسّی سر کردہ لوگوں کو ان کے پاس بھیجیں اور یہ ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کے خلاف خروج کرنے کی قیادت کر رہے تھے اور وہ ان کی غداری سے ڈرتی ہے اور اپنے اور اپنے تخت کے لیے خطرہ تصور کرتی ہے، اس طرح وہ اپنے حاضر اور مستقبل کے لیے خطرناک ثابت ہونے والے اپنے دشمنوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ جب سعید اور ملکہ بخاریٰ کے درمیان صلح کا معاہدہ مکمل ہو گیا تو وہ ان سے ملاقات کے لیے ان کی رہائش گاہ پر آئی اس وقت وہ اپنی شاہانہ زیب و زینت میں تھی اور جیسا کہ کہا جاتا ہے وہ حسن و جمال میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اہل بخاریٰ کا دعویٰ ہے کہ مسلمان کمانڈر اس کی خوبصورتی سے بڑے متاثر ہوئے۔ سعید کی طرف سے اس کی پسندیدگی کے چرچے تو لوک گیتوں میں ہوتے رہے جنہیں اہل بخاریٰ آج تک گاتے چلے آئے ہیں۔ مگر قابل اعتماد اسلامی عربی مصادر میں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا، بظاہر یوں لگتا ہے کہ یہ تاریخی حقائق سے زیادہ ادباء و شعراء کی خیال آفرینی ہے۔ سعید نے سمرقند سے جنگ کی تو ملکہ نے اہل بخاریٰ کے ساتھ ان کی مدد کی، جب وہ سمرقند کے دروازے پر اترے تو قسم اٹھائی کہ وہ شہر کو فتح کرنے تک یہاں سے نہیں ٹلیں گے۔ مسلمان تین دن تک اہل سمرقند سے لڑتے رہے جبکہ تیسرے دن گھمسان کا رن پڑا جس دوران سعید کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ سمرقند کے شہریوں نے صلح کا مطالبہ کیا تو سعید نے سات لاکھ درہم کے بدلے ان سے صلح کر لی، اس صلح کی دوسری شرط یہ تھی کہ وہ اپنے روساء کے پچیس بچے ان کے حوالے کر دے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے ان کی تعداد چالیس تھی جبکہ ایک روایت میں ان کی تعداد اسی بتائی گئی ہے۔[1] اس وقت ان کے ساتھ امراء میں سے مہلب بن ابو صفرہ ازدی وغیرہ بھی تھے۔ قثم بن عباس بن عبد المطلب نے اسی موقع پر جام شہادت نوش کیا جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑی گہری مشابہت رکھتے تھے۔[2] ان کے بھائی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما طائف میں مدفون ہوئے جبکہ ان کے ایک اور بھائی افریقہ میں شہادت کی موت سے ہمکنار ہوئے جبکہ عبید اللہ کی قبر مدینہ منورہ میں ہے۔ یہ تمام بھائی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔[3] (مگر وفات مختلف علاقوں میں ہوئی) ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝﴾ (لقمٰن: ۳۴)

"کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کچھ کرے گا اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ یقیناً اللہ ہی پورے علم والا اور صحیح خبر رکھنے والا ہے۔" پھر سعید بن عثمان نے "ترمذ" کا رخ کیا اور اسے صلح کے ذریعے فتح کر لیا۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۵۷ھ میں انہیں معزول کر دیا تو سعید نے خراسان کے خراج پر قبضہ جما لیا جسے معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے واپس لے لیا۔[2] سعید اپنے پاس گروی رکھے گئے عظماء سمرقند کے بچوں کو اپنے ساتھ مدینہ منورہ لے گئے، ان کے کپڑے اتار کر ان کے موالی کے حوالے کر دیئے اور انہیں اونی لباس پہنا کر آب پاشی اور زمین کے کام کاج میں لگا دیا۔[3] وہ ایک دن باغ کا دروازہ بند کر کے ان پر ٹوٹ پڑے پہلے انہیں قتل کیا اور پھر اپنے آپ کو قتل کر ڈالا۔[4] اس پر خالد بن عقبہ بن ابو معیط اموی[5] نے کہا:

الا إن خير الناس نفسا و والدا

سعيد بن عثمان قتيل الا عاجم

فان تكن الايام اردت صروفها

سعيدا فهل حيّ من الناس سالم؟

ان کے مرثیہ میں خالد ہی کا شعر ہے:

يا عين جودي بدمع منك تهتانا

و ابكي سعيد بن عثمان بن عفانا

سعید نے اہل سمرقند کے ساتھ گروی رکھے گئے بچوں کو واپس کرنے کے عہد کو پورا نہ کیا اور انہیں اپنے ساتھ مدینہ منورہ لے آئے اور پھر انہیں مٹی گارے کے کام پر لگا دیا، جبکہ وہ سرداروں اور ناز و نعمت میں پلنے والے لوگوں کے بیٹے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ اس قسم کی مشقت برداشت نہ کر سکے اور آخر کار اپنی زندگی سے اکتا گئے۔[6]

پہلے انہیں قتل کیا اور پھر اپنی زندگیوں کے چراغ گل کر ڈالے، یہ سعید کا ان کے ساتھ غدر تھا جو ان کے لیے وبال جان ثابت ہوا اور اس کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔[7]

سعید بن عثمان بڑے غیور انسان تھے، ناز و نعمت میں پلنے والے اور بڑے سخی تھے۔ ان کا شمار قریش کی

[1] قادة الفتح الاسلامی، ص: ۱۴۲۔ فتوح البلدان، ص: ۴۰۲. [2] قادة الفتح، ص: ۱۴۳۱۴۴. [3] فتوح البلدان، ص: ۴۰۲۴۰۳. [4] ایضاً، ص: ۴۰۳۔ قادة الفتح الاسلامی، ص: ۱۴۲. [5] قادة الفتح الاسلامی، ص: ۱۴۳. [6] قادة الفتح الاسلامی، ص: ۱۴۳. [7] ایضاً، ص: ۱۴۳.

ممتاز شخصیات میں ہوتا ہے۔[1]

خامساً:... عبید اللہ بن زیاد کے بھائی مسلم بن زیاد کی فتوحات... ۵۷ھ

معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے ۵۷ھ میں سعید بن عثمان کو معزول کر کے ایک روایت کی رو سے خراسان کی ولایت عبید اللہ بن زیاد کو دے دی،[2] ایک دوسری روایت کی رو سے معاویہ نے خراسان پر عبدالرحمن بن زیاد کو والی مقرر کیا، چونکہ وہ ایک شریف انسان تھا لہٰذا فتوحات کے میدان میں کوئی کارکردگی نہ دکھا سکا، یہ ۵۹ھ کی بات ہے۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ کی موت کے وقت خراسان کا والی عبدالرحمن بن زیاد تھا، جب مسلم خراسان کی طرف روانہ ہونے لگا تو یزید نے عراق میں اس کے بھائی عبید اللہ بن زیاد کے نام اس مضمون کا خط بھیجا کہ وہ اس کے لیے چھ ہزار شہسواروں کا انتخاب کرے، ایک روایت میں یہ تعداد دو ہزار بھی بتائی گئی ہے۔ سلم بن زیاد اپنے ساتھ رہنے کے لیے سرکردہ لوگوں کا انتخاب کیا کرتا تھا، لہٰذا عمران بن فضیل برجمی، مہلب بن ابوصفرہ، عبداللہ بن خازم سلمی، طلحہ بن عبداللہ بن خلف خزاعی اور بصرہ کے رؤساء و اشراف سے بہت سارے لوگ اس کے ساتھ ہو لیے۔ سلم نے بصرہ سے ان لوگوں کو اپنے ساتھ لیا اور پھر پوری تیاری کے بعد خراسان کی طرف روانہ ہو گیا۔[4] سلم نے فتوحات کا آغاز خوارزم کے ساتھ جنگ سے کیا، مگر شہر والوں نے چار سو درہم کے بدلے اس سے صلح کر لی اور وہ رقم اسے ادا کر دی۔ جب سلم نے نہر جیحون عبور کی تو اس وقت اس کی بیوی ام محمد بنت عبداللہ بن عثمان بن ابوالعاص ثقفی بھی اس کے ساتھ تھی۔ نہر جیحون عبور کرنے والی یہ پہلی عرب خاتون تھی۔ وہ سمرقند پہنچا تو اس کے شہریوں نے اس کے ساتھ صلح کر لی۔[5] اسے پتا چلا کہ ملکہ بخاریٰ نے عہد شکنی کرتے ہوئے اپنے ہمسایہ صغد اور شمال کے ترکوں سے مدد طلب کی ہے۔ طرخون صغد کے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے اس کی مدد کے لیے آیا جبکہ ترکوں کا کمانڈر بھی ایک بھاری بھر کم لشکر کے ساتھ میدان کارزار میں اترا۔ مگر زمادی قوات پر مشتمل بڑے بڑے لشکر مسلمانوں کی معنویات پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ انہوں نے بخاریٰ پر حملہ کیے بغیر اس کا محاصرہ کر لیا تاکہ وہ سب سے پہلے اپنے دشمنوں کی قوات اور ان کے مقامات سے آگاہ ہو سکیں ان کا دشمن اس وقت بخاریٰ کے قریب ہی گھات لگائے بیٹھا تھا۔

سلم بن زیاد نے مہلب بن ابوصفرہ ازدی کو دشمن کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے کہا تو اس نے یہ تجویز پیش کی وہ اس مہم کو سر کرنے کے لیے کسی اور کو حکم دیں، اس کے لیے اس نے دلیل یہ پیش کی کہ وہ اپنی قوم اور مسلمانوں میں جانا پہچانا آدمی ہے، لہٰذا میرا مسلمانوں سے غائب ہونا میرے کندھوں پر ڈالی گئی ذمہ داری کو افشاء کر دے گا جبکہ اسے پردہ راز میں رہنا چاہیے تاکہ اسے انتہائی پردہ داری اور بڑی احتیاط کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچایا جا سکے، اس لیے کہ اس کا افشاء مسلمانوں کو شدید خطرات سے دوچار کر سکتا ہے۔ مگر سلم بن زیاد نے مہلب سے ہی یہ اہم ذمہ داری ادا کرانے پر اصرار کیا جس کی کماحقہ ادائیگی سے دوسرے لوگ قاصر رہیں گے۔ اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے ساتھ اس کے عم زاد اور ایک دوسرے ذمہ دار آدمی کو بھی بھیجا مگر مہلب نے سلم پر یہ شرط لگائی کہ وہ کسی کو بھی اس اہم ترین ذمہ داری سے آگاہ نہیں کرے گا، پھر وہ رات کے وقت اپنی جاسوس جماعت کے ساتھ اس مشن پر روانہ ہو گئے اور کسی پوشیدہ مقام پر چھپ کر بیٹھ گئے اور پھر دشمن کی فورسز کے بارے میں بھرپور آگاہی حاصل کر لی جبکہ وہ مخفی جگہ دشمن کی نظروں سے بالکل اوجھل رہی، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس رات مہلب کی قوم اور دیگر مسلمانوں کو صبح کی نماز میں مہلب نظر نہ آیا مگر اس جیسے آدمی کا غائب رہنا کسی پر مخفی نہیں رہ سکتا تھا، اس کا مقام و مرتبہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا اور اسے بڑی قدر و منزلت

کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، وہ لوگ سلم سے مہلب کے بارے میں بڑے اصرار کے ساتھ دریافت کرتے رہے جس کی وجہ سے وہ اس کے معاملے کو مخفی نہ رکھ سکا اور انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا اور پھر یہ خبر بڑی تیزی کے ساتھ سارے لشکر میں پھیل گئی، اس پر کچھ مسلمان جلدی جلدی سواریوں پر سوار ہوئے اور مہلب کی خفیہ جگہ کی طرف چل پڑے اور آخر کار انہوں نے وہ جگہ ڈھونڈھ نکالی۔ جب مہلب نے انہیں بغیر کسی نظم اور ترتیب کے اپنی طرف آتے دیکھا تو انہیں ان کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر بڑا سخت سست کہا، اس لیے کہ انہوں نے بغیر کسی جواز کے دشمن کو اس کی جاسوس جماعت کے مقام کو ظاہر کر دیا اور اس طرح اسے انتہائی خطرناک صورت حال سے دوچار کر دیا۔ ان کی تلاش میں آنے والے مجاہد شہسوار تقریباً نوسو کی تعداد میں تھے۔ مہلب نے ان سے کہا: اللہ کی قسم! تم اپنے اس فعل پر ضرور نادم ہوگے اور پھر وہی کچھ ہوا جس کی مہلب توقع کر رہا تھا، ابھی وہ مسلمانوں کی صفوں کو منظم بھی نہیں کر پایا تھا کہ ترکوں نے ان پر حملہ آور ہو کر چار سو مجاہدین کو موت کے گھاٹ اتار دیا جبکہ دوسروں نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ مہلب اور اس کے ساتھ رہ جانے والی نفری کو چند لوگوں نے گھیر لیا مگر وہ اپنی جگہ پر ثابت قدم رہے، اس جیسے لوگوں کے لیے راہِ فرار اختیار کرنے سے موت اختیار کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مہلب نے بلند آواز سے چلاتے ہوئے مسلمانوں سے مدد کی اپیل کی تو اس کی آواز قریب ہی واقع مسلمانوں کے کیمپ میں سنی گئی، اس کی قوم سے ازد قبیلہ کے لوگ فوراً اس کی مدد کے لیے وہاں پہنچ گئے اور ترکوں کو اتنی دیر تک مشغول رکھا جتنی دیر میں مسلمانوں کی قیادت ان کی مدد کے لیے پہنچ نہ گئی، پھر فریقین میں گھمسان کا رن پڑا اور مسلمان سپاہ نے ترکوں کو بڑی بری طرح شکست سے دوچار کر دیا اور وہ میدان جنگ میں اپنے اموال اور ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جسے مسلمانوں نے مال غنیمت کے طور پر سمیٹ لیا اور جس میں سے ہر شہسوار کے حصے میں دو ہزار اور چار چار سو درہم آئے۔ دوسری روایت کی رو سے ہر مجاہد کو دس دس ہزار درہم میسر آئے۔ مسلمانوں نے ترکوں کو شکست فاش دے دی، اس جنگ میں صغد بادشاہ (بندون) یا (بیدون) بھی کام آیا، اور ملکہ بخاریٰ نے سلم کے ساتھ دوبارہ صلح کر لی اور بخاریٰ نئے سرے سے فتح ہو گیا۔[1] صغد میں قیام کے دوران سلم نے مسلمانوں کا ایک لشکر (بُنجُکَدہ) بھیجا جس میں مشہور شاعر اعشیٰ بھی ان بھی شامل تھا جس میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سلم بن زیاد سے پہلے خراسان کے عمال جنگوں میں مصروف رہتے اور جب موسم سرما آتا تو (مرو اشاہجان) واپس لوٹ جاتے۔ مسلمانوں کے واپس جانے پر خراسانی حکمران خوارزم سے متصل ایک شہر میں جمع ہوتے، آپس میں ایک دوسرے سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرتے اور اپنے معاملات کے بارے میں مشاورت کرتے، پھر جب سلم بن زیاد ادھر آیا تو اس نے اس سال موسم سرما میں بھی جنگ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مہلب بن ابی صفرہ نے بڑے اصرار کے ساتھ اس شہر کی طرف متوجہ ہونے کی درخواست کی تو اس نے اسے چھ ہزار اور ایک روایت کی رو سے چار ہزار کی نفری کے ساتھ ادھر بھیجا، اس نے ان کا محاصرہ کر لیا تو انہوں نے صلح کا مطالبہ کر دیا، جس پر اس نے ان سے تقریباً بیس ہزار درہم پر صلح کر لی، صلح کی ایک شرط کی رو سے وہ ان سے چوپائے اور دیگر جانور نصف قیمت پر خریدا کرتا۔[1] (۶۲-۶۱ھ) کے دو سالہ جہاد کے بعد سلم مرو میں واپس لوٹ آیا، ایسا لگتا ہے کہ اس نے ۶۳ھ میں دوبارہ نہر جیحون عبور کی، جس کی وجہ اس کی یہ اطلاع تھی صغد اس کے لیے جمع ہو رہے ہیں، اس نے ان سے جنگ کی جس میں ان کا حکمران مارا گیا،[2] مگر اسے علاقہ کی داخلی مشکلات سے نمٹنے کے لیے (مرو) جلد واپس آنا پڑا، ان دنوں تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح فتنے پے در پے سر اٹھا رہے تھے۔[3] ۶۴ھ میں یزید بن معاویہ فوت ہو گیا، اس کے بعد معاویہ بن یزید بن معاویہ کی بیعت کی گئی مگر تین ماہ بعد وہ بھی چل بسا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ صرف چالیس دن حکومت کرنے کے بعد موت کی آغوش میں چلا گیا۔[4] جب سلم کو یزید بن معاویہ کی موت کی خبر ملی تو اس نے اسے چھپائے رکھا مگر یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح خراسان میں پھیل گئی، اس جیسی خبروں کو زیادہ دیر تک چھپانا ممکن نہیں ہوتا، جب سلم کو علم ہوا کہ یزید کی موت کی خبر لوگوں میں پھیل گئی ہے تو پھر اس نے یزید اور اس کے بیٹے

معاویہ کی موت کی خبر ظاہر کر دی اور لوگوں کو خوشی سے اس وقت تک بیعت کرنے کی دعوت دی جب تک لوگوں کا کسی خلیفہ پر اتفاق نہیں ہو جاتا۔ لوگوں نے اس سے بیعت تو کر لی مگر دو ماہ بعد ہی اسے توڑ ڈالا، اگرچہ لوگوں کے ساتھ سلم کا رویہ بہت اچھا تھا اور وہ اس سے دلی محبت کرتے تھے مگر عرب قبائل کے بعض لوگوں نے عصبیت و تعصب سے کام لیتے ہوئے اس سے بیعت توڑ ڈالی۔ اہل خراسان کو کوئی ایسا امیر نہ مل سکا جو سلم بن زیاد کی طرح ان سے محبت کرتا۔[5] مگر ان کا ایک کہنے والا کہتا ہے: سلم کا یہ خیال غلط تھا کہ وہ جماعت اور فتنہ کے دوران ہم پر امارت کر لے گا۔[6] اہل خراسان نے اپنے عمال کو خراسان سے باہر نکال دیا اور ہر قوم نے اپنے اپنے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا، ہر طرف فتنہ اٹھ کھڑا ہوا اور جنگ و جدال شروع ہو گیا۔[7] خود عرب قبائل کے درمیان باہم قتل و قتال کی کیفیت پیدا ہو گئی خراسان کئی علاقوں میں تقسیم ہو گیا اور ہر علاقے کا ایک قائد اور امیر ہوتا، مسلمانوں کے مقتولین کی لاشیں گرنے لگیں، فتوحات کا سلسلہ رک گیا اور سلم نے مکہ مکرمہ میں موجود عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی راہ لی۔[1]

سادسًا:... عہد معاویہ میں فتوحات سندھ

عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں مسلمانوں نے اپنا اثر و نفوذ دریائے سندھ کے ماوراء تک بڑھا لیا، ۴۴ھ میں مہلب بن ابو صفرہ نے سندھ میں جنگ کی اور وہ بنہ اور لاہور تک پہنچ گیا۔[2] یہ دونوں شہر ملتان اور کابل کے درمیان واقع ہیں۔ ۴۵ھ کے آغاز میں والی بصرہ عبد اللہ بن عامر نے عبد اللہ بن سوار عبیدی کو چار ہزار لوگوں پر مقرر کر کے سندھ بھیجا، جب ابن سوار مکران پہنچا تو وہاں اس نے چار ماہ تک قیام کیا اس دوران وہ اپنے آپ کو اور اپنے لشکر کو متوقع حملہ کے لیے تیار کرتا رہا، پھر وہ اپنے لشکر کے ساتھ بلاد قیقان[3] کی طرف بڑھا اور اسے فتح کر لیا، اس نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں قیقانی گھوڑے تحفتًا پیش کیے۔[4] یہ گھوڑے اس نے شام میں انہیں ذاتی طور پر پیش کیے تھے۔ قیقانی برذونی گھوڑے انہیں گھوڑوں کی نسل سے ہیں۔[5] بہر حال ابن سوار سندھ میں زیادہ طویل عرصے تک قیام نہ کر سکا اس لیے کہ اس علاقہ میں موجود ترکوں کی ایک جماعت نے ۴۷ھ میں اسے قتل کر ڈالا تھا۔[6] پھر ۴۶ھ میں زیاد بن ابو سفیان نے سلمان بن سلمہ بن محبق ہذلی کا سندھ میں مفتوحہ علاقوں کے والی کے طور پر انتخاب کیا، سنان نے وہاں پہنچنے کے بعد مکران شہر کو بزور طاقت فتح کر لیا اور خود وہاں مقیم ہو کر مفتوحہ علاقوں کو کنٹرول کرنے لگا،[7] مگر زیاد نے ایک یا دو سال بعد اسے معزول کر کے اس کی جگہ راشد بن عمر ازدی کو والی مقرر کر دیا، اس نے مکران آمد کے بعد بلاد قیقان میں پیش قدمی شروع کی جس میں وہ کامیاب رہا، پھر جب مید کی طرف متوجہ ہوا تو وہاں اسے قتل کر دیا گیا۔[8] اس کے بعد سجستان کی زمام اقتدار عباد بن زیاد بن ابو سفیان کے ہاتھ میں آئی تو وہ حملے کرتا ہوا دریائے سندھ کے علاقہ حوض میں اندر تک چلا گیا پھر کِش میں پڑاؤ کیا اور پھر قندھار کی طرف چلا[9] اور اس کے شہریوں سے جنگ کر کے انہیں شکست دے دی اور کئی مسلمانوں کے جانی نقصان کے عوض اسے فتح کر لیا۔[10] دنیا کے اس حصے میں اسلامی فتوحات کی نگرانی کرنے والا آخری والی ابو الاشعث منذر بن جارود العبدی تھا جسے ۶۲ھ میں والی بصرہ عبد اللہ بن زیاد بن ابو سفیان کی طرف سے متعین کیا گیا تھا۔ منذر نے قصدار [11] شہر کے خلاف حملہ کی قیادت کی اور اسے فتح کرنے میں کامیاب ٹھہرا۔[12]

[1] فتوح البلدان، ص: ۵۸۲۔ قادة الفتح الاسلامی، ص: ۱۵۴. [2] بنّہ: کابل کے قریب ایک شہر۔ معجم البلدان: ۲/۵۰۰. [3] قیقان: طبرستان کے قریب ایک شہر۔ معجم البلدان: ۴/۳۲۳. [4] فتوح البلدان، ص: ۴۳۲. [5] تاریخ خلیفة، ص: ۲۰۷۔ خلافة معاویة از عقیلی، ص: ۱۴۲. [6] ایضا. [7] فتوح البلدان، ص: ۴۳۲. [8] ایضا. [9] معجم البلدان: ۴/۳۰۲. [10] فتوح البلدان، ص: ۴۳۳. [11] معجم البلدان: ۴/۳۵۳. [12] فتوح البلدان، ص: ۴۳۳۔ خلافة معاویة از عقیلی، ص: ۱۴۳.

چوتھی بحث:

فتوحاتِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دوران حاصل ہونے والے اہم ترین دروس

وعبر اور فوائد

اولاً:... مجاہدین پر قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کے اثرات

جہاد کی فضیلت کے بارے میں وارد قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کا مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر تھا، اللہ عزوجل نے اس امر کو واضح فرمادیا ہے کہ مجاہدین کو ان کی جملہ نقل وحرکت پر اجر وثواب سے نوازا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (التوبۃ: ۱۲۰۱۲۱)

"مدینہ کے رہنے والوں اور جو دیہاتی ان کے گرد وپیش ہیں ان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ کو چھوڑ کر پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ کہ اپنی جان کو ان کی جان سے عزیز سمجھیں اور یہ اس لیے کہ ان کو اللہ کی راہ میں جو تکان پہنچی اور جو بھوک لگی اور جو کسی ایسی جگہ چلے جو کفار کے لیے موجب غیض ہوئی ہو اور دشمن کی جو خبر لی ان سب پر ان کے نام ایک ایک نیک کام لکھا گیا، یقیناً اللہ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتا اور جو کچھ انہوں نے چھوٹا بڑا خرچ کیا اور جتنے میدان طے کرنے پڑے یہ سب بھی ان کے نام لکھا گیا تاکہ اللہ ان کے کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔" انہوں نے قرآن سے ہی یہ تعلیم حاصل کی تھی کہ جہاد مسجد حرام کو آباد کرنے اور اس میں حاجیوں کو پانی پلانے سے بھی افضل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (التوبۃ: ۱۹۲۲)

"کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلالینا اور مسجد حرام کی خدمت کرنا اس کے برابر کردیا ہے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہ اللہ کے نزدیک برابر کے نہیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا، جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جان سے جہاد کیا وہ

اللہ کے ہاں بہت بڑے مرتبے والے ہیں اور یہی لوگ مراد پانے والے ہیں، ان کا رب انہیں خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت کی اور اپنی رضامندی کی اور جنتوں کی اور ان کے لیے وہاں ہمیشہ کی نعمت ہے۔ وہاں یہ ہمیشہ رہیں گے یقیناً اللہ کے ہاں اجر عظیم ہے۔"

اور ان کا اعتقاد تھا کہ جہاد ہر حالت میں فوز و فلاح سے ہمکنار کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝﴾ (التوبۃ: ۵۲)

"کہہ دیجیے کہ تم ہمارے بارے میں جس چیز کا انتظار کر رہے ہو وہ دو بھلائیوں میں سے ایک ہے اور ہم تمہارے بارے میں اس کا انتظار کرتے ہیں کہ یا تو اللہ تمہیں اپنے پاس سے کوئی سزا دے یا ہمارے ہاتھوں سے، پس ایک طرف تم منتظر رہو اور دوسری جانب تمہارے ساتھ ہم بھی منتظر ہیں۔" اور یہ کہ شہید زندہ ہے اور اس کی زندگی ختم ہونے والی نہیں ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۱۶۹۱۷۱)

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے گئے انہیں مردہ ہرگز نہ سمجھیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں۔ انہیں اللہ نے اپنا جو فضل دے رکھا ہے وہ اس سے بہت خوش ہیں اور ان لوگوں کی بابت بہت خوش ہیں جو اب تک ان سے ان کے پیچھے سے نہیں ملے اس پر کہ انہیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، وہ خوش ہوتے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل سے اور اس سے بھی کہ اللہ ایمان والوں کے اجر کو برباد نہیں کرے گا۔" مجاہدین کو اپنے اس ہدف کی عظمت و برتری کا بخوبی شعور تھا جس کے لیے وہ قتال کر رہے تھے، ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝﴾ (النساء: ۷۴۷۶)

"پس جو لوگ دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے بیچ چکے ہیں انہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہیے، اور جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے شہادت پا لے یا غالب آ جائے تو یقیناً ہم اسے اجر عظیم سے نوازیں گے، اور تمہیں کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور ان بچوں کے

چھٹکارے کے لیے جہاد نہ کرو؟ جو یوں دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اسے ہمارے پروردگار! ان ظالموں کی بستی سے ہمیں نجات دے اور ہمارے لیے خود اپنے پاس سے حمایتی مقرر کر دے اور ہمارے لیے خاص اپنے پاس سے مددگار بنا۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اللہ کے سوا اوروں کی راہ میں لڑتے ہیں، پس تم شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو، اور یقین مانو کہ شیطانی حیلہ سخت کمزور ہے۔" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروکار مسلمانوں کو فضیلت جہاد سے آگاہ فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ نے ان کے مشاعر و جذبات کو بھڑکا دیا اور ان سے ان کی طاقتیں ابل پڑیں۔ ان احادیث میں سے چند پیش خدمت ہیں: ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: کون سے لوگ افضل ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ مومن جو اپنی جان اور اپنے مال سے جہاد کرتا ہے۔"[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین کے درجات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "بے شک جنت میں سو درجات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے تیار کر رکھا ہے، دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان۔ جب تم اللہ سے کچھ مانگو تو اس سے جنت الفردوس مانگو اس لیے کہ وہ بہترین اور بلند ترین جنت ہے۔"[2] نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء کی فضیلت و کرامت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جو اس کی راہ میں نکلا اور اسے صرف مجھ پر ایمان اور میرے رسولوں کی تصدیق نے اس راہ میں نکالا کہ یا تو میں اسے اجر و ثواب کے ساتھ واپس لوٹاؤں گا یا اسے جنت میں داخل کروں گا اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں اپنی امت کو مشقت میں ڈالوں گا تو میں کسی بھی لشکر کے پیچھے بیٹھا نہ رہتا، میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں شہید کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر شہید کر دیا جاؤں۔"[1] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ارشاد گرامی ہے: "جنت میں داخل ہونے والا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو دنیا میں واپس جانا چاہتا ہو چاہے اسے دنیا کی ساری دولت مل جائے بجز شہید کے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں واپس جائے اور اسے دس بار شہید کیا جائے کیونکہ وہ وہاں شہادت کی عزت دیکھتا ہے۔"[2] پہلے مسلمان اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ان آیات و احادیث سے متاثر ہوئے، بڑی عمر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب جہاد کے لیے نکلتے اور پھر اس میں عملاً حصہ لیتے تو لوگ ان پر ترس کھاتے اور انہیں جہاد میں حصہ نہ لینے کے بارے میں کہتے اس لیے کہ وہ معذور ہیں مگر وہ جواب دیتے کہ سورہ توبہ انہیں جہاد ترک کر کے گھر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی، اگر وہ جہاد سے پیچھے رہے تو انہیں اپنے بارے نفاق کا ڈر ہو گا۔[3] علماء، فقہاء اور زہاد کا ان آیات و احادیث پر مبنی لوگوں کی تربیت کرنے میں بھی بڑا کردار رہا ہے۔ ان علماء میں معمر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے جیسا کہ ابو ایوب انصاری اور ابن عمرو دیگر رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے ابو مسلم خولانی۔ ان کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ امت اسلامیہ کی بقاء کے لیے از حد ضروری ہے، لہٰذا انہوں نے بلاد شام، شمالی افریقہ، خراسان، سجستان اور سندھ کی فتوحات میں یہ فریضہ سرانجام دیا، اور ان کی طرف سے اس فریضہ کی ادائیگی پر بہت سارے ثمرات مرتب ہوئے، مثلاً: امت اسلامیہ میں بشری قیادت کی اہلیت پیدا ہوئی، کفار کا رعب و دبدبہ ختم ہوا اور انہیں کمزور کر دیا گیا۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب پیدا ہوا اور لوگوں پر دعوت اسلامیہ کی سچائی ثابت ہوئی جس کی وجہ سے وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگے جس سے مسلمانوں کی عزت میں مزید اضافہ ہوا اور کافر مزید ذلیل ہو گئے، اپنے دشمنوں کے خلاف مسلمانوں کی صفوں میں وحدت پیدا ہوئی اور انہوں نے لوگوں کو اسلام کے نور اور اس کے عدل و رحمت کے ساتھ سعادت مند بنایا۔[4]

[1] مسلم: ۳/۱۴۹۷. [2] بخاری، رقم الحدیث: ۲۸۱۷. [3] الجهاد فی سبیل الله، قادری: ۱/۱۴۵. [4] الجهاد فی سبیل الله: ۲/۴۱۱۴۸۲.

پانچویں بحث:

ولایت عہد اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات

اوّلًا:...یزید کی بیعت کے لیے غور وخوض کی ابتدا

اکثر باحثین یزید بن معاویہ کی بیعت کروانے کی ذمہ داری مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر ڈالتے ہیں۔ ان کے نزدیک انہوں نے ہی معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی وفات کے بعد یزید کو خلیفہ بنانے کی تجویز دی تھی اور یہ کہ وہ اہل کوفہ کو اس پر آمادہ کریں گے کہ وہ یزید کی ولی عہدی کو قبول کر لیں۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت لگانے والے اپنے اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر اس روایت کو پیش کرتے ہیں جسے بعض قدیم مصادر نے وارد کیا ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے تو انہوں نے انہیں کوفہ کی ولایت سے معزول کر دیا، معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی جگہ سعید بن العاص کو کوفہ کا گورنر متعین کرنا چاہتے تھے مگر مغیرہ رضی اللہ عنہ اس کے لیے آمادہ نہیں تھے وہ دوبارہ کوفہ کی امارت کے متمنی تھے۔ وہ یہاں سے اٹھ کر یزید کے پاس گئے اور اس کے سامنے اسے خلیفہ بنانے کی اپنی تجویز رکھی۔ یزید نے اس کی خبر اپنے باپ کو دی تو انہوں نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلا کر انہیں کوفہ کا دوبارہ والی بنا کر واپس جانے اور یزید کی بیعت کے لیے کام کرنے کا حکم دیا۔[1] مگر اس کی تمام سندیں کمزور ہیں جس کی بنا پر ہم کسی بھی صورت اس روایت کو قبول کرنے سے قاصر ہیں، پھر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں اور ان کی یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے قبل ہی ۵۰ھ میں وفات ہو گئی تھی۔[2]

یہ تجویز عراق پر زیاد بن ابیہ کی ولایت کے دوران منظر عام پر آئی، مؤرخ طبری نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت کا مطالبہ ۵۶ھ میں کیا تھا۔[3] یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے قبل یہ تجویز پیش کی تھی تو اسے عملی جامہ پہنانے میں اتنے سالوں کی تاخیر کیوں ہوئی؟[4]

ا۔ بیعت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا طریقہ انعقاد:

اہل حل وعقد نے سقیفہ بنو ساعدہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیعت خاصہ کی پھر دوسرے دن انہوں نے انہیں لوگوں کے سامنے نامزد کیا اور امت اسلامیہ نے مسجد نبوی میں ان سے بیعت عامہ کی۔[1] سقیفہ بنو ساعدہ میں جو گفتگو ہوئی اس سے چند اصول کھل کر سامنے آئے، جن میں سے اہم تر یہ ہیں: امت کی قیادت صرف منتخب شدہ ہو گی، بیعت اختیار و انتخاب اور قیادت کے قانونی ہونے کا اصل اصول ہے۔ یعنی خلافت کے منصب پر وہی شخص فائز ہو سکتا ہے جو دینی اعتبار سے مضبوط اور انتظامی اعتبار سے زیادہ باصلاحیت ہو۔ خلیفہ کا انتخاب اسلامی، ذاتی اور اخلاقی اصولوں کے مطابق ہو گا۔ یعنی خلافت نسبی یا قبائلی وراثت کے اصول کے ضمن میں نہیں آتی۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں ہونے والے مذاکرات مسلمانوں میں ذاتی امن کے اصول پر کامیاب ہوئے، ایسا اصول امن جس میں نہ تو کوئی فتنہ وفساد ہو اور نہ عہد شکنی، نہ کوئی سازش ہو اور نہ ہی نقض اتفاق۔[2]

ا: سقیفہ بنو ساعدہ کے اجتماع نے یہ قرار داد پاس کی کہ نظام حکومت یا دستور حکومت اس شوریٰ کے اصول کی تطبیق کرتے ہوئے آزاد شوریٰ کا تقرر کرتا ہے جو نص قرآن حکیم سے ثابت ہے، لہٰذا یہ اصول اجماعی ہے اور اس اجماع کی دلیل شوریٰ کو فرض قرار دینے والی قرآنی نصوص ہیں، یہ پہلا دستوری اصول ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرار پایا، یہ اجماع کتاب و سنت کی ان نصوص کی تائید و تطبیق تھی جو شوریٰ کو واجب قرار دیتی ہیں۔ ب: سقیفہ کے دن یہ بھی قرار پایا کہ اسلامی حکومت کے رئیس کا انتخاب اور اس کے اختیارات کی تحدید کا شوریٰ کے ذریعے اتمام ضروری ہے۔ یہ دوسرا دستوری اصول تھا جسے اجماع نے قرار دیا اور یہ کبھی مذکورہ الصدر کی طرح اجماعی قرار داد تھی۔

ج: گزشتہ دونوں اصولوں کی تطبیق کرتے ہوئے سقیفہ کے اجتماع نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دولت اسلامیہ کے پہلے خلیفہ کے طور پر منتخب کیا[3] مگر یہ نامزدگی بیعت عامہ کے بعد ہی درست قرار پائی، یعنی جب جمہور مسلمانوں نے دوسرے دن مسجد نبوی میں اس انتخاب سے موافقت کر لی اور انہوں نے اس بیعت کے لیے ان شرائط کو قبول کر لیا[4] جن کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے مشہور خطبہ میں فرمایا تھا: مجھے تمہارا سردار بنایا گیا ہے، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھے اعمال کروں تو میری مدد کرنا تم پر فرض ہے اور اگر میں کوئی غلط راہ اختیار کروں تو مجھے سیدھے راستے پر ڈال دو۔ راست گوئی امانت ہے اور دروغ گوئی خیانت، تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک طاقتور ہے جب تک اسے اس کا حق نہ دلوا دوں، اور تم میں جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں اس سے حق وصول نہ کر لوں۔ جو لوگ جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دیتے ہیں اللہ انہیں ذلیل کر دیتا ہے اور جس قوم میں فحاشی عام ہو جائے اللہ اسے آفات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں، اب نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔[1] اس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے منبر پر تشریف فرما ہونے کی درخواست کی اور وہ اس کے لیے اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ وہ منبر پر تشریف فرما ہو گئے اور پھر لوگوں نے ان سے بیعت عامہ کی۔[2]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ کا شمار مختصر ہونے کے باوجود بہترین اسلامی خطبات میں ہوتا ہے جس میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حاکم و محکوم کے مابین تعامل میں عدل و رحمت کے قواعد و ضوابط متعین فرمائے ہیں اور اس بات پر زور دے کر کہا کہ حکمرانوں کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ اس دوران آپ نے جہاد فی سبیل اللہ پر زور دیا اس لیے کہ امت کو عزت و توقیر عطا کرنے میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ نے بے حیائی اور فحاشی سے اجتناب کی تلقین کی، اس لیے کہ معاشرے کو تباہی اور فساد سے بچانے کے لیے یہ چیز بڑی اہمیت کی حامل ہے۔[3]

۲۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیعت کے انعقاد کا طریقہ:

جب خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا: تم لوگ میری بیماری کی شدت دیکھ ہی رہے ہو، میں سمجھتا ہوں کہ اس بیماری کی وجہ سے میری موت یقینی ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے ایمان کو میری بیعت سے آزاد کر دیا ہے، میری گرہ کو کھول دیا اور تمہارا معاملہ تمہیں واپس کر دیا ہے۔ اب تم جسے چاہو اپنا امیر بنا لو، ویسے اگر تم میری زندگی میں ہی کسی کو اپنا امیر بنا لو تو

اس طرح تم میرے بعد اختلاف کرنے سے بچ جاؤ گے۔[4] سیّدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اگلے خلیفہ کے انتخاب کی کارروائی مکمل کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ مثلاً: الف: کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت:... آپ رضی اللہ عنہ نے اس بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو وہ کہنے لگے: خلیفہ رسول! جو آپ کی رائے ہو گی وہی رائے ہماری ہو گی، اس پر آپ نے عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے فرمایا: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا: آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر بھی؟ وہ کہنے لگے: واللہ! وہ ان کے بارے میں تمہاری رائے سے بھی بہتر ہیں۔ پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے فرمایا: مجھے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ بتائیں۔ انہوں نے جواب دیا: آپ ان سے زیادہ باخبر ہیں۔ ویسے ان کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور ہم میں سے کوئی بھی ان جیسا نہیں ہے۔ اس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان سے بھی ایسا ہی سوال کیا تو وہ کہنے لگے: میں تمہارے بعد انہیں سب سے بہتر خیال کرتا ہوں۔ وہ اچھے کاموں سے خوش ہوتے اور برے کاموں سے ناراض ہوتے ہیں اور ان کا اندرون ان کے بیرون سے بہتر ہے۔ منصب خلافت کو سنبھالنے والا ان سے زیادہ طاقتور اور کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح انہوں نے سعید بن زید اور انصار و مہاجرین میں سے متعدد لوگوں سے مشاورت کی اور بجز طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان سب کی رائے تقریباً ایک جیسی ہی تھی۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ان کی سخت گیری سے خائف تھے، وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: آپ کل اللہ کو کیا جواب دیں گے جب وہ تم سے عمر رضی اللہ عنہ کو ہمارا خلیفہ بنانے کے بارے میں سوال کرے گا۔ آپ ان کی سخت مزاجی کے بارے میں تو آگاہ ہی ہیں۔ یہ سن کر ابو بکر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: مجھے اٹھا کر بٹھا دو، کیا تم لوگ مجھے اللہ سے ڈراتے ہو؟ میں اللہ کو جواب دوں گا کہ میں نے تیری مخلوق پر تیری مخلوق کے بہترین آدمی کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔[1] آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کی سختی صرف اس لیے ہے کہ وہ مجھے نرم مزاج دیکھتے تھے۔ جب خلافت انہیں تفویض کی جائے گی تو وہ انہیں نرم دل اور معتدل بنا دے گی۔[2] پھر آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا کر انہیں وصیت نامہ لکھنے کا حکم دیا۔ ب: وصیت نامہ کا مضمون:... بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ... یہ وہ عہد ہے جو ابو بکر بن قحافہ نے اس وقت کیا جب ان کا دنیا میں آخری اور آخرت کا اوّل وقت ہے، ایسے میں تو کافر بھی ایمان لے آتا ہے، فاجر بھی یقین کر لیتا ہے اور کاذب سچ بولنے لگ جاتا ہے۔ میں نے اپنے بعد تم لوگوں پر عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔ تم ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو، میں نے تم لوگوں کی بھلائی اور بہتری میں قطعاً کوئی کوتاہی نہیں کی، اگر انہوں نے عدل سے کام لیا تو میرا ان کے بارے میں یہی خیال ہے اور میں ان کے بارے میں یہی علم رکھتا ہوں، اور اگر وہ کچھ اور ثابت ہوئے تو وہ اپنے کیے کے خود ذمہ دار ہوں گے، میں نے تو صرف خیر اور بھلائی کا اِرادہ کیا ہے اور غیب کا علم تو مجھے نہیں۔ ﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾ (الشعراء: ۲۲۷) "اور عنقریب ظالموں کو معلوم ہو جائے گا کہ انہیں کیسی جگہ لوٹ کر جانا ہے۔"

ج: آپ رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت خود لوگوں کو پڑھ کر سنائی:... جب یہ وصیت لکھی جا چکی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے خود پڑھ کر لوگوں کو سنانے کا ارادہ کیا تاکہ اس بارے میں کوئی ابہام پیدا نہ ہو، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے اور لوگوں کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کیا تم اس شخص کی خلافت پر راضی ہو جس کا میں نے تمہارے لیے انتخاب کیا ہے، اللہ کی قسم! میں نے اپنے کسی عزیز رشتہ دار کو تمہارا خلیفہ نہیں بنایا، اور پھر میں

نے صرف اپنی ہی رائے سے اسے خلیفہ نہیں بنایا بلکہ اصحاب الرائے لوگوں کے ساتھ مشاورت کے بعد اسے خلیفہ بنایا ہے، میں نے تم پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا ہے، پس تم ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ ان سب نے کہا: ہم نے سنا اور اطاعت کی۔[1]

د: اللہ رب العزت سے دعا:... پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر دعا کرنے لگے، اس دوران آپ سرگوشیاں کرتے رہے اور اندر کی باتیں سناتے رہے۔ آپ کی دعا کے الفاظ یہ تھے: یا اللہ! میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو تیرے نبی کے حکم کے بغیر والی مقرر کیا ہے جس سے میرے پیش نظر صرف مسلمانوں کی بہتری ہے، میں ان پر فتنہ سے ڈرا اور اس کے لیے بھرپور مشاورت کی اور اس کے بعد میں نے ان پر ان میں سے بہتر آدمی کو والی مقرر کیا۔ اب جبکہ تیرے حکم سے میری موت میرے سر پر کھڑی ہے تو تو ان میں میرا خلیفہ بن جا، پس وہ تیرے بندے ہیں۔[2]

ھ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے سامنے وصیت پڑھنے کا مکلف ٹھہرانا:... حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو پابند کیا کہ وہ یہ وصیت لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور اسے ختم کرنے کے بعد ان کی موت سے پہلے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے ان سے بیعت لیں تاکہ اس کی مزید توثیق ہو جائے، ان کے حکم کا نفاذ ہو جائے اور اس سے کوئی منفی اثرات سامنے نہ آئیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: اس وصیت نامہ میں جس شخص کا ذکر ہے کیا تم اس سے بیعت کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ ان سب نے اس کا اقرار کیا اور اس پر راضی ہو گئے۔[3] و: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو وصیت:... حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو الگ کر کے انہیں چند وصیتیں فرمائیں تاکہ جب وہ اپنے رب کے حضور حاضر ہوں تو خلافت کے بارے میں اپنی بھرپور کوششیں کرنے کے بعد اپنی تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد حاضر ہوں۔[4] آپ نے انہیں وصیت کرتے ہوئے فرمایا: عمر! اللہ سے ڈرنا، یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض حقوق ہیں جو رات سے متعلق ہیں انہیں وہ دن میں قبول نہیں کرتا، اسی طرح بعض حقوق دن سے متعلق ہیں جنہیں وہ رات میں قبول نہیں کرتا۔ جب تک فرائض ادا نہ کیے جائیں اللہ تعالیٰ نوافل کو قبول نہیں فرماتا، عمر! جو لوگ دنیا میں رہ کر حق کی اتباع کریں گے قیامت کے دن ان کے ترازو بھاری ہوں گے اور جو دنیا کی زندگی میں باطل کی اتباع کرتے رہے قیامت کے دن ان کے اعمال کے ترازو ہلکے ہوں گے اور وہ ناکام و نامراد ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جب اہل جنت کا ذکر کیا تو اس کے ساتھ ان کے نیک اعمال کا بھی ذکر کیا اور جب اہل جہنم کا ذکر کیا تو اس کے ساتھ ان کے برے اعمال کا بھی ذکر کیا، اس طرح ترغیب و ترہیب کی آیات ساتھ ساتھ نازل ہوئیں تاکہ بندہ مومن اللہ سے ڈرتا رہے اور اس سے مغفرت طلب کرتا رہے۔ وہ نہ تو اللہ کی رحمت سے مایوس ہو اور نہ اس سے ناجائز امیدیں ہی وابستہ کرے۔ عمر! جب تم میری وصیت پر عمل کرو گے تو پھر کوئی بھی غیر موجود تجھے موت سے زیادہ قابل نفرت نہیں لگے گا مگر تم موت کو بے بس نہیں کر سکو گے۔[1] ہم دیکھ رہے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ اصحاب حل و عقد کے اتفاق اور ان کے اِرادہ سے منتخب ہوئے تھے، انہوں نے خلیفہ کے انتخاب کا معاملہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا اور اس بارے انہیں اپنا نائب مقرر کر دیا، انہوں نے مشاورت کے بعد خلیفہ کی تعیین کی پھر اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کی توثیق کر دی، امت اسلامیہ میں اصحاب حل و عقد امت کے نمائندگان ہوتے ہیں۔ اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا فیصلہ شورائیت کے بہترین انداز اور انتہائی عادلانہ اسلوب میں ہوا۔[2] ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے جو اقدامات لیے اگرچہ وہ ان کے اپنے انتخاب کی کاروائیوں سے مختلف تھے مگر وہ کسی بھی حالت میں شورائیت سے تجاوز نہیں کرتے۔[3] اور یوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کا انعقاد شوریٰ اور اتفاق کی بنیاد پر ہوا،

تاریخ نے ان کی خلافت کے بارے میں کسی بھی قسم کے اختلاف کو وارد نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے ان کی خلافت کے عرصہ کے دوران اس بارے کوئی تنازع کیا۔ ان کی حکومت کے دوران ان کی خلافت و اطاعت پر امت کا اجماع رہا اور تمام مسلمان ایک وحدت کی صورت میں نظر آتے رہے۔[4]

۳۔ بیعت عثمان رضی اللہ عنہ کا طریقہ انعقاد:

فاروق اعظم نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جبکہ وہ بستر مرگ پر اپنے جسم پر آنے والے گہرے زخموں کی تکلیف سے کراہ رہے تھے نئے خلیفہ کے انتخاب کے لیے ایک ایسا نیا طریقہ وضع کیا جس کی قبل ازیں کوئی مثال نہیں ملتی، قبل ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کسی بھی شخص کو نص صریح کے ساتھ خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشاورت کے بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا، پھر جب آپ سے کسی کو خلیفہ بنانے کا مطالبہ کیا گیا تو آپ نے کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد ایک دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ سب کے سب ابو بکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت کا اقرار کرتے تھے اور اسے میں اختلاف کا احتمال بہت کم تھا خاص طور پر ایسے حالات میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے امت کو اس طرف متوجہ کیا کہ ان کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ خلافت سنبھالنے کے زیادہ حق دار ہیں، پھر جب ابن ابو قحافہ رضی اللہ عنہما نے خلافت کے لیے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا تو انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ جملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات پر مطمئن ہیں کہ وہ ان سب لوگوں سے زیادہ طاقت ور، باقدرت اور افضل و بہتر ہیں جو اُن کے بعد یہ ذمہ داری سنبھال سکتے ہیں، چنانچہ انہوں نے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایک طویل مشاورت کے بعد انہیں خلیفہ نامزد کر دیا اور پھر کسی ایک شخص نے بھی ان کی اس رائے سے اختلاف نہ کیا اور اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اجماع ہو گیا۔[1] مگر اب نئے خلیفہ کا طریقہ انتخاب یہ قرار پایا کہ چھ بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ قائم کر دی گئی، وہ سب کے سب ایسے تھے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ ان سے صدق دل سے راضی تھے، مزید برآں وہ سب کے سب منصب خلافت سنبھالنے کی صلاحیت سے بہرہ مند تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے طریقہ انتخاب، مدت انتخاب اور اس مجلس کے ممبران کی تعداد طے فرمادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ نامزد کردہ ان چھ اشخاص کی مجلس میں جب تک وہ اپنے آپ میں سے کسی ایک شخص کو خلیفہ منتخب نہ کر لیں، اس میں کسی دوسرے شخص کو نہ جانے دیا جائے اور نہ ہی کوئی اہل حل و عقد کی اس مجلس میں ہونے والی گفتگو کو سن پائے۔[2] یوں امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کا ایسا نظام وضع کر دیا جو اُن سے پہلے کسی نے نہ کیا، اس میں تو شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ شوریٰ کا اصول قرآن کریم اور قولی و فعلی سنت میں مقرر کردہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر عمل پیرا رہے اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی اصل سے ہٹ کر کوئی نئی بات ایجاد نہیں کی تھی، مگر خلیفہ کے انتخاب کے لیے طریقہ کی تعیین اور اس کے لیے چند معین افراد پر مشتمل مجلس شوریٰ کی تشکیل ایک ایسا عمل تھا جسے نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا اور نہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے، سب سے پہلے یہ کام کرنے والے عمر رضی اللہ عنہ تھے اور انہوں نے جو کچھ بھی کیا بہت خوب کیا۔ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کی مناسبت سے یہ طریقہ ہی بہترین طریقہ تھا۔[3] اس طرح امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے اہل شوریٰ پر مشتمل ایک اعلیٰ سیاسی ادارہ قائم کر دیا اور پھر انہیں اپنے میں سے ہی کسی ایک شخص کو خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار بھی تفویض کر دیا۔ اس جگہ ہم اس بات کی طرف اشارہ کرنا بہت ضروری خیال کرتے ہیں کہ اہل شوریٰ میں سے کسی ایک شخص

نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ سے معارضہ نہیں کیا اور نہ ہی دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اس پر کسی نے کوئی اعتراض اٹھایا۔ اس وقت جو نصوص ہمارے سامنے ہیں وہ اسی بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم پر ان کی زندگی میں ہی کوئی اعتراض کیا گیا اور نہ ہی ان کی حیات مستعار کے بعد۔ تمام لوگوں نے ان کی تدبیر کو پسند کیا اور ان میں اہل اسلام کی مصلحت دیکھی۔ ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ایسا اعلیٰ سیاسی ادارہ قائم کیا جس کی ذمہ داری سربراہ مملکت یا خلیفہ کا انتخاب تھا۔ یہ نئی دستوری تنظیم جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تعجب انگیز ذہن رسا نے ایجاد کیا تھا وہ ان اساسی مبادیات سے متعارض نہیں ہے جن کا اسلام اقرار کرتا ہے اور خصوصاً وہ مبادیات جو شوریٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس بنا پر بعض ذہنوں میں پیدا ہونے والا یہ سوال ناقابل التفات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ حق کس نے دیا تھا؟ اور اس بارے میں ان کے پاس دلیل کیا تھی؟ ہمارے لیے یہی جاننا کافی ہے کہ مسلمانوں نے من حیث الجماعۃ اس تدبیر کی تصدیق کی اور اسے پسند کیا اور کسی نے بھی ان پر کوئی اعتراض نہ کیا، لہٰذا ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کی درستی اور نفاذ پر امت کا اجماع ہو چکا تھا۔[1] ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے اور اہل شوریٰ وہ اعلیٰ ترین سیاسی ادارہ ہے جسے عہد راشدہ میں نظام حکومت نے برقرار رکھا۔ عمر رضی اللہ عنہ کا تشکیل کردہ یہ شورائی ادارہ ایسی خوبیوں سے متصف تھا جن سے مسلمانوں کی جماعت میں کوئی دوسرا ادارہ متصف نہیں تھا۔ یہ خوبیاں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تھیں اور جن کے مبلغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اہل ایمان کے نزدیک مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھی عشرہ مبشرہ کے تقوی وطہارت اور امانت ودیانت تک نہیں پہنچ سکتا۔[2]

یہ بات بڑی اہم اور قابل ذکر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑی شدت کے ساتھ اس امر کے حریص تھے کہ امارت وخلافت کو ان کے قرابت داروں سے دُور رکھا جائے، حالانکہ ان میں اس کے اہل لوگ بھی موجود تھے، چنانچہ آپ نے سعید بن زید کو خلافت کے لیے نامزد لوگوں کی فہرست سے خارج کر دیا۔[3] انہوں نے صرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اہل شوریٰ کے پاس جانے کی اجازت دی تھی مگر اس شرط پر کہ انہیں خلیفہ منتخب نہیں کیا جائے گا۔[4] انتخابی عمل کی نگرانی عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، وہ مدینہ منورہ میں کبار صحابہ اور اشراف صحابہ میں سے جس کو بھی ملتے اس سے اس بارے مشاورت کرتے، اسی طرح لشکروں کے امراء اور مدینہ منورہ آنے والے لوگوں اور عورتوں تک سے مشورہ کرتے۔ آپ نے مشاورت کے اس عمل میں بچوں اور غلاموں کو بھی شامل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ تر مسلمانوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا جبکہ ان میں سے کچھ نے علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کا نام بھی لیا۔ مشاورت کا عمل مکمل کرنے کے بعد ۲۳ ہجری ذوالحجہ کے آخری دن صبح کی نماز کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس نتیجہ کا اعلان کیا جس پر وہ پہنچے تھے۔ انہوں نے حمد وثنا کے بعد فرمایا: امابعد: علی رضی اللہ عنہ! میں نے لوگوں کا جائزہ لیا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے انحراف کریں گے۔ آپ اس سے دل گرفتہ نہ ہوں، پھر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلایا اور اللہ تعالیٰ، اس کے رسول کے احکام اور شیخین کی سنت اپنانے پر ان سے بیعت کر لی ان کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی ان سے بیعت کر لی۔ جن میں انصار، مہاجرین، لشکروں کے امراء اور عام مسلمان سبھی شامل تھے۔[1] ایک روایت میں آتا ہے کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔[2] امام ذہبی عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو ان کا افضل ترین عمل قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بہترین اعمال میں ان کے اس عمل کا بھی شمار ہوتا ہے کہ انہوں نے مشاورت کے وقت اپنے آپ کو خلافت کے معاملہ سے الگ کر لیا، اگر آپ کو اس میں کوئی دلچسپی ہوتی تو

اسے اپنی ذات کے لیے حاصل کر لیتے، یا اس کے لیے اپنے عم زاد بھائی سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ کو منتخب کروالیتے۔[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے شوریٰ کی ایک اور صورت سامنے آتی ہے اور وہ ہے: مجلس شوریٰ کے ذریعے خلیفہ کو نامزد کرنا، تاکہ وہ مشورہ عامہ کے بعد اپنے میں سے کسی ایک کی تعیین کریں اور اس کے بعد اس کے لیے بیعت عامہ لی جائے۔[4]

۴۔ بیعت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کا طریقہ انعقاد:

خلافت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی انتخاب کے طریقہ پر ہوئی۔ جب خلیفہ راشد عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ چند ایسے سرکش اور باغی عناصر کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے، جو مختلف شہروں اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ جب ان لوگوں نے انہیں اٹھارہ ذوالحجہ ۳۵ہجری کو جمعہ کے دن ازراہ ظلم وعدوان 4 قتل کر ڈالا تو مدینہ منورہ میں موجود اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور یہ اس لیے کہ اس وقت کوئی بھی دوسرا شخص ان سے افضل نہیں تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد نہ تو کسی نے اپنے لیے خلافت کا دعویٰ کیا اور نہ ہی حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے والد محترم رضی اللہ عنہ اس کے حریص تھے اسی لیے آغاز کار میں انہوں نے خلافت کو قبول نہ کیا مگر جب شہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فتنہ وفساد میں اضافے اور اس کے مزید بڑھ جانے کے خوف سے ان سے اس منصب کو قبول کرنے کے لیے شدید اصرار کیا تو وہ اس کے لیے آمادہ ہو گئے۔ بعض اہل علم نے ان کے انتخاب کی کیفیت بھی روایت کی ہے۔[5] مثلاً محمد بن الحنفیہ کا بیان ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محاصرہ کی حالت میں تھے تو میں اس وقت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تھا، اس دوران ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: امیر المومنین کو اب شہید کر دیا جائے گا۔ یہ سن کر علی رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے، میں بھی ان کے ساتھ چل دیا مگر ان کے بیت الخلافت آنے سے قبل ہی انہیں شہید کر دیا گیا تھا۔ علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان کے گھر داخل ہونے کے بعد اس کا دروازہ بند کر دیا، اس دوران لوگ آئے اور دروازہ توڑ کر ان کے پاس جا پہنچے اور کہنے لگے: عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے اور لوگوں کے لیے خلیفہ ضروری ہے، مگر ہم کسی کو آپ سے بڑھ کر اس کا حق دار نہیں سمجھتے۔ اس پر علی رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: تم میرا ارادہ نہ کرو، میں تمہارے لیے بطور وزیر، امیر ہونے سے بہتر ہوں۔ وہ کہنے لگے: ہرگز نہیں، واللہ! ہم تم سے بڑھ کر کسی کو بھی اس کا حق دار نہیں سمجھتے۔ وہ کہنے لگے: اگر تم اس پر مُصِر ہو تو پھر میری بیعت سرّی نہیں ہو گی بلکہ میں مسجد میں جاتا ہوں، آپ رضی اللہ عنہ مسجد تشریف لے گئے تو لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی۔[1]

۵۔ بیعت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا طریقہ انعقاد

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کا انعقاد ماہِ رمضان ۴۰ ہجری میں ہوا اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کا واقعہ ہے۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلافت کے لیے کسی کی تعیین نہیں کی تھی۔ عبد اللہ بن سبع سے ان کا یہ قول مروی ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا: یقیناً اس کو اس سے رنگ دیا جائے گا۔[2] آخر بدنصیب میرے بارے میں کس چیز کا انتظار کر رہا ہے۔[3] لوگوں نے کہا: امیر المومنین! اس کے بارے میں ہمیں بتائیں ہم اس کی نسل کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر تو تم میرے بدلے میں

میرے قاتل کے علاوہ کسی اور کو قتل کر ڈالو گے۔ وہ کہنے لگے: تو پھر کسی کو ہمارا خلیفہ نامزد کر دیں، انہوں نے کہا: نہیں، بلکہ میں تمہیں اس چیز کی طرف چھوڑوں گا جس کی طرف تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا تھا۔ وہ کہنے لگے: جب تم اپنے رب کے پاس جاؤ گے تو اسے کیا جواب دو گے؟ فرمایا: میں کہوں گا: یا اللہ! جب تک تو نے چاہا مجھے ان لوگوں میں زندہ رکھا پھر جب تو نے مجھے اپنے پاس بلا لیا تو پھر تو ان میں موجود تھا، اگر تو چاہتا تو ان کی اصلاح کر دیتا اور اگر چاہتا تو انہیں خراب کر دیتا۔ دوسری روایت میں ہے: میں کہوں گا: یا اللہ! جب تک تو نے چاہا مجھے ان کا خلیفہ بنائے رکھا پھر تو نے مجھے قبض کر لیا اور میں ان میں تجھے چھوڑ آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے چار تکبیروں کے ساتھ ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور پھر انہیں کوفہ میں دفن کر دیا گیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے سب سے پہلے قیس بن سعد بن عبادہ خزرجی نے بیعت کی، وہ بیعت کرتے وقت کہنے لگے: میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ملحدین کے ساتھ جہاد کرنے پر آپ سے بیعت کرتا ہوں، اس پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں سب کچھ شامل ہے۔ ان کے لیے علیحدہ نام لینے کی ضرورت نہیں۔ پھر انہوں نے خاموشی کے ساتھ آپ سے بیعت کر لی اور پھر دوسرے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا۔[4] جب اہل عراق نے ان سے بیعت کرنے کا اِرادہ کیا تو آپ نے ان سے یہ اقرار لیا: تم سنو گے بھی اور اطاعت بھی کرو گے جس سے میں جنگ کروں گا اس سے تم بھی جنگ کرو گے اور جس سے میں صلح کروں گا اس سے تم بھی صلح کرو گے۔[5] دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے فرمایا: واللہ میں تم سے اپنی شرائط پر بیعت لوں گا۔ انہوں نے کہا: کون سی شرائط؟ فرمایا جس سے میں صلح کروں گا اس سے تم بھی صلح کرو گے اور جس سے میں جنگ کروں گا اس سے تم بھی جنگ کرو گے۔[1] ابن سعد کی روایت میں ہے: حسن بن علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما نے اپنے باپ کے بعد اہل عراق سے اِمارت پر بیعت کی اور یہ کہ وہ اس چیز میں داخل ہوں گے جس میں حسن رضی اللہ عنہ داخل ہوں گے اور جس سے وہ راضی ہوں گے اس سے اہل عراق بھی راضی ہوں گے۔[2]

۶۔ بیعت معاویہ رضی اللہ عنہ کے انعقاد کا طریقہ:

حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے منصب خلافت سے دست برداری کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت مکمل ہوئی اور انہیں اس کے تمام اسباب میسر آ گئے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر امیر المومنین کے طور پر ۴۱ ہجری میں بیعت ہوئی اور اس سال کو "عام الجماعۃ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔[3] اس وقت تک بقید حیات تمام صحابہ کرام نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کی اور اس طرح ان کی امارت پر امت کا اجماع ہو گیا، لوگوں نے ان کی امامت کو شرعی قرار دیا اور ان کی امامت کو پسند کیا۔ افراد امت نے سمجھا کہ وہ مسلمانوں کی قیادت کے لیے انتہائی موزوں اور یہ ذمہ داری نبھانے کے لیے انتہائی مناسب ہیں۔

۷۔ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں ولایت عہد کے تصور پر اعتراضات:

نظام اسلام حکمران کے انتخاب کے لیے کسی معین طریقہ کار کی صراحت نہیں کرتا البتہ اس نے اس کے لیے ایک ایسی اساس ضرور وضع کر دی ہے جس سے بجز اضطراری حالت کے انحراف کرنا جائز نہیں ہے اور وہ ہے: شوریٰ۔ مگر شوریٰ کے لیے بھی کوئی ایسا خاص اسلوب اور ایک ہی طریقہ کار

نہیں ہے جس کے بغیر وہ متحقق نہ ہو سکتی ہو، اس کے الگ الگ طریقہ ہائے کار ہیں جیسا کہ ہم نے خلفائے راشدین کے انتخاب میں مشاہدہ کیا۔ اگر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسلمان قوم کے اتحاد و اتفاق اور اسے خون ریزی سے بچانے کے لیے اسلامی نظام حکومت میں ولایت عہد کا طریقہ ایجاد کیا تھا تو وہ اس کے لیے ان شاء اللہ ماجور من اللہ ہیں۔ البتہ وہ اس بات پر قادر تھے کہ وہ ایسا اپنے بیٹے کے علاوہ اس وقت موجود کبار صحابہ میں سے کسی کے لیے کرتے اگر انہیں یہ ذمہ داری تفویض کی جاتی تو یقیناوہ اس کا حق ادا کرتے، اس وقت حسین بن علی رضی اللہ عنہما، عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، عبد الرحمن بن ابو بکر رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیر ھم موجود تھے مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سب سے احتراز کرتے ہوئے اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ بنانے کا پروگرام بنایا... اور اس طرح اسلامی نظام حکومت میں ایک حقیقی تبدیلی کی بنیاد رکھ دی، یہ تبدیلی ولایت عہد کے نظام کے ایجاد کرنے میں نہیں تھی بلکہ اصل تبدیلی یہ تھی کہ ولی عہد خلیفہ کا بیٹا یا اس کا کوئی قرابت دار ہو، یہاں تک کہ حکومت خلافت راشدہ کی بجائے ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔[4] اگر ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت کی اتباع کے لیے مامور ہیں تو پھر نظام وراثت کا التزام نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور نہ ہی خلفاء راشدین کی۔ مزید بر آں خلافت کے لیے یزید کی نامزدگی مندرجہ ذیل اسباب کی بناء پر درست نہیں تھی: اس وقت اسلامی معاشرے میں یزید سے کہیں زیادہ خلافت کے حق دار لوگ بھی موجود تھے جو اپنے علم و عمل، مقام و مرتبے، سابق الاسلام اور شرف صحابیت کے اعتبار سے اس سے کہیں بڑھ کر تھے۔ جیسا کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیر ھم۔ چہ نسبت خاک را بعالم پاک۔[1] یہ باپ سے بیٹے کی طرف انتقالِ حکومت کا آغاز تھا۔ علیٰ کل حال اس سے اہل سنت کے عقیدہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ نہ تو معاویہ رضی اللہ عنہ کو گناہوں سے منزہ قرار دیتے ہیں اور نہ ہی ان سے افضل لوگوں کو، چہ جائیکہ وہ انہیں اجتہادی غلطی سے منزہ قرار دیں، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ توبہ و استغفار، نیک اعمال اور مصائب و آلام وغیرہ سے انسان کو گناہوں کی سزا سے چھٹکارا مل جاتا ہے اور یہ قانون صحابہ وغیر ھم کے لیے بھی ہے۔[2] معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان بہترین بادشاہوں میں ہوتا ہے جن کا عدل ان کے ظلم پر غالب رہا۔ البتہ وہ انسانی کمزوریوں سے مبرا نہیں ہیں۔ اللہ ان سے درگزر فرمائے گا۔[3] معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہمارے لیے یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ ہمارے دل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہر قسم کے کینہ وغیرہ سے پاک ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحشر: ۱۰)

"اور جو لوگ ان کے بعد آئے وہ یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کینہ نہ ہونے دے، اے ہمارے پروردگار! تو بڑا شفیق ہے، بڑا مہربان ہے۔" ہمارا موقف ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے امت کے تقسیم ہونے اور اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کے ڈر سے اجتہاد کیا۔ ان کے بعد آنے والے تمام امراء اور بادشاہوں کی غلطیوں کو ان کے ذمے ڈال دینا مناسب نہیں ہے۔ جیسا کہ عبد القادر عودہ قرار دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: معاویہ رضی اللہ عنہ نے امت اسلامیہ کا معاملہ ظلم و طغیان اور پامالی حقوق پر قائم کیا، انہوں نے شوریٰ کا خاتمہ کر دیا اور اس ارشاد باری کو معطل کر دیا: ﴿وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ: ۳۸) "ان کا معاملہ باہم مشاورت سے طے پاتا ہے۔" انہوں نے صاف ستھرے عادلانہ حکم کو ایسے گندے حکم میں تبدیل کر دیا جو نفسانی

خواہشات پر قائم ہے اور انہوں نے لوگوں کو نفاق، ذلت اور پستی میں دھکیل دیا، اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عصر حاضر تک ان کے بعد آنے والے حکمران بجز حضرت عمر بن عبد العزیز کے ان کی سنت پر عمل پیرا رہے اور ان کی بدعت کے ساتھ چمٹے رہے، چونکہ اس برے طریقے کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رواج دیا، لہٰذا اس کا اور اس پر قیامت تک عمل کرنے والوں کا گناہ ان کے سر لادا جاتا رہے گا۔[1] اگر معاویہ رضی اللہ عنہ یا اموی خلفاء نے خلافت کو شوریٰ سے بادشاہت میں تبدیل کر دیا تھا تو ان کے پوتے معاویہ بن یزید بن معاویہ بن ابو سفیان نے جو کہ تیسرے اموی خلیفہ تھے انہوں نے نئے سرے سے خلافت کو بادشاہت سے شوریٰ کاملہ میں تبدیل کر دیا۔[2] حقیقت یہ ہے کہ بیعت یزید کو بہت سارے لوگوں نے حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قبول کر لیا تھا، اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ستر لوگوں نے اس سے بیعت کی تھی جن میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔[3] عبد الرحمن بن ابو بکر کی وفات کے بعد صرف تین مخالفین ابن عمر رضی اللہ عنہما، ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور حسن بن علی رضی اللہ عنہما ہی باقی رہ گئے تھے۔ جب ابن عمر رضی اللہ عنہما نے لوگوں کو یزید پر مجتمع دیکھا تو انہوں نے بھی یزید سے بیعت کر لی، انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یزید کو بیعت کا پیغام بھیجتے ہوئے کہا: اگر یہ خیر ہے تو ہم اس پر راضی رہیں گے اور اگر یہ کوئی مصیبت ہے تو اس پر صبر کریں گے۔[4]

آخر کار معارضہ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور حسین بن علی رضی اللہ عنہما تک محدود ہو کر رہ گیا۔ بعض لوگوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ پر صحیح ہاتھوں میں خلافت دینے میں ناکامی کا الزام لگاتے ہوئے ان سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر مجھے یزید سے محبت نہ ہوتی تو میں اپنی رشد و ہدایت صاف دیکھ لیتا۔[5] مگر اس کی سند واقدی کے طریق سے ہے اور واقدی متروک ہے،[6] اس نے ان کی طرف یہ بات بھی منسوب کی ہے کہ انہوں نے یزید سے کہا: اللہ تعالیٰ نے میرے جی میں تجھے خلیفہ بنانے سے بڑی کوئی بات نہیں ڈالی۔[7] یہ سند ہیثم بن عدی کے طریق سے ہے اور وہ کذاب ہے۔[8] محمد رشید رضا نے اس روایت پر اعتماد کرتے ہوئے معاویہ رضی اللہ عنہ پر بڑا سنگ دِلانہ حملہ کیا ہے۔[9] اکثر باحثین نے صدر اسلام کی تاریخ سے متعلق ضعیف اور موضوع روایات پر اعتماد کرتے ہوئے ایسے تصورات اور افکار و احکام کی بنیاد رکھی ہے جو نئے سرے سے نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اسلامی نظام حکومت کا اعلیٰ ترین نمونہ جو کہ خلافت سے عبارت ہے اور جس میں روح اسلام پورے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے اس میں جس قدر بھی تبدیلی آئی[10] مگر حکومت پر اسلامی رنگ ہمیشہ غالب رہا۔ نماز اپنے مقررہ اوقات میں ادا کی جاتی رہی، صاحب نصاب لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی رہی، فرض روزوں کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کی جاتی اور حدود شرعیہ کے نفاذ میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہ کیا جاتا، اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ بھی سرانجام دیا جاتا رہا۔ المختصر جملہ تعلیمات اسلامیہ کی تطبیق کی جاتی رہی۔[1]

ا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی یزید کو وصیت:

۶۰ ہجری میں جب معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس وقت یزید ان کے پاس موجود نہیں تھا۔ انہوں نے پولیس کے سربراہ ضحاک بن قیس فہری اور مسلم بن عقبہ مری کو بلایا اور انہیں وصیت کرتے ہوئے فرمایا: میری یہ وصیت یزید کو پہنچا دینا کہ اہل حجاز کا خیال رکھنا، اس لیے کہ وہ تیری قوم کے لوگ ہیں، ان میں سے جو کوئی تیرے پاس آئے اس کا اکرام کرنا اور جو تیرے پاس حاضر نہ ہو سکیں ان کا خیال رکھنا، اہل عراق پر نظر رکھنا، اگر وہ تجھ سے ہر روز اپنے عامل کی تبدیلی کا مطالبہ کریں تو ایسا ضرور کرنا، اس لیے کہ ایک عامل کو معزول کر دینا مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے

کہ ایک لاکھ تلواریں تیرے خلاف سونت لی جائیں اور اہل شام کے حال پر نظر رکھنا اور انہیں اپنا ہم راز اور دم ساز بنائے رکھنا، اگر دشمن کی طرف سے تجھے کوئی مہم درپیش ہو تو ان کی مدد حاصل کرنا، پھر جب تو فتح مند ہو جائے تو انہیں ان کے وطن واپس بھجوا دینا۔ اس لیے کہ اگر وہ دوسرے شہروں میں آباد ہوں گے تو انہی کا کردار و اخلاق اپنالیں گے۔ قریش میں سے تین لوگوں کے علاوہ مجھے کسی کا خوف نہیں ہے: حسین بن علی رضی اللہ عنہما، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو تو دین داری نے مار ڈالا ہے وہ تجھ سے کسی بات کے طلب گار نہیں ہوں گے، رہے حسین بن علی رضی اللہ عنہما تو وہ ہلکے پھلکے آدمی ہیں اور مجھے امید ہے جن لوگوں نے ان کے والد محترم کو قتل کیا اور ان کے بھائی کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا اللہ ان لوگوں کے ذریعے سے تجھے حسین کی فکر سے نجات دلائے گا۔ مگر یہ بات یاد رہے کہ انہیں قریب کی قرابت داری حاصل ہے اور ان کا بہت بڑا حق ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اہل عراق انہیں خروج پر آمادہ کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے، اگر تو ان پر قابو پالے تو درگزر سے کام لینا، اگر وہ تیرے پاس اس طرح آتے تو میں انہیں ضرور معاف کر دیتا، ہاں عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما چال چلنے والے (معاملات کو اُلٹ پلٹ دینے والے) اور ہوشیار ہیں، اگر وہ تیرے مقابلے میں آئیں تو ان کا مقابلہ کرنا ہاں اگر وہ صلح کے طالب ہوں تو اسے قبول کر لینا اور جہاں تک ممکن ہو اپنی قوم کو خون ریزی سے بچانا۔[2] معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی وصیت میں اپنی مملکت کے صرف تین صوبوں حجاز، عراق اور شام کا ذکر کیا ہے اور یہ اس لیے کہ دیگر صوبوں کے سیاسی حالات ان کے نزدیک کسی قابل ذکر پریشانی کا سبب نہیں بن سکتے تھے۔[3] ا: حجاز:... معاویہ رضی اللہ عنہ اس صوبہ کی نسبت سے اپنے بیٹے یزید کو فرماتے ہیں: اہل حجاز کا خیال رکھنا اس لیے کہ وہ تیری قوم کے لوگ ہیں ان میں سے جو تیرے پاس آئے اس کا اکرام کرنا اور جو تیرے پاس حاضر نہ ہو اس کا خیال کرنا۔[4] ان کے نزدیک حجاز کی یہ اہمیت ان کے خاندان اور قوم کا مسکن ہونے کے علاوہ سیاسی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت کی عکاسی ہوتی ہے، کیونکہ وہ چند ہی سال پہلے تک دولت اسلامیہ کا سیاسی مرکز (دار الخلافہ) تھا۔ جبکہ دینی اعتبار سے وہ ابھی تک مرکزیت کا حامل تھا اور یہ اس لیے کہ زیادہ تر اصحاب رسول رضی اللہ عنہم وہیں مقیم تھے اور اگر وہ اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ کریں اور انہیں موقع میسر آئے تو وہ بنو امیہ کو حکومت تفویض کر سکتے ہیں گویا کہ وہ ابھی تک بھی بیعت کا حقیقی مرکز تھا۔[1] اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اموی حکومت کے معارضین کی متعدد شخصیات یہیں رہائش پذیر تھیں، جیسا کہ حسین بن علی، عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم۔ جیسا کہ ہمیں اس وصیت کے آخر میں نظر آرہا ہے، اس صوبہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہل حجاز کے دل جیتنے کے لیے مختلف وسائل سے کام لینے کی ترغیب دلائی جن میں کھلے دل سے ان پر مال خرچ کرنا بھی شامل ہے۔[2]

ب: عراق:... معاویہ رضی اللہ عنہ کی نظروں میں خصوصی اہمیت کا حامل دوسرا صوبہ عراق ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر وہ اپنے ولی عہد کو اہل عراق کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنے کی وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اہل عراق پر خصوصی نظر رکھنا اگر وہ تجھ سے ہر روز اپنے عامل کی معزولی کا مطالبہ کریں تو ایسا کر گزرنا، اس لیے کہ ایک عامل کو معزول کرنا میرے نزدیک اس بات سے بہتر ہے کہ ایک ہزار تلواریں تیرے خلاف سونت لی جائیں۔[3] یہ بات قابل ذکر ہے کہ اہل عراق کا اپنے ولاۃ سے شکایات کا سلسلہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت سے جاری تھا۔

ج: شام:... معاویہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک سیاسی اہمیت کا حامل تیسرا صوبہ شام تھا۔ اس کے بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیت کا پس منظر یہ ہے کہ اہل شام نے انہیں ایوان اقتدار تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اور وہ ہمیشہ ہی سے ان کی سیاست کے حمایتی رہے تھے، ان کے اسی کردار کی وجہ سے معاویہ رضی اللہ عنہ یزید کو انہیں خصوصی اہمیت دینے، ان پر اعتماد کرنے اور بڑی بڑی مشکلات کے وقت ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے

کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جس کے آخر میں اسے تلقین کی گئی ہے کہ اہل شام کی مدد سے دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد انہیں شام واپس بھجوا دینا اس لیے کہ اگر وہ دوسرے علاقوں میں مقیم ہو جائیں گے تو اپنے اخلاق و عادات کو ترک کر کے ان کے رویوں کو اپنا لیں گے۔[4] اس نص کا آخری فقرہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی دُور اندیشی کی عکاسی کرتا ہے، اس میں وہ اپنے اس خوف کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر اہل شام دوسرے صوبوں کے لوگوں کے ساتھ اختلاط کریں گے تو اس سے ان کے اخلاق میں تبدیلی آجائے گی۔[5] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اموی حکومت کے مخالفین شامی لشکر پر اثر انداز ہو جائیں اور اس طرح اموی خلافت کے ہاتھ سے وہ پتا نکل جائے جسے معاویہ رضی اللہ عنہ استعمال کرتے اور اس کے فوائد سے بہرہ مند ہوتے رہتے تھے، لہٰذا وہ اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہیں کہ جب شامی لشکر اپنی مہم سر کر لے تو اسے فوراً شام واپس بھجوا دیا جائے۔[1] معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس وصیت میں ایک اہم بات ان کا وہ منصوبہ ہے جو انہوں نے آئندہ پیش آنے والے احداث و واقعات کا سامنا کرنے کے لیے تشکیل دیا اور جس کی تنفیذ یزید کے سپرد کی جب کہ وہ قریش کی ایک جماعت کو یزید کی بیعت پر آمادہ کرنے میں ناکام رہے تھے، روایات بتاتی ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اس مقصد کے لیے خود مدینہ منورہ گئے اور یزید کے لیے بیعت کو ردّ کرنے والی اہم شخصیات سے الگ الگ ملاقاتیں کر کے ان سے یزید کے لیے بیعت کا وعدہ لینے کے لیے کوشش کی۔[2] مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے،[3] اس وصیت سے عیاں ہوتا ہے کہ حجاز اور خاص طور پر مدینہ منورہ میں بنو امیہ کی حکومت کی بہت زیادہ مخالفت پائی جاتی تھی اور اسی وجہ سے معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے یزید کو اس کے ساتھ معاملہ کرتے وقت اس سے خبردار رہنے اور بوقت ضرورت بہت زیادہ محتاط رہنے کی وصیت کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ وہ جن لوگوں سے حقیقی خطرہ محسوس نہیں کرتے ان کے ساتھ نرمی اور ملائمت پر مبنی رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اس لیے کہ حکومت کو مستحکم رکھنے کے لیے حجاز کی بڑی اہمیت تھی۔[4] عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ رائے بڑی صائب تھی کہ انہیں دین داری نے ہلاک کر ڈالا ہے، لہٰذا وہ یزید کے لیے خطرہ نہیں بن سکتے۔ جب ولید بن عتبہ نے انہیں بیعت یزید کے لیے طلب کیا تو انہوں نے فرمایا: جب لوگ بیعت کر لیں گے تو میں بھی کر لوں گا، چنانچہ انہوں نے انہیں عبادت میں مصروف ہونے اور حکومتی معاملات میں دلچسپی نہ لینے کی وجہ سے ان کے حال پر چھوڑ دیا۔[5] اسی طرح معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہوا کہ اہل عراق حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو خروج پر آمادہ کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید اور حسین بن علی رضی اللہ عنہما میں ٹکراؤ کا یقین تھا، اسی لیے تو انہوں نے یزید سے مطالبہ کیا کہ اگر اسے نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر غلبہ حاصل ہو جائے تو وہ ان کے بارے میں درگزر سے کام لے۔ رہا وہ حقیقی خطرہ جو بہت زیادہ احتیاط اور سختی کا متقاضی ہو گا تو وہ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی طرف سے درپیش ہو گا جنہیں اموی حکومت کے زیادہ تر مخالفین کی بہت زیادہ حمایت حاصل ہو گی، نیز اس لیے بھی کہ وہ سیاست اور جنگ کے آدمی تھے۔ مختصراً یہ کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ وصیت مختلف امور سے نمٹنے کے لیے ان کی سیاسی بصیرت اور گہری فکر و نظر کی عکاسی کرتی ہے۔ ہمیں ان کی اس وصیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے احداث و واقعات کے بارے میں حزم و احتیاط پر مبنی معاملہ کرتے تھے جو شدت کے متقاضی ہوں۔ علاوہ ازیں کے لیے وہ اپنے طویل سیاسی تجربہ کو کام میں لایا کرتے، انہوں نے اپنی اس سیاسی روش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: جہاں میرا کوڑا میرے لیے کافی رہے میں وہاں تلوار کا استعمال نہیں کرتا اور جہاں میری زبان کافی رہے وہاں میں کوڑا بھی استعمال نہیں کرتا، اگر میرے اور لوگوں کے درمیان ایک دھاگے کے برابر تعلق باقی رہ جائے تو وہ بھی کبھی ٹوٹ نہ سکے گا جب ان سے اس کی وضاحت چاہی گئی تو انہوں نے فرمایا: جب لوگ اسے کھینچیں گے تو میں اسے ڈھیلا کر دوں گا اور جب وہ اسے ڈھیلا کریں گے تو میں اسے کھینچ لوں گا۔[1] وہ یزید کو اس قسم کی سیاست اپنانے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: موقعہ میسر آنے تک حلم و حوصلہ اور قوت برداشت سے کام لینا

اور پھر جب موقع مل جائے تو درگزر سے کام لینا اس لیے کہ درگزر سے کام لینے سے تیری مشکلات دُور ہو جائیں گی اور خطرات ٹل جائیں گے۔[2] معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی اس وصیت میں اپنے بیٹے یزید کو انتہائی کم اور جامع کلمات میں سیاست و انتظامیہ میں اپنے منہج و اسلوب اور تجربہ کا ملخص بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ جس کا اس جلیل القدر صحابی کو گہرا تجربہ حاصل تھا، یعنی سیاست میں پختہ کاری اور انتظامی مہارت۔[3]

۲۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا آخری خطبہ، ان کی بیماری کی شدت اور وفات:

معاویہ نے اپنے آخری خطبہ کے دوران فرمایا: لوگو! میرا تعلق اس کھیتی کے ساتھ ہے جسے کاٹ دیا گیا، میں نے تم لوگوں پر حکومت کی، میرے بعد جو بھی حکمران آئے گا وہ مجھ سے برا ہی ہو گا، جیسا کہ مجھ سے پہلے کے تمہارے حکمران مجھ سے بہتر تھے، یزید! جب میری موت واقع ہو جائے تو مجھے غسل دینے کے لیے کسی عقل مند آدمی کو مقرر کرنا، اس لیے کہ عقل مند شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ مجھے اچھی طرح غسل دے اور اس دوران بلند آواز سے تکبیر پڑھتا رہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں میں سے ایک کپڑے میں کفن دیا جائے جو میں نے سنبھال کر رکھا ہے اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹے ہوئے بال اور ناخن پڑے ہیں وہ انہیں میرے منہ، ناک، آنکھوں اور کانوں میں رکھ دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ کپڑا میرے جسم کے ساتھ رکھنا۔ یزید! والدین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی وصیت کو یاد رکھنا، پھر جب تم مجھے میرے کفن میں لپیٹ کر مجھے میری قبر میں رکھ دو تو پھر معاویہ اور ارحم الراحمین کو چھوڑ دو۔[4] جب معاویہ رضی اللہ عنہ کا آخری وقت آیا تو وہ یہ اشعار پڑھنے لگے:

لعمری لقد عمرت فی الدہر برہۃ

و دانت لی الدنیا بوقع البواتر

و اعطیت حمر المال و الحکم و النہی

و سلم قماقیم الملوک الجبابر

فاضحی الذی قد کان مما یسرنی

کحلم مضی فی المزمنات الغوابر

فیا لیتنی لم اعن فی الملک ساعۃ

و لم اُعنَ فی لذات عیش نواضر

و کنت کذی طمرین عاش ببلغة

من العیش حتی زار ضیق المقابر[1]

"میری زندگی کی قسم! میں نے زمانے میں بہت کم زندگی پائی ہے اور دنیا قاطع تلواروں کے پڑنے سے میرے تابع ہو گئی ہے اور مجھے سرخ مال، حکومت اور دانائی عطا کی گئی ہے اور مجھے سب ظالم و جابر حکمرانوں نے سلام کیا ہے اور جس بات سے میں خوش ہوا کرتا تھا وہ گزرے ہوئے گزشتہ حلم کی طرح ہو گئی ہے۔ کاش میں بادشاہت سے ایک ساعت بھی سروکار نہ رکھتا اور نہ تر و تازہ زندگی کی لذات میں وسعت اختیار کرتا۔ اب میری حالت دو چادروں والے شخص کی سی ہے جو صرف گزارے کی زندگی پر جیا ہو اور اب قبر کی تنگی سے دوچار ہو گیا ہو۔" معاویہ رضی اللہ عنہ نے وصیت کی کہ ان کا آدھا مال بیت المال کو لوٹا دیا جائے گویا کہ انہوں نے اسے پاک کرنے کا اِرادہ کیا، اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو قسم دی تھی۔ مورخین بیان کرتے ہیں کہ آپ کو آخری عمر میں شدید سردی لگتی تھی، جب آپ لباس پہنتے یا کسی بھاری چیز سے اپنے آپ کو ڈھانپتے تو وہ آپ کو پریشان کرتی، اس پر انہوں نے اپنے لیے پرندوں کے پوٹوں سے کپڑا بنایا مگر بعد ازاں وہ بھی بوجھل ہو گیا تو فرمانے لگے: اے گھر تیرے لیے ہلاکت، میرا یہ حال اور میرا یہ انجام ہے، دنیا اور اس سے محبت کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہو۔[2] پھر جب ان کی حالت بگڑ گئی اور لوگ آپ کی موت کی باتیں کرنے لگے تو آپ نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا: میری آنکھوں کو اثمد سرمے سے بھر دو، اور میرے سر میں تیل لگاؤ، انہوں نے ایسا ہی کیا اور آپ کے چہرے کو تیل سے چمکا دیا، پھر آپ کے لیے مجلس آراستہ کی گئی تو فرمایا: مجھے سہارا دو، پھر فرمایا: لوگوں کو اطلاع کرو وہ کھڑے ہو کر میرے لیے سلامتی کی دُعا کریں اور کسی شخص کو بھی روکا نہ جائے، ایک ایک آدمی آتا اور کھڑے کھڑے سلام کرتا تو وہ آپ کو سرمہ اور تیل لگائے دیکھتا اور پھر لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے کہتا: امیر المومنین تو صحت مند ہیں۔[3] پھر جب وہ لوگ ادھر سے چلے گئے[4] تو آپ نے ابو ذویب ہندی شاعر کا یہ شعر پڑھا:

و تجلدی للشامتین اریهم

انی لریب الدہر لا اتضعضع

و اذا المنیة انشبت اظفارہا

الفیت کل تمیمة لا تنفع

"اور خوشیاں منانے والوں کو مضبوطی دکھانا اس لیے تھا کہ میں انہیں دکھا سکوں کہ میں گردش زمانہ کے سامنے عاجزی اختیار کرنے والا نہیں ہوں۔ اور جب موت اپنے پنجے گاڑ دیتی ہے تو ہر تعویذ دیکھے گا کہ اس وقت کوئی تعویذ فائدہ نہیں دیتا۔" بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو کھجلی ہو گئی تھی، اور آپ نے اسی روز وفات پائی۔[1] جب آپ کی موت کا وقت قریب آیا تو فرمانے لگے: کاش میں ذی طویٰ میں قریش کا ایک عام آدمی ہوتا اور میں نے اس امارت و حکومت سے کچھ نہ لیا ہوتا۔[2] آپ نے مثال کے طور پر شاعر کا یہ شعر پڑھا:

ان تناقش یکن نقاشک یا رب

عذابا لاطوق لی بالعذاب

او تجاوز تجاوز العفو فاصفح

عن مسی ء ذنوبہ کالتراب

"اے میرے رب! اگر تو کرید کرے گا تو تیری کرید میرے لیے عذاب بن جائے گی اور مجھ میں عذاب برداشت کرنے کی طاقت نہیں یا پھر تو عفو و کرم کے ساتھ درگزر فرمادے اور گناہ گار کو معاف فرمادے جس کے گناہ مٹی کی طرح ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ جب آپ کی موت کا وقت قریب آیا تو آپ کے اہل خانہ آپ کو الٹنے پلٹنے لگے۔ اس پر آپ نے فرمایا: تم کس شیخ کے ساتھ ایسا کرتے ہو اگر اللہ اسے کل عذاب سے نجات دے دے۔[3] حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب آپ کا آخری وقت آیا تو لوگ آپ کے پاس آئے جنہیں دیکھ کر آپ رونے لگ گئے جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمانے لگے: میں موت کے ڈر سے نہیں روتا اور نہ ہی دنیا سے جانے اور سب کچھ یہاں چھوڑ جانے کی وجہ سے روتا ہوں، اصل بات یہ ہے کہ وہاں دو مٹھیاں ہیں، ان میں سے ایک جنت میں اور دوسری جہنم میں، میں نہیں جانتا کہ میں کون سی مٹھی میں ہوں گا۔[4] مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ آپ پر بے ہوشی طاری ہوگئی، پھر جب ہوش آیا تو اپنے اہل خانہ سے فرمانے لگے: اللہ سے ڈرو، یقیناجو اللہ سے ڈرے گا اللہ اسے بچالے گا اور جو اس سے نہیں ڈرے گا وہ اسے نہیں بچائے گا۔[1] جب ان کا آخری وقت آیا تو کبھی ایک رخسار زمین پر رکھتے اور کبھی دوسرا۔ اس دوران روتے جاتے اور فرماتے: میرے اللہ! تونے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء: ۴۸)

"یقینا اللہ یہ گناہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ وہ جسے چاہے معاف فرمادے۔" یا اللہ! مجھے ان لوگوں سے کر دے جنہیں اگر تو چاہے تو معاف کر دے۔[2] اس دن انہوں نے یہ دعا بھی فرمائی: "اے اللہ! لغزش و گناہ کو معاف فرما اور اپنے حلم سے اس کے جہل سے درگزر فرما جو تیرے علاوہ کسی سے امید نہیں رکھتا بلاشبہ تو وسیع مغفرت والا ہے اور گناہ گار کے لیے اپنے گناہ سے تیری طرف بھاگنے کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں۔" اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔[3] دوسری روایت میں آتا ہے: یا اللہ! میں تجھ سے ملاقات کرنے کو پسند کرتا ہوں تو بھی مجھ سے ملاقات کو پسند فرما۔[4] اللہ معاویہ رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔

[1] تاریخ طبری: ۶/۲۴۵. [2] البدایۃ و النہایۃ: ۱۱/۴۵۷. [3] ایضا: ۱۱/۴۵۷.

۳۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات اور ان کی نماز جنازہ پڑھانے والا:

مؤرخ طبری فرماتے ہیں: اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے رجب ۶۰ ہجری میں وفات پائی۔[5] البتہ ان کی وفات کے وقت میں اختلاف ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیح قول کی رُو سے انہوں نے رجب ۶۰ ہجری میں وفات پائی[6] اور ضحاک بن قیس فہری نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، ان کی وفات کے وقت یزید ان کے پاس موجود نہیں تھا۔[7] ضحاک بن قیس منبر پر بیٹھ گئے اس وقت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کفن ان کے ہاتھوں میں تھا، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنے کے بعد فرمایا: یقیناً معاویہ رضی اللہ عنہ عربوں کی فصیل، مدد اور نصیبہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے فتنے کا خاتمہ فرمایا۔ انہیں بندوں کا حکمران بنایا اور ان کی وجہ سے ملکوں کو فتح کرایا، آگاہ رہو کہ اب وہ فوت ہو چکے ہیں اور یہ ان کا کفن ہے اور ہم انہیں اس میں لپیٹنے والے ہیں اور انہیں ان کی قبر میں اتارنے والے ہیں اور ان کے اور ان کے عمل کے درمیان سے الگ ہونے والے ہیں، پھر قیامت تک برزخ کا عالم ہو گا، جو شخص انہیں دیکھنا چاہتا ہے وہ نماز ظہر کے وقت حاضر ہو جائے، پھر اس نے یزید کے پاس ایلچی بھیجا۔ مؤرخین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یزید اپنے باپ کی وفات کے وقت موجود تھا یا نہیں؟ اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یزید اپنے باپ کی وفات کے بعد واپس آیا۔[8] جب یزید کو اپنے باپ کی وفات کی خبر ملی تو اس نے یہ اشعار پڑھے:

جاء البرید بقرطاس یخب بہ

فاوجس القلب من قرطاسہ فزعا

قلنا لک الویل ماذا فی کتابکم؟

قالوا الخلیفۃ امسی مثبتا وجعا

فمادت الارض او کادت تمید بنا

کان اغبر من ارکانہا انقطعا

من لا تزال نفسہ توفی علی شرف

توشک مقالید تلک النفس ان تقعا

لما انتہینا وباب الدار منصفق

و صوت رملۃ[1] ریع القلب فانصدعا[2]

''ایلچی جلدی سے ایک کاغذ لایا ہے اور دل نے اس کے کاغذ سے گھبراہٹ محسوس کی ہے۔ ہم نے کہا: تو ہلاک ہو جائے تیرے کاغذ میں کیا لکھا ہے؟ اس نے کہا: خلیفہ بڑی تکلیف کی حالت میں ہے۔ یہ سن کر زمین گھوم گئی یا قریب تھا کہ وہ ہمارے ساتھ گھوم جاتی گویا کہ اس کے خاکستری ستون اکھڑ گئے ہیں۔ جس کا نفس ہمیشہ عزو شرف حاصل کرتا رہتا تھا قریب ہے کہ اب اس نفس کی چابیاں اس کے ہاتھ سے گر جائیں۔ جب ہم پہنچے تو گھر کا دروازہ رملہ کی آواز کی وجہ سے ہل رہا تھا جس سے دل ڈر کر پھٹ گیا۔''

۴۔ وفات کے وقت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عمر:

راجح قول یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اٹھہتر (۷۸) سال کی عمر میں وفات پائی۔[3] اس کی دلیل ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ قول ہے: مشہور قول کی رُو سے معاویہ رضی اللہ عنہ بعثت نبوی سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئے[4] اور جیسا کہ معروف ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہجرت سے تیرہ سال پہلے کا واقعہ ہے، اس طرح معاویہ رضی اللہ عنہ کی پیدائش ہجرت سے آٹھ سال قبل بنتی ہے، پھر جب ان کی وفات ۶۰ ہجری میں ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وفات کے وقت ان کی عمر اٹھہتر سال تھی۔[5]

۵۔ مدتِ خلافت:

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہونے کے بعد ماہ ربیع الاوّل ۴۱ ہجری میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت مکمل ہوئی اور ۶۰ ہجری میں بائیس رجب کو جمعرات کے دن دمشق میں فوت ہوئے۔ اس طرح ان کی خلافت کی کل مدت انیس سال تین ماہ اور سترہ دن بنتی ہے۔[1]

۶۔ معاویہ کی وفات پر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے تاثرات:

عامر بن مسعود جہنی کہتا ہے: ہم مسجد میں تھے کہ اس دوران ہمیں معاویہ رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر ملی تو ہم ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گئے تو وہ کھانا کھانے کے لیے دستر خوان پر بیٹھے تھے، ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے مگر ابھی تک کھانا نہیں لگایا گیا تھا۔ ہم نے کہا: ابن عباس! کیا آپ کو یہ خبر نہیں ملی؟ انہوں نے کہا: کون سی خبر؟ ہم نے کہا: معاویہ رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے غلام کو دستر خوان اٹھانے کا حکم دیا اور پھر کچھ دیر تک سر جھکا کر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ پھر فرمانے لگے: ایک پہاڑ نے حرکت کی اور پھر سارے کا سارا سمندر میں جا گرا۔[2]

قاضی ابو یعلی نے ان کی موت کی خبر کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد لکھا: یا اللہ! معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے تیری رحمت بڑی وسیع ہے اور تو ان سے بہتر انداز میں درگزر فرما سکتا ہے۔[3]

[1] تاریخ طبری: ۶/۲۴۳. [2] تنزیہ خال المؤمنین معاویہ بن ابی سفیان، ص: ۱۱۲. [3] ایضاً، ص: ۱۱۳].

۷۔ان کی انگوٹھی کا نقش:

معاویہ رضی اللہ عنہ کی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی: " لِكُلِّ عَمَلٍ ثَوَابٌ " ایک قول کے مطابق یہ عبارت لکھی ہوئی تھی: "لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ"[4]

۸۔ آثار رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تبرک:

عبد الاعلی بن میمون اپنے باپ سے ان کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک قمیص پہنائی تھی جو میں نے سنبھال کر رکھی ہے، آپ نے ایک دن اپنے ناخن ترشوائے تو میں نے ان کے تراشوں کو ایک شیشی میں محفوظ کر لیا۔ جب میں مر جاؤں تو مجھے وہ قمیص پہنا دینا، اور تراشوں کا سرمہ بنا کر میری آنکھوں اور منہ میں چھڑک دینا۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے مجھ پر رحم فرمائے۔[5] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسی اور آپ کی ذات سے منفصل آثار مبارکہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تبرک حاصل کرنا، اس کا شمار تبرک کی مشروع قسموں میں ہوتا ہے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور اس کے بعد بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول رہا۔[6] علاوہ ازیں سلف صالحین علیہما السلام بھی اس پر عمل پیرا رہے، اس کے چند دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

ا: جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے، اس وقت میں بیمار تھا اور بے ہوشی کی حالت میں تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور اس کا پانی مجھ پر انڈیل دیا جس سے مجھے ہوش آ گیا۔[1]

ب: عثمان بن عبد اللہ بن وہب کہتے ہیں: میرے اہل خانہ نے پانی کا ایک برتن دے کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال تھے، جب کسی انسان کو نظر لگ جاتی یا اسے اور کوئی تکلیف ہو جاتی تو وہ ان کے پاس کوئی برتن بھیجتا۔[2] اس کی تشریح میں ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی تکلیف ہوتی تو وہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس کوئی برتن بھیجتا اور وہ اس برتن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ بال ڈبو کر اسے واپس کر دیتیں۔ وہ اس پانی کو پی لیتا اور صحت یاب ہو جاتا۔[3] ج: اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جبہ کے بارے میں فرمایا: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت یہ جبہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا، پھر جب عائشہ رضی اللہ عنہا فوت ہو گئیں تو میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے زیب تن فرمایا کرتے تھے اور ہم اس سے شفا حاصل کرنے کے لیے اسے مریضوں کے لیے دھوتے ہیں۔[4] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار سے تبرک کے مسئلہ پر نیک لوگوں کے آثار سے تبرک کو متفرع کیا گیا ہے، عروہ بن مسعود ثقفی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں قریش مکہ کو بتایا تھا کہ واللہ! میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے رفقاء اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کرتے ہیں۔ واللہ! وہ تھوکتے بھی تھے تو وہ کسی نہ کسی آدمی کے ہاتھ پر پڑتا تھا اور وہ اسے اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا تھا۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس پانی کے لیے لوگ لڑ پڑیں گے۔[5] اس حدیث کی

تعلیق میں شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس جیسی اور بھی کئی احادیث ہیں۔ مزید فرماتے ہیں: اس قسم کا تبرک اس آدمی کے حق میں مشروع ہے جس کی ولایت اور اتباع سنت ثابت ہو۔ مگر اس جگہ ایک مشکل پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس قسم کی کوئی چیز مروی نہیں ہے، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے افضل کسی کو نہیں چھوڑا تھا۔ صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے مگر انہوں نے اس قسم کا کبھی کوئی کام نہ کیا اور نہ ہی عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم سے ایسی کوئی بات ثابت ہے۔ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن سے افضل امت میں کوئی ایک شخص بھی نہیں ہے ان سے بھی کسی ایک صحابیہ کے بارے میں صحیح سند کے ساتھ یہ ثابت نہیں ہے کہ اس نے اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے آثار وغیرہ سے تبرک حاصل کیا ہو، یہ سب لوگ اقوال و افعال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع تک محدود رہے اور آپ کے نقش قدم پر چلنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس قسم کی چیزوں کے ترک پر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجماع ہے۔[6]

آل اور اصحاب رضی اللہ عنہم میں سسرالی رشتہ

محترم قارئین! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر کا ٹکڑا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی، دل کا سکون، اس کی شادی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس کے ساتھ کریں گے؟ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اس کی شادی ایک فاجر و فاسق اور مجرم کے ساتھ کرو، اس کی ماں یا بھائی کے قاتل کے ساتھ نکاح کرو؟ تمہارے نزدیک سسرالی رشتے کا کیا مطلب ہے؟ مصاہرت کے لغوی معنی: ''مصاہرۃ'' صاہر کا مصدر ہے، کہا جاتا ہے: ''صاہرۃ القوم'' یعنی میں نے ان میں شادی کی۔ علامہ ازہری نے لکھا ہے: مصاہرت میں محارم مردوں اور عورتوں مثلاً ماں، باپ اور بھائی وغیرہ کے رشتے دار شامل ہیں، اور جو شوہر کی طرف سے اس کے قریبی محرم رشتے دار ہوں وہ بھی عورت کے سسرالی رشتے دار ہیں۔ مرد کے سسرال اس کی بیوی کے رشتے دار ہیں اور عورت کے سسرالی اس کے شوہر کے رشتے دار ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ عربی زبان میں مصاہرت کہتے ہیں عورت کے قریبی رشتے داروں کو اور کبھی اس کا استعمال مرد کے قریبی رشتے داروں کے لیے بھی ہوتا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سسرالی رشتے کو اپنی نشانیوں میں سے شمار کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا﴾(الفرقان: ۵۴)

''وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے نسب والا اور سسرالی رشتوں والا بنایا، بلاشبہ آپ کا پروردگار (ہر چیز پر) قادر ہے۔''

اس آیت کریمہ پر غور کرو اور سوچو کہ اللہ انسان کو نسب اور سسرالی رشتے کے ذریعے ایک دوسرے سے کیسے مربوط کرتا ہے، کیونکہ مصاہرت شرعی رابطہ ہے، جس کو اللہ نے نسب کی طرح ہی قرار دیا ہے اور دونوں کا تذکرہ ایک ساتھ کیا ہے، نسب باپ کے رشتے داروں کو کہتے ہیں، بعض علمائے کرام کا خیال ہے کہ نسب سے مراد مطلق رشتے داری ہے۔

یہ بات یاد رکھئے کہ نسب اور سسرالی رشتے کو اللہ نے ایک ساتھ بیان کیا ہے اور اس کی عظیم دلالتیں ہیں، پس تم اس سے غافل نہ ہو جاؤ اور اس کو بھلا نہ دو۔

سسرالی رشتہ تاریخی حیثیت سے:

عربوں کے نزدیک سسرالی رشتے کا خاص مقام و مرتبہ ہے، عرب حضرات نسب پر فخر کرتے تھے، اس میں اپنی بیٹیوں کے شوہروں یعنی دامادوں اور ان کے مقام و مرتبے پر بھی فخر کرتے تھے، عرب اس شخص کے ساتھ اپنی عورتوں کی شادی نہیں کرتے ہیں، جن کو وہ اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں، یہ عربوں کے بارے میں مشہور ہیں، بلکہ عجم کے بہت سے خاندانوں میں بھی یہ رواج پایا جاتا ہے، مغرب میں نسلی امتیاز سب سے بڑا معاشرتی مسئلہ ہو گیا ہے۔ عرب اپنی عورتوں کے سلسلے میں بڑے غیرت مند ہیں، جس کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں بعض عرب عار کے خوف سے اپنی چھوٹی بچیوں کو زندہ در گور کرتے تھے، یہ اشارہ ہی کافی ہے، اس کے اثرات آج تک باقی ہیں، جو پڑھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

اسلام میں سسرالی رشتے کی اہمیت:

اسلام نے آکر اوصفِ حمیدہ اور قابل ستائش امور کو مستحکم کیا اور بری چیزوں سے منع فرمایا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ اعتبار تقویٰ کا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۳)

"تم میں اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے بڑی متقی ہو۔"

یہ شرعی اعتبار سے ہے۔

فقہائے کرام رحمہم اللہ نے دین، نسب، پیشے اور ان سے متعلقات میں کفو کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور تفصیلی احکام بیان کیے ہیں، عقد صحیح ہونے کے لیے کفو ہونا شرط ہے یا نہیں؟ کیا یہ بیوی کا حق ہے یا عورت کے اولیاء اس میں شریک ہیں؟ نکاح کے باب میں اس کے علاوہ بھی دوسری بحثیں کی جاتی ہیں۔ عزت کی حفاظت اور عورتوں پر غیرت کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح تعلیمات ملتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہونے والے کو شہادت کا درجہ دیا ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کی خاطر جس کی عزت کو ایک یہودی نے پامال کیا تھا جنگ کی قیادت کی ہے، یہ قصہ یہودی قبیلے بنو قینقاع کی بد عہدی اور معاہدہ توڑنے کا ہے، جو مشہور و معروف ہے۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک یہودی نے اپنے پاس سونا خریدنے آئی ہوئی ایک دوشیزہ سے چہرہ کھولنے کا مطالبہ کیا تو اُس مسلم عورت نے انکار کیا، اس یہودی نے اس عورت کا کپڑا کھینچا، وہ بیٹھی ہوئی تھی، اس کو یہودی کی اس حرکت کا احساس نہیں ہوا، جب وہ کھڑی ہو گئی تو پردہ کھل گیا، اس نے مدد طلب کرنے کے

لیے چلّانا شروع کیا، وہیں قریب میں ایک مسلم نوجوان تھا، اس نے آکر یہودی کو مار ڈالا، یہودی ہر طرف سے جمع ہو گئے اور اس مسلم نوجوان کو قتل کر دیا، اس کے علاوہ دوسری وجوہات کی وجہ سے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ ختم ہو گیا۔

محترم قارئین! بعض شرعی احکام پر غور کرو، مثلاً عقد نکاح میں ولی اور گواہوں کا پایا جانا شرط ہے، بلکہ زنا کی تہمت لگانے کی سزا، زنا کے حدود وغیرہ احکام پر غور کرو، جو عزت کی حفاظت کے لیے نافذ کیے گئے ہیں۔

ان احکام، ان میں موجود حکمتوں اور معاشرے پر ان احکام کے اثرات پر غور کرنے سے آپ کو اس موضوع کی اہمیت کا علم ہو جائے گا اور اس کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

سسرالی رشتے کی وجہ سے بہت سے احکام مرتب ہوتے ہیں، عقد نکاح کی مشروعیت کے سلسلے میں غور کریں کہ یہ ایک پختہ معاہدہ ہے، آدمی سب سے پہلے عورت کا ہاتھ مانگتا ہے، جس کے بہت سے احکام ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا رشتہ قبول کیا جائے یا ٹھکرا دیا جائے، رشتہ بھیجنے والا اپنے گھر والوں اور ساتھیوں کے تعاون سے اس رشتے کو قبول کرانے اور منوانے کی کوشش کرتا ہے، عورت کے گھر والے اور رشتے دار لڑکے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، ان کو رشتہ قبول کرنے یا ٹھکرانے کا حق ہے، یہاں تک کہ اگر ہدایا دیئے جائیں یا نکاح سے پہلے ہی مہر ادا کر دیا جائے تو بھی نکاح ہونے سے پہلے پہلے رشتہ ٹھکرانے کا حق رہتا ہے۔

عقد نکاح میں گواہوں کی موجودگی ضروری ہے، نکاح کی تشہیر کرنا ضروری ہے، یہ شرعی حکم ہے، کیوں؟ کیونکہ نکاح کے بعد بہت سے احکام مرتب ہوتے ہیں، اجنبی رشتے دار بن جاتے ہیں اور دو خاندانوں کے درمیان سسرالی رشتہ قائم ہو جاتا ہے، نکاح کی وجہ سے شوہر پر بہت سی عورتیں ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہیں یا بیوی کے ساتھ نکاح باقی رہنے تک بہت سی عورتیں حرام رہتی ہیں، اس مختصر سے کتابچے میں اس موضوع کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے، یہاں صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ اس موضوع کی اہمیت یاد دلائی جائے، تاکہ اصل موضوع میں اس کا فائدہ حاصل ہو، پس مندرجہ ذیل معلومات پر غور کرو۔ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی بہن کی شادی ان کے والد سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کی، کیا ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی کی شادی اُن سے خوف زدہ ہو کر ان کے ساتھ کی؟ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کی بہادری کہاں چلی گئی؟ اپنی بیٹی سے ان کی محبت کہاں چلی گئی؟ کیا وہ اپنی بیٹی کی شادی ایک ظالم سے کر رہے ہیں؟ اللہ کے دین کی خاطر آپ کی غیرت کہاں چلی گئی؟ بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، اتنے سوالات اٹھتے ہیں کہ جن کی کوئی انتہا نہیں، یا آپ یہ بات کہیں گے کہ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی کی شادی حضرت عمر سے اس لیے کی کہ آپ کو ان پر اطمینان تھا اور آپ خود ان سے شادی کروانا چاہتے تھے، جی ہاں، سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرعی طریقے پر صحیح شادی کی، جس میں کوئی شک اور شائبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ (اگلے صفحات میں ؟؟ کی تاکید کے لیے علماء کے اقوال بیان کیے جائیں گے، جن سے طعن و تشنیع کرنے والوں کی تردید ہو گی) اس شادی سے دو خاندانوں کے درمیان مضبوط تعلقات اور محبت کا پتہ چلتا ہے، یہ محبت اور تعلق کیسے نہیں ہو گا؟ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیوی سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کی دختر تھی، سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کرنے سے پہلے ہی دونوں خاندانوں کے درمیان سسرالی رشتہ قائم

تھا۔ دوسری مثال: امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ قول ہی کافی ہے: ''ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے دو مرتبہ جنا ہے۔'' کیا آپ جانتے ہیں کہ جعفر کی ماں کون ہیں؟ یہ فروہ بنت قاسم بن محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔[1]

عقل مندو! حضرت جعفر نے ابو بکر کیوں کہا؟ محمد بن ابو بکر کیوں نہیں کہا؟؟ جی ہاں! انہوں نے ابو بکر کے نام کی صراحت کی ہے، کیونکہ بعض لوگ ان کے فضل کا انکار کرتے ہیں، البتہ آپ کے فرزند پر سبھی کا اتفاق ہے، اللہ کی قسم! انسان کس پر فخر کرتا ہے؟ سوچنے کی بات ہے۔

محترم بھائیو! مہاجرین اور انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کا نسب ایک دوسرے سے مربوط ہے، اس حقیقت سے ہر وہ شخص واقف ہے جس کو مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کے نسب کے بارے میں معلوم ہے، یہاں تک کہ ان کے آزادہ کردہ غلام بھی نسب میں شامل ہیں، جی ہاں! آزاد کردہ غلاموں نے قریش کے ساوات اور شرفاء سے شادی کی، یہ سیّدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں، جن کو یہ شرف حاصل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں صرف ان ہی کا نام قرآن کریم میں سورہ احزاب میں آیا ہے، ان کی بیوی کون ہیں، وہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ہیں، جن سے بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کی۔

یہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شادی خاندانِ قریش کی ایک لڑکی فاطمہ بنت قیس کے ساتھ کی۔[2] یہ آزاد کردہ غلام سالم ہیں، ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کی شادی اپنی بھتیجی ہند بنت ولید بن عتبہ کے ساتھ کی، جن کے والد قریش کے سرداروں میں سے تھے۔[3]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آپس میں سسرالی رشتے داری کے بارے میں گفتگو کی جائے تو بہت طویل ہو جائے گی۔ اہل بیت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے درمیان شادیوں کی چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ سیّدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیّدہ فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر ام کلثوم کے ساتھ شادی کی۔

جعفر صادق کی ماں کا تذکرہ ہو چکا ہے، آپ کی دادیاں کون ہیں؟ دونوں سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پوتیاں ہیں۔

محترم بھائیو! شیطانی وسوسوں سے دور رہو، اور سنجیدگی کے ساتھ غور کرو اور بار بار سوچو، کیونکہ تم مسلمان ہو اور عقل کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ اس سے تم ناواقف نہیں ہو، غور و خوض کرنے کی ترغیب دینے والی آیتیں بہت سی ہیں، جن کو یہاں تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہم پر ضروری ہے کہ ہم اپنی عقلوں کو کام میں لائیں، تقلید چھوڑ دیں اور اس بات سے چوکنا رہیں کہ کھلواڑ کرنے والے ہماری عقلوں سے کھلواڑ نہ کریں، ہم انسان اور جنات شیاطین سے سمیع و علیم اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور پناہ مانگتے ہیں۔ محب محترم! کیا آپ اس بات پر راضی ہو جائیں گے کہ آپ کے والد اور دادا کو گالی دی جائے اور یہ کہا جائے کہ آپ کی عورتوں کی سردار کی شادی طاقت کے زور پر کی گئی، باوجود یہ کہ آپ کا پورا کا پورا خاندان خود دار ہے؟

کیا تم اس پر راضی ہو جاؤ گے کہ یہ کہا جائے کہ اس شرم گاہ کو غصب کیا گیا ہے؟؟ بے انتہا سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو جائے گی، کون سی عقل اس بکواس پر راضی ہو جائے گی اور کون سا دل اس روایت کو قبول کرے گا!! اے اللہ! تو ہم کو اپنے نیک بندوں کی محبت عطا فرما، اے اللہ! تو ہماری ان دعاؤں کو قبول فرما۔

تیسری بحث شروع کرنے سے پہلے ایک وضاحت:

خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گالی دینے والوں کے نزدیک جو کتابیں معتمد ہیں ان سے بعض نصوص اور اقتباسات کو یہاں پیش کیا جارہا ہے، جن میں حضرت عمر کی شادی ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہم اجمعین سے ہونے کا ثبوت ملتا ہے، یہ کتابیں ان کے معتبر علماء کی تحریر کردہ ہیں۔

امام صفی الدین محمد بن تاج الدین[1] نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے، جو کتاب انہوں نے ہلاکو کے ساتھی اصیل الدین حسین بن نصیر الدین طوسی کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کی تھی، انہوں نے امیر المومنین سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کی بچیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "ام کلثوم کی ماں فاطمہ بنت رسول اللہ ہیں، جن کے ساتھ عمر بن خطاب نے شادی کی، جن سے زید کی پیدائش ہوئی، پھر سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بعد عبد اللہ بن جعفر نے ان کے ساتھ شادی کی۔" [2] محقق سید مہدی رجائی کی یہ بات دیکھی جائے، انہوں نے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، ان میں سے علامہ ابو الحسن عمری[3] کی تحقیقی ہے، جنہوں نے اپنی کتاب "المجدی" میں لکھا ہے: ان روایتوں کا خلاصہ یہ ہے جس کو ہم نے ابھی ابھی پڑھا ہے کہ عباس بن مطلب نے اس کی شادی اس کے والد کی رضامندی اور اجازت کے ساتھ عمر سے کی، اور حضرت عمر سے زید پیدا ہوئے۔ الخ محقق نے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ عمر نے جن کے ساتھ شادی کی وہ شیطان تھی، یا انہوں نے اس کے ساتھ جماع نہیں کیا، یا طاقت کے زور پر ان کے ساتھ شادی کی۔ الخ

علامہ مجلسی نے لکھا ہے: ... اس طرح مفید نے اصل واقعے کا انکار کیا ہے کہ یہ واقعہ ان کے اسانید سے ثابت نہیں ہے، ورنہ ان روایتوں کی موجودگی میں انکار کیسے کیا جاسکتا ہے، سندوں کے ساتھ اس کا تذکرہ آگے آرہا ہے کہ جب حضرت عمر کا انتقال ہوا تو حضرت علی ام کلثوم کے پاس آئے اور اس کو لے کر اپنے گھر آئے، اس کے علاوہ بہت سی روایتیں ہیں جن کا تذکرہ "بحار الانوار" میں ہے، یہ عجیب و غریب انکار ہے، اصل جواب یہ ہے کہ یہ تقیہ اور مجبوری کی وجہ سے پیش آیا ہے... الخ[1]

میں کہتا ہوں: "الکافی" کے مصنف نے اپنی کتاب میں بہت سی روایتیں نقل کی ہے، جن میں سے ایک یہ ہے: باب وہ "متوفی عنہا زوجہا" جس کے ساتھ جماع ہو چکا ہو، کہاں عدت گزارے گی اور اس پر کیا واجب ہے، حمید بن زیاد عن ابن سماعۃ عن محمد بن زیاد عن عبد اللہ بن سنان و معاویۃ بن عمار عن ابی عبد اللہ علیہ السلام، وہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ سے اس عورت کے بارے میں دریافت کیا جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہو، کیا وہ اپنے گھر میں عدت گزارے گی یا جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو سیّدنا علی علیہ السلام ام کلثوم کے پاس آئے اور اس کو اپنے ساتھ گھر لے گئے۔[2]

محترم قارئین! میں نے بعض معاصرین سے شادی کے بارے میں دریافت کیا، اس کا بہترین جواب عدالت اوقاف، میراث کے شیخ عبدالمجید خطی نے دیا ہے، انہوں نے کہا ہے: اسلام کے شہسوار امام علی علیہ السلام نے اپنی بیٹی ام کلثوم کی شادی کرنے کے سلسلے میں کوئی نافرمانی نہیں کی ہے، آپ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان کے لیے بہترین نمونہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کی دختر ام حبیبہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ شادی کی، ابوسفیان کا مقام عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں ہے، اس شادی کے بارے میں جو دھول اڑائی جاتی ہے اس کا مطلقاً کوئی جواز نہیں ہے۔

آپ لوگوں کی یہ بات کہ ایک شیطان نے خلیفہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے ام کلثوم کی شکل اختیار کی، تاکہ ان کی جگہ کھڑی رہے، یہ بات ہنسانے والی بھی ہے اور رلانے والی بھی، یہ قابل التفات اور قابل توجہ بات ہی نہیں ہے۔ الخ شیخ نے بحث و تحقیق کے مسئلہ کو چھیڑا ہی نہیں ہے، اس سے سسرالی رشتے کے اس نتیجے پر دلالت ہے کہ دو خاندانوں کے درمیان ربط و تعلق پایا جاتا ہے اور سسرالی رشتہ پورے اطمینان کے بعد ہی قائم ہوتا ہے، اسی طرح سسرالی رشتے داروں کے درمیان محبت، اخوت اور الفت پر دلالت ہوتی ہے۔ محب محترم! آپ سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ مسلمان مرد، اہل کتاب عورت سے شادی کر سکتا ہے، لیکن اہل کتاب مرد کا مسلم عورت سے شادی کرنا جائز نہیں ہے، ان دونوں کے درمیان فرق بالکل واضح ہے، چنانچہ آپ اس پر غور کریں۔

خلاصہ کلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان سسرالی رشتہ بالکل واضح ہے، خصوصاً امام علی علیہ السلام کی اولاد اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اولاد کے درمیان، اسی طرح بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان اسلام سے پہلے بھی اور اسلام آنے کے بعد بھی سسرالی رشتہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے، اس کی سب سے مشہور مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ابوسفیان کی دختر سے ہے۔

یہاں سسرالی رشتے داری قائم ہونے کے بعد پیدا ہونے والے نفسیاتی اور معاشرتی اثرات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، ان میں سے سب سے عظیم اثر یہ ہے کہ دو خاندانوں کے درمیان محبت پیدا ہوتی ہے، ورنہ اس کے اثرات بے انتہا ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات کافی ہیں۔

وباللہ التوفیق!

ابوعطاء المنعم رضاء اللہ بن الحاج خان بادشاہ حفظہ اللہ ورعاہ وجعل الجنۃ مثواہ۔ 1 جمادی الاولی ۔ 1447ھ

23۔2025۔یوم الخمیس

مؤلف کے دیگر تالیفات

1۔کتاب الحجامة پښتو .....۔ مطبوع

2۔حوارات المسلم عربی ..... مطبوع

3۔حوارات النسوة عربی ..... مطبوع

4۔حوارات ابناء الاسلام ..... غیر مطبوع

5۔حوارات بنات الاسلام عربی .....۔۔ ۔۔مطبوع

6۔حدیقة المسلم عربی ..... غیر مطبوع

7۔حدیقة النسوة عربی ..... غیر مطبوع

8۔تذکرة بیاد شیخ اردو ..... مطبوع

9۔اتحاد الامت پښتو .....غیر مطبوع

10۔معارف الاحوال لاصلاح عمل الاطفال پښتو . مطبوع

11۔اسان اصول فقه پښتو ..... غیر مطبوع

12۔لغة الاطفال عربی ..... غیر مطبوع

13۔میزان الصرف عربی .....۔۔ مطبوع

14۔صرف بهائی عربی ..... غیر مطبوع

15۔مه غمژن کیګه ..... غیر مطبوع

16۔اسلامی نغمے پښتو ..... غیر مطبوع

17۔دعوت الی الله ----------غیر مطبوع

18۔روضة الاطفال----------مطبوع

19۔پښتو ترجمہ اسان مونځ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مطبوع

20۔ماحکم المیراث فی الاسلام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مطبوع

21۔اَلْمُکَالَمَۃُ بَیْنَ یَدَیکَ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غیر مطبوع

22۔اسانه طریقه دقرآن مجید دحفظ۔۔۔۔۔۔۔۔ غیر مطبوع

23۔علم القرآن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غیر مطبوع

24۔اهل القرآن ورجال القرآن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غیر مطبوع

25۔پرسکون گھرانه اورحقوق نسواں۔۔۔۔۔۔۔ غیر مطبوع

26۔المکالمه بین النساء ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غیر مطبوع

27۔څلویښت دعاګانی اوڅلویښت حدیثونه ۔۔۔۔۔۔مطبوع

28۔عظمت قرآن بزبان قرآن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غیر مطبوع

29۔الجرح والتعدیل وظوابط التحقیق والتخریج ۔۔۔۔۔غیر مطبوع

30۔اصول الحدیث فی حدیث الرسول ۔۔۔۔۔۔۔غیر مطبوع

31۔توحید باری تعالیٰ سےمتعلقه شکوک وشبهات کاازاله۔ غیر مطبوع

32۔پښتو ترجمه رہنمائے اساتذہ مطالعۂ قرآن حکیم ۔۔غیر مطبوع

33۔پښتو ترجمه مطالعۂ قرآن حکیم جلد اول ۔۔غیر مطبوع

34۔پښتو ترجمه مطالعۂ قرآن حکیم جلد دویم۔ غیر مطبوع

35۔پښتو ترجمه خیرالاصول فی حدیث الرسول ۔۔۔۔مطبوع

36۔فتنوں مؤمن کا کردار ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غیر مطبوع

سیرتِ امیر معاویۃ رضی اللہ عنہ

37۔نورالقرآن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غیر مطبوع

38۔فکری منصوبی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غیر مطبوع

(39)اہل السنۃ والجماعۃ کا تصور سنت (1)

(40) جھنم کا بیان اور اللہ سے محبت کیوں اور کیسے

(41) اصول الفقہ فی علوم الفقہ

(42) مؤمن کی نماز اور طھارت کے مسائل و احکام

43)**نماز کا مسنون طریقہ اور اس کے احکام و مسائل**

(44)زکاۃ کے فرضیت اور فضائل و احکام

(45) حج کے فضائل و احکام حج و عمرہ

(46) روزہ کے حقیقت اور رمضان المبارک کے احکام و مسائل

(47) خواتین سے متعلق مخصوص احکام و مسائل

(48) نبی بحیثیت معلم اور بحیثیت والد

(49) نبی کی جامع سیرت اور اخلاق نبوی

(50)سیرتِ شیخین یعنی ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما

(51) سیرتِ ختنین یعنی عثمان غنی و علی المرتضٰی رضی اللہ عنہما

(52)سیرتِ حسنین یعنی حسن اور حسین رضی اللہ عنہما

(53) سیرتِ عظیم اہل بیت رضی اللہ عنہم اجمعین

(54) سیرتِ امیر معاویۃ رضی اللہ عنہ

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
1	**مقدمہ**	2
2	معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما پیدائش سے خلافت راشدہ کے اختتام تک اور خاندان	11
3	**۳۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہا:**	13
4	**۴۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھائی اور بہنیں:**	15
5	**۲۔ عتبہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما**	20
6	**۵۔ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کی بیویاں اور اولاد**	23
7	**۶۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام اور ان کے فضائل**	25
8	**۷۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنا**	27
9	**۸۔ معاویہ رضی اللہ عنہ سے متعلق غیر صحیح اور باطل روایات**	31
10	**۳۔ عہد رسول اللہ میں بنو امیہ کا کردار:**	33
11	**اموی اور معاویہ رضی اللہ عنہ ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں**	35
12	**۲... عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں**	38
13	**۲۔ دمشق، بعلبک اور بلقاء پر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولایت:**	40
14	**۳۔ ایک عظیم قافلہ کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ کی آمد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ناپسندیدگی**	41
15	**۳... عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں**	44
16	**۵۔ اہل قبرص کی طرف سے صلح کا مطالبہ:**	48

17	۷۔ اہل قبرص صلح کا معاہدہ توڑ دیتے ہیں:	49
18	۹۔ معاویہ رضی اللہ عنہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو قبرص کے مال غنیمت کا نگران مقرر فرماتے ہیں:	51
19	۱۱۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر اقرباء پروری کی تہمت:	52
20	الف:... آسودہ حالی اور اس کے معاشرہ پر اثرات:	58
21	ج:... نئی نسل کا ظہور:	60
22	و:... کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا مدینہ منورہ سے چلے جانا:	62
23	ل:... عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے کا ٹھوس منصوبہ:	64
24	شہادت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا موقف:	66

25	امیر المومنین علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے عہد میں	69
26	اولاً:... صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس بارے میں اختلاف تھا کہ قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص کس طرح لیا جائے	71
27	عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قاتل کون ہے؟	72
28	۸۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک:	74
29	امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے مقتولین کی خبر گیری اور ان کے بارے میں جذبہ رحم:	76
30	جنگ صفین کے حوالہ سے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک بے سروپا واقعہ:	77
31	حسن بن علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما کے عہد میں	79
32	بیعت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی اہم صفات اور نظام حکومت	80

33	۲۔ کیا معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار بارہ خلفاء میں ہوتا ہے؟	84
34	۲۔ حلم و حوصلہ اور عفو و درگزر:	87
35	۴۔ عقل و دانش اور معاملہ فہمی کی قدرت:	90

36	د:... ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ:	92
37	(۳)... علماء کی طرف سے معاویہ رضی اللہ عنہ کی تعریف وتوصیف اور اُموی دَور کا "خیر القرون" میں شامل ہونا	94
38	۵۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ:	96
39	۱۰۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ:	97
40	۱۸۔ ابن کثیر رحمہ اللہ:	99

41	اُمت اور دولت اسلامیہ کے رئیس کے طور پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے تعلقات	101
42	ثالثاً:... دولت امویہ کا دار الحکومت اور شام کے فضائل میں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم :	104
43	خامساً: ...شوریٰ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں:	107
44	۱۔ ابو مسلم خولانی:	110
45	۳۔ ام سنان بنت خیثمہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں:	112
46	معاویہ رضی اللہ عنہ کی داخلی سیاست	113
47	عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ	116
48	خامساً:... معاویہ رضی اللہ عنہ، اور حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو زہر دیا جانا	120

49	سادساً:... قاتلین عثمان کے بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف	122
50	پہلا مرحلہ:... قومی معارضہ (۵۰-۴۱ھ):	123
51	۱۔ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کے بارے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ:	124
52	۲۔ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف:	126
53	معاویہ رضی اللہ عنہ کا امور مملکت کی براہ راست نگرانی کرنا اور استحکام امن کے لیے کوشاں رہنا	128
54	معاویہ رضی اللہ عنہ کی معاشرتی زندگی اور علمی خدمات	133

55	۵۔بنو امیہ کے شاعر کو معاویہ رضی اللہ عنہ کی نصیحت	135
56	۹۔ آپ لباس سے نہیں بلکہ اس میں ملبوس شخص سے مخاطب ہیں:	136
57	۱۵۔ مساجد اور چشموں کا اہتمام کرنا:	138
58	۱۸۔ اللہ کی طاقت:	139
59	۲۔ شعر و لغت:	140
60	خوارج، عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں	141
61	عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں مالی نظام	144
62	۳۔ خراج:	146
63	ثالثاً:... حکومت کی طرف سے زراعت کا اہتمام	149
64	۱۔ سیاسی اضطراب:	151
65	۲۔ چند لوگوں کے ہاتھوں میں مال و دولت کا ارتکاز:	152
66	رابعاً:... اندرونی اور بیرونی تجارت	154
67	خامساً:... صنعت و حرفت	155
68	سادساً:... عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں مالی اخراجات کے بارے میں شبہات	157
69	۲۔ لوگوں کے دل جیتنے اور اپنے حمایتی پیدا کرنے کے لیے مال خرچ کرنے میں وسعت:	159
70	عہد معاویہ رضی اللہ عنہ اور دولت امویہ کا عدالتی نظام	161
71	ثالثاً:... قاضیوں کے لیے مالی مراعات	163
72	خامساً:... قاضیوں کے معاونین	164

73	سادساً :...اموی دور حکومت میں عدالتی احکامات کے مصادر	165
74	عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں پولیس کا نظام	165
75	گورنرز اور انتظامیہ، عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں	167
76	مدینہ منورہ کے گورنر	168
77	مدینہ منورہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات (۵۸ یا ۵۹ھ):	169
78	(د) مرض الموت میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا رونا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کا ان کے ورثاء کے لیے وصیت کرنا:	171
79	فتوحاتِ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ	172
80	بیزنطی حکومت کے خلاف تحریک جہاد	175

81	ثانیاً:... قسطنطنیہ پر قبضہ جمانے کے لیے معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی	177
82	ثالثاً:... قسطنطنیہ کا پہلا محاصرہ	178
83	رابعاً:... قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات	179
84	خامساً:... قسطنطنیہ کا دوسرا محاصرہ	181
85	سادساً:... دونوں حکومتوں میں پرامن باہمی تعلقات	183
86	سابعاً :... جراجمہ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں	184
87	عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں شمالی افریقہ کی فتوحات	186
89	ثالثاً:... قیروان شہر کی تعمیر	188

90	۲۔ قیروان (مغرب میں اسلامی تہذیب کا مرکز اور اس کا علمی دارالحکومت)	190
91	اولاً:... خراسان، سجستان اور ماوراء النہر کی فتوحات	193
92	خامساً:... عبیداللہ بن زیاد کے بھائی مسلم بن زیاد کی فتوحات... ۵۷ھ	197

93	فتوحاتِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دوران حاصل ہونے والے اہم ترین دروس	200
94	ولایت عہد اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات	203
95	۲۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیعت کے انعقاد کا طریقہ:	204
96	۳۔ بیعت عثمان رضی اللہ عنہ کا طریقہ انعقاد:	207
97	۴۔ بیعت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کا طریقہ انعقاد:	209

98	۶۔ بیعت معاویہ رضی اللہ عنہ کے انعقاد کا طریقہ:	210
99	۱۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی یزید کو وصیت:	213
100	۳۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات اور ان کی نماز جنازہ پڑھانے والا:	218
101	۸۔ آثار رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تبرک:	220
102	آل اور اصحاب رضی اللہ عنہم میں سسرالی رشتہ	221
103	تیسری بحث شروع کرنے سے پہلے ایک وضاحت:	225
104	خلاصہ کلام	226
105	مؤلف کے دیگر تالیفات	235

106	فہرست	130